شاہکار کتاب ۹۱

زیر ادارت : سید قاسم محمود

تین بڑے نفسیات داں

تصنیف : سلیم اختر

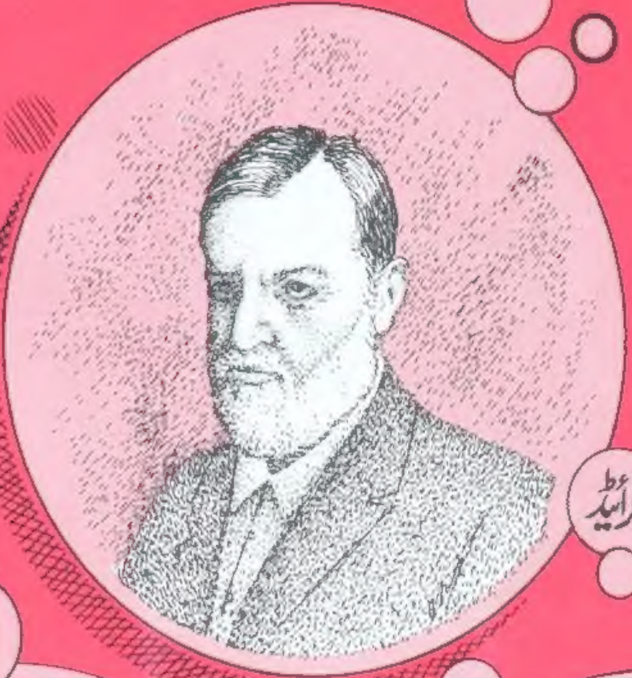

۴/۵۰

شاہکاریہ

ایک اور مصیبت

پاکستان میں ارزاں عوامی کتب وسیع بنیادوں پر شائع کرنے کی کوششیں گزشتہ پندرہ برس سے ہو رہی ہیں۔ اس نصب العین کے حصول میں "شاہکار" بھی حسبِ توفیق حصہ لے رہا ہے، لیکن دوسرے نو آزاد اور زیرِ ترقی ممالک میں "کتابی انقلاب" کی رفتار پہ توجہ کی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ابھی ہم منزل سے بہت دُور ہیں۔ ہماری کوششیں نیم دلانہ، ادھوری اور ناپختہ معلوم ہوتی ہیں۔ ہمیں بلند بانگ دعووں کی بجائے، خاموشی سے ان تھک کام کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرے ملکوں کی حکومتیں ہر طرح بک انڈسٹری کی مدد کرتی ہیں، کیونکہ کتابیں تہذیب و تمدن ہی کی سفیر نہیں ہیں بلکہ ترقی اور خوشحالی کی رہنما روشنی بھی کتابوں ہی سے مل سکتی ہے۔ انڈیا کی حکومت ہر سطح پہ ناشرین کی مدد کرتی ہے۔ وہاں محصول ڈاک کی شرح بہت کم مقرر کی گئی ہے۔ ناشرین کو ایسی سہولتیں مہیا کی گئی ہیں کہ پاکستان میں ان کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں عوامی کتب (پیپر بکس) نے خاصا عروج پایا ہے اور پچاس پچاس ہزار اور لاکھ لاکھ کے ایڈیشن اُردو کتابوں کے شائع ہونے لگے ہیں۔

ابھی ہم شاہکار والے انڈیا اور ایران کی عوامی کتب کی اساس پہ یہ پلان بنا رہے تھے کہ جدید کتب کی خالص پاکستانی ایجاد کے علاوہ، ہم اور کونسی تدبیر کتابوں کو ارزاں اور عوامی بنانے کی اختیار کر سکتے ہیں ——— کہ ایک اور مصیبت نازل ہو گئی، یعنی تازہ بجٹ۔ کاغذ، طباعت کے خام مواد اور دیگر متعلقہ چیزوں کے نرخ اچانک آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ ہم پہلے ہی نفع اور نقصان کی درمیانی سرحد پہ کھڑے ہو کر اشاعتِ کتب کر رہے تھے، حالات کی یہ ضرب قابلِ برداشت نہیں۔

۱۹۷۷ء کا سال پاکستان کے علاوہ علم و ادب اور کتب کا بھی دشمن معلوم ہوتا ہے (نجومی کہتے ہیں، سیاسی صحافت کے لیے یہ سال اچھا ہے!) اس خطۂ پاک میں علمی نشاۃ ثانیہ ہو کر رہے گا، اور اس مشن کے لیے ہم ہر چیلنج قبول کرنے کے لیے تیار ہیں، جس کے لیے حالات سے مطابقت کرنا پڑے گی۔ اس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک ایک اٹھنی فی شاہکار اضافہ کیا جائے۔ امید ہے کہ شاہکار برادری اس ناگزیر اضافے کو ہماری مجبوری اور حالات کی اسیری کے باعث فراخدلی سے قبول کر لے گی۔

"شاہکار بک کلب" کے "بی" ارکان کو اب اُن کی مطلوبہ کتب ہر پہلی تاریخ کو اور "ایم" ارکان کو ہر پندرہ تاریخ کو ارسال کی جایا کریں گی۔ اطلاعاً عرض ہے۔

آپ کا

سیّد قاسم محمود

ٹیلیفون: ۲۵۴۱۰۳ - تار: "شاہکار"

رسالے کی شکل و صورت میں ہر زبان کی، ہر زمانے کی، ہر موضوع کی شاہکار کتابیں، دُنیا بھر میں ارزاں ترین قیمتوں پر شائع کرنے کا انقلابی پروگرام

زیرِ ادارت:
سیّد قاسم محمود

تین بڑے نفسیات داں

مصنف: پروفیسر سلیم اختر
مترجم:
ناشر: سیّد قاسم محمود
مکتبۂ شاہکار، لاہور
طابع ریاض حسین الجدہ پرنٹرز، راوی روڈ، لاہور

تاریخِ اشاعت ۱۵ جولائی ۷۷ء
قیمت: ۲/۵۰ روپے

آئندہ کتاب

شاہکارِ میرؔ

مرتب: پروفیسر اعجاز راہی
قیمت: چار روپے

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
مکتبہ شاہکار - پوسٹ بکس ۱۷۵۴ - لاہور

شاہکار کا پہلا اصول: کاپی رائٹ مصنف کا

فرائیڈ

(۱) فرائیڈ ——— ایک عظیم انسان

ابتدائیہ - پیدائش - شگون اور پیش گوئیاں - دی آنا ہیں - تعلیم - ماہر طبعیات - تحلیل نفسی کی تحریک - محنت! محنت!! محنت!!! - مشفق باپ - جبڑے کا آپریشن - آخری ایام -

(۲) فرائیڈ —— نفسیاتی مطالعہ

مجموعۂ اضداد - ذاتی خصائص - نفسیاتی رجحانات - جنسی زندگی (۱) - جنسی زندگی (۲) -

(۳) نظریات

شعور و لاشعور کی کشمکش : شعور، قبل شعور، ——— اید، انا، فوق الانا

(۴) جنس کی اہمیت

طفلانہ جنسیت - ایڈی پس الجھاؤ - آباؤ الجھاؤ - لیبیڈو - جنسی نشوونما (خود جنسیت، ہم جنسیت، مخالف جنسیت) - لیبیڈو کا ارتقاء - دباؤ سے ارتفاع تک - (دباؤ، مراجعت، انتقال، کجروی، ارتفاع)

(۵) نظریۂ خواب

فرائیڈ سے قبل - فرائیڈ کا نظریہ - خوابوں کی اقسام - خوابوں کی تشریح و تحلیل - اشاریت -

(۶) تحلیلِ نفسی

طریق کار - منقولیت - آج کے دور میں تحلیلِ نفسی ؛

ابتدائیہ:

"میں نے ابھی ابھی اپنے ایک ارادہ کو شرمندۂ تکمیل کیا ہے اسے لوگوں کا وہ گروہ تو بے حد محسوس کرے گا جو ابھی پیدا نہیں ہوا اور یہی ان کی بدقسمتی ہوگی۔ تم یہ اندازہ نہیں لگا سکو گی کہ میری مراد کن لوگوں سے ہے اسی لیے میں تمہیں بتاتا ہوں۔ وہ لوگ ہیں میرے — سوانح نگار! میں نے پچھلے ۱۴ سالوں کی ڈائریاں، تمام خطوط، علمی یادداشتیں اور اپنی مطبوعات کے مسودات تلف کر دیئے ہیں۔ صرف خاندانی خطوط کو بچایا گیا ہے۔ اور میری جان! تمہارے خطوط کو تو کبھی بھی کوئی خطرہ نہ تھا . . . . اچھا ہے۔ سوانح نگاروں کو پیچ و تاب کھانے دو۔ ہم ان کے لیے یہ کام آسان نہ بننے دیں گے۔ ان میں سے ہر ایک کو اس خوش فہمی میں ہی مبتلا رہنے دو کہ "ہیرو کی شخصیت کی نشوونما" کے بارے میں صرف اسی کا نظریہ ہی صحیح ہے۔ بلکہ اب بھی ان کے بھٹکنے کا تصور کر کے میں اس سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔"

۲۸ سالہ فرائیڈ نے یہ خط اپنی محبوبہ مارتھا کو ۲۸/اپریل ۱۸۸۵ء میں تحریر کیا تھا۔

فرائیڈ اپنی صدی کی سب سے عظیم اور متنازعہ شخصیت تھا۔ اس سے قبل نفسیات محض چند دائروں میں الجھی ہوئی تھی۔ ذہنی عوامل پر نظری بحثیں ہوتی تھیں اور مسمریزم اور تنویم محض شعبدہ بازی اور جادوگری کے کارنامے معلوم ہوتے تھے یہ ٹھیک ہے کہ ان کی بنیادیں ایک حد تک علمی حقائق پر استوار تھیں اور ان سے بعض بیماریوں کا علاج بھی کیا جاتا تھا مگر خود ان پر عمل پیرا ماہرین بھی ان کے بارے میں اتنا وثوق نہ رکھتے تھے فرائیڈ نے سب سے پہلے لاشعور دریافت کر کے انسانی افعال و کردار کی نئے انداز سے تعبیر کرتے ہوئے انسانی شخصیت کی اساس "جنس" کو بنایا اور یوں اس نے تحلیل نفسی یا نفسیاتی تجزیہ کے ذریعہ ذہنی بیماریوں کے علاج میں ایک انقلاب برپا کر دیا — اور اس کے پیدا کردہ انقلاب کے اثرات گہرے ہی ہوتے جا رہے ہیں جیسے جیسے معاشرہ نئی نئی پیچیدگیوں سے روشناس ہوتا جا رہا ہے، ویسے ویسے ہی ذہنی بیماریوں اور نفسیاتی الجھنوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور یوں تحلیل نفسی کی اہمیت بڑھ رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ فرائیڈ کیوں اپنی نجی زندگی کے بارے میں جان بوجھ کر "سوانح نگاروں کو پیچ و تاب" کھلانے پر تلا ہوا تھا جبکہ بعض دیگر نامور اصحاب (جن میں سے بدسیو سرفہرست ہے) نے اپنی خود نوشت سوانح عمریوں میں اپنے تمام عیوب کو بے تکلفی کے ساتھ قلم بند کر دیا فرائیڈ نے بھی (۱۹۲۵ء میں) اپنی ایک مختصر (۷۴ صفحات کی) سوانح عمری — AN AUTOBIOGRAPHICAL STUDY) لکھی تھی، مگر اس میں اس نے اپنی نجی زندگی کے بارے میں ہر ممکن طریقہ سے پہلو تہی کرنے کی کوشش کی۔ اور محض رسمی انداز میں چند ناگزیر کوائف درج کر دیئے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی شادی کے ضمن میں بیوی کا نام تک بھی نہیں لکھا۔

"۱۸۸۶ء کی خزاں میں . . . . میں نے اس لڑکی کے ساتھ شادی کر لی جو چار سال سے زیادہ مدت سے ایک دور افتادہ شہر میں میری منتظر تھی"

ذاتی زندگی کو دوسروں سے چھپانے کی ایک وجہ تو اس کے قریبی دوست اور اس کے سب سے مشہور سوانح نگار ارنسٹ جانز نے ہی یوں بیان کی ہے۔

"اس (فرائیڈ) کا یہ خیال تھا کہ اس نے پہلے سے ہی اپنی تحریروں کے اکثر حصوں میں اپنی نجی زندگی کے بارے میں کافی سے زیادہ معلومات بہم پہنچا دی تھیں۔ بلکہ بعد میں تو اس نے اس امر پر اظہار پشیمانی بھی کیا تھا اور وہ باقی ماندہ حالات و کوائف کو دنیا سے چھپا کر رکھنا اپنا حق سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کو صرف اس کی علمی خدمات سے سروکار رکھتے ہوئے اس کی ذات کو فراموش کر دینا چاہیئے۔"

مگر اس ضمن میں فرائیڈ کی سعی کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فرائیڈ نے انسانی سوچ کے دھارے بدل کر رکھ دیئے۔ اس کی تعلیمات سے اخلاق، مذہب قانون، ادب — غرضیکہ زندگی کے تمام شعبے اور انسانی فکر کے تمام گوشے متاثر ہوئے تو بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ "ایڈی پس الجھاؤ" کے متعلق پڑھنے والے کے ذہن میں یہ خواہش نہ پیدا ہو کہ فرائیڈ بہ حیثیت انسان — بلکہ بہ حیثیت "مرد" کیسا تھا۔ کیا وہ بھی عام انسانی کمزوریوں کا شکار تھا یا کسی فوق البشری قوت کی بناء پر اس نے ان سب پر قابو پا لیا تھا۔ اس نے جن نفسیاتی الجھنوں کو سلجھانے میں اپنی زندگی گذار دی کیا وہ خود ان سے مبرا تھا یا وہ بھی ان کا شکار تھا — وہ کیسا بیٹا تھا کیسا باپ تھا اور کیسا شوہر تھا —؟

یہ تمام سوالات ایک فطری قاری کے ذہن میں جنم لیتے رہتے ہیں اور اسی لیے فرائیڈ کی جتنی بھی سوانح عمریاں لکھی گئیں ان میں سے اکثریت ایسی کتابوں کی ہے جن کے مصنفین نے فرائیڈ کے نفسیاتی نظریات کی روشنی میں اس کی شخصیت کے خدوخال کا جائزہ لینے کی کوشش میں ہر ممکن تحقیق و تفحص سے کام لیتے ہوئے اس کی ارتقاپذیر شخصیت کے تار و پود کو متعین کرنا چاہا ہے اور یہ خواہش لاحاصل نہیں رہی!

اور یہ مختصر سوانح حیات بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

پیدائش

سگمنڈ فرائیڈ ۶/مئی ۱۸۵۶ء کی شام کے ساڑھے چھ بجے مکان نمبر ۱۱۷، شلوسر گاس فریبرگ میں پیدا ہوا۔ فریبرگ مورآویا (زیکوسلواکیا) میں ایک قصبہ ہے۔ جب فرائیڈ کی شہرت تمام دنیا میں پھیل گئی تو ۱۹۳۱ء میں اس کی پیدائش والے مکان کو ایک قومی یادگار بنا دیا گیا اسی طرح اس کے اعزاز میں اس کے محلہ شلوسر گاس کا نام بھی FREUDOVA ULICE سے بدل دیا گیا ہے۔

یہ چھوٹا سا قصبہ جس کی آبادی ۵ ہزار نفوس سے زائد نہ تھی، اس وقت آسٹریا ہنگری مملکت کا ایک حصہ تھا اور قصبہ کے لوگ جرمنی اور چیک تھے۔ اس کی پیدائش سے انٹوں سے تعمیر کردہ جس دو منزلہ مکان میں ہوئی وہ دوسرے مکانوں سے قدرے الگ تھلگ واقع ہوا تھا۔ سلیٹ کی چھت تھی۔ اور ہر قسم کے نقوش اور آرائش و زیبائش سے مبرا اس مکان کو آج سیاح دور دور سے دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔

فرائیڈ کی پیدائش بھی عام بچوں ہی کی مانند تھی۔ نہ آسمان پر نشانیوں کا ظہور ہوا، نہ کاہنوں اور منجموں نے غیبی آوازیں سنیں اور نہ ہی عناصر قدرت میں ہیجانی کیفیات پیدا ہوئیں۔ ایک عام یہودی گھرانے میں پیدا ہونے والا یہ بچہ بھی عام بچوں ایسا ہی تھا

اس کا باپ جیکب فرائیڈ (۱۸/دسمبر ۱۸۱۵ء تا ۲۳/اکتوبر ۱۸۹۶ء) اون کا کاروبار کرتا تھا اور گو یہودی تجارت اور کاروبار میں مانے ہوئے ہیں مگر اس کا کاروبار کچھ ایسا زیادہ نہ چمکا ہوا تھا بلکہ فرائیڈ کی پیدائش کے وقت تو کاروبار روبہ تنزل تھا وہ بحیثیت کاروباری اتنا اچھا نہ رہا ہو مگر ایک بات ہے کہ فرائیڈ پر اس کی شخصیت کے اثرات کافی گہرے اور دوررس ثابت ہوئے۔ بذلہ سنجی زندگی کی حقیقتوں کے بارے میں قدرے تشکیک آمیز نظریات، اخلاقی نظریات کے ضمن میں کسی یہودی کہاوت کو بطور جواز استعمال کرنا اور سوچ کا آزادانہ اور ترقی پسند انداز — یہ سب کچھ فرائیڈ کو اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا۔

فرائیڈ اس کی دوسری بیوی (امیلی) کے بطن سے تھا۔ اس کی پہلی شادی سترہ برس کی عمر میں ہوئی اور پہلی بیوی (سیلی کانر) سے اس کے ۲ لڑکے — عمانویل اور فلپ پیدا ہوئے۔ جب اس کی عمر چالیس سال کی تھی تو پہلی بیوی کی وفات کے تین سال بعد اس نے امیلی سے شادی کی۔

۲۰ سالہ امیلی سے شادی کے ایک سال بعد ہی فرائیڈ پیدا ہو گیا اب جو جیکب کے کنبہ کی صورت بنتی ہے وہ خود فرائیڈ کے بیٹے مارٹن فرائیڈ کی زبان سے سنئے۔

"اس طرح یعنی جیکب کی شادی اور فرائیڈ کی پیدائش کا نتیجہ بھی کچھ عجیب ہی سا تھا

کیونکہ پہلی بیوی سے جو صرف جیکب کے جوان بیٹے ہی تھے بلکہ ان سے عمانوئیل تو خود بھی شادی شدہ اور بچوں والا تھا بلکہ عمانوئیل اپنی سوتیلی ماں سے کچھ سال (تین) بڑا بھی تھا وہ پڑوس میں بالکل قریب ہی رہتا تھا۔ میرا باپ اپنے لنگوٹیے یار۔ عمانوئیل کے بیٹے کا چچا بھی تھا جو عمر میں اس سے ایک سال بڑا تھا۔"

اس طرح اس کی بھتیجی (عمانوئیل کی بیٹی) بھی تقریباً اس کی ہم عمر تھی۔

فرائڈ ایک ذہین بچہ تھا اور ظاہر ہے کہ اس نے اپنے کنبے میں رشتوں کے اس سلسلہ کو، جس میں عمروں کے تفاوت نے اس کے لیے اچھی خاصی الجھن پیدا کر دی ہو گی۔ سمجھنے کی ضرور کوشش کی ہو گی، اس کا باپ، عمانوئیل اور اس کی آنا (جو عمر میں اس کے باپ کے برابر ہی تھی) مل کر ایک ایسی تکون بن جاتے تھے جہاں اس کی نوجوان ماں کے لیے کوئی گنجائش نہ نکلتی تھی، اس کے خام ذہن کی یہ سیدھی سادی منطق تھی کہ اس کے باپ کی بیوی اس کی آنا ہے (کیونکہ یہ دونوں ہم عمر تھے) اور عمانوئیل اور اس کی ماں کو میاں بیوی ہونا چاہئیے تھا۔ جب فرائڈ ۲½ برس کا تھا تو اس کی بہن اینا پیدا ہوئی، اسی دوران میں اس کی آنا غائب ہو گئی (آنا چوری کرتی پکڑی گئی تھی اور عمانوئیل نے اسے جیل خانہ بھجوا دیا تھا) فرائڈ کے لیے یہ بھی ایک معمہ تھا۔ بعد میں فرائڈ نے اپنے بعض خوابوں وغیرہ کے تجزیہ سے بتلایا کہ اس وقت اس نے یہ سوچا کہ آنا کو تو عمانوئیل نے غائب کرایا ہی تھا، اس کی ماں کے پیٹ میں اس کی بہن کو بھی اس نے چھپا دیا تھا۔ اور یوں اس نے بہن کی پیدائش کے معمہ کا حل تلاش کیا۔

شگون اور پیشین گوئیاں

پیدائش کے وقت اس کے سر پر کثرت سے گہرے سیاہ اور گھنگھرالے بال تھے۔ اس کی ماں کا خیال تھا کہ یہ ایک خاص امتیازی نشانی ہے وہ اسے پیار سے "ننھا سیاہ محبوب" کہا کرتی تھی۔ اس کی دایہ کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ کوئی عظیم شخصیت ہو گی۔

اسی طرح ایک دکان پر فرائڈ کی ماں کو ایک کسان عورت ملی جس نے فرائڈ کو دیکھ کر اس کی ماں سے یہ پیشین گوئی کی کہ اس نے جو بچہ جنا ہے، وہ ایک بڑا آدمی بنے گا۔

فرائڈ نے خود بھی ایک ایسے ہی واقعہ کا ذکر کیا ہے، وہ اس وقت کوئی گیارہ بارہ برس کا ہو گا اور اپنے والدین کے ساتھ ایک ریستوران میں بیٹھا تھا۔ وہاں ایک شاعر بھی تھا جو معمولی سے معاوضہ پر کسی فرمائشی موضوع یا عنوان پر اشعار کہہ دیتا تھا فرائڈ کو اسے بلانے کے لیے بھیجا گیا جب وہ ان کی میز پر آیا تو پیشتر اس کے کہ اشعار کہنے کے لیے اسے کوئی عنوان دیا جاتا۔ اس نے خود ہی فرائڈ کے متعلق چند اشعار کہہ ڈالے جن میں اس کے متعلق پیشین گوئی کی گئی تھی کہ وہ ایک "وزیر" بنے گا۔

فرائڈ کی ماں کو ان پیشین گوئیوں پر یقین اور اعتماد ہی نہ تھا بلکہ وہ فرائڈ کو بھی ہر وقت یہ احساس کراتی رہتی تھی کہ وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں بلکہ اس نے ایک عظیم ہستی بننا ہے۔ اور اسی لیے فرائڈ کی گھر میں بے حد عزت اور قدر و منزلت کی جاتی تھی، غربی کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلائی گئی اور بچپن سے ہی اسے گھر میں ایک علیحدہ کمرہ دیا گیا تھا باقی لوگ موم بتیوں سے کام چلاتے مگر اسے گھر کا واحد لیمپ ملا ہوا تھا۔

ماں کے اس اعتماد اور پیار کے طفیل فرائڈ میں اس کی سب سے اہم خصوصیت یعنی خود اعتمادی نے جنم لیا وہ خود بھی رقم طراز ہے۔

"وہ انسان جو بلا شرکت غیرے اپنی ماں کا پسندیدہ اور لاڈلا بچہ رہا ہو تو تمام عمر اس میں ایک فاتح کے سے احساسات موجود رہتے ہیں، یعنی کامیابی کے بارے میں وہ اعتماد جو عموماً اصل اور حقیقی کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے" اس طرح سے اس نے ایک اور جگہ ایسی پیشین گوئیوں کے بارے میں یوں لکھا ہے۔

"ایسی پیشین گوئیاں کرتے رہنا چاہئیے۔ کئی خوش و خرم اور متوقع مائیں بہت سی بوڑھی دیہی عورتیں اور کئی ایسی خواتین بھی ہیں جن کی دنیاوی طاقتیں اب ان کا ساتھ چھوڑ چکی ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنی نگاہیں مستقبل کی طرف لگائیں ہیں اور پھر پیشین گوئی کر دینے سے بھلا کاہنہ کو کیا گزند پہنچ سکتا ہے۔"

یہ ٹھیک ہے کہ بڑے بننے والے محض شگونوں اور پیشین گوئیوں ہی کے محتاج نہیں ہوتے۔ لیکن فرائڈ ان کی اہمیت کا بے حد قائل معلوم ہوتا ہے، حالانکہ ان سے بعض اوقات منفی قسم کے نتائج بھی ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً ماں کا پسندیدہ بچہ ہونے کی صورت میں تو عموماً بچے کا مستقبل بھی تباہ ہو جاتا ہے لیکن فرائڈ کے لیے ان محرکات نے "تازیانے" کا کام کیا اور بچپن سے ہی اس کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ اسے بڑے ہو کر محض عام لوگوں کی مانند زندگی نہیں بسر کرنی بلکہ کچھ کر کے بھی دکھانا ہے اور فرائڈ نے یہ توقعات پوری کر دیں۔

دی آنا میں

جب جیکب کو یہ احساس ہو گیا کہ اب اس کے کاروبار کے سنبھلنے کا کوئی امکان نہیں تو اس نے اپنا اثاثہ سمیٹا اور کنبہ کو لے کر دی آنا میں آ گیا۔ فرائڈ اس وقت چار برس کا تھا۔

اس دور کا دی آنا۔ یورپ کے دیگر بڑے شہروں الیا ہی تھا۔ کھیل تماشے، سیر و تفریح، تھیٹر، اوپیرا، موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ کے باوجود ماحول کی گھٹن کا یہ عالم تھا کہ جنس کے موضوع پر بات کرنا گناہ کے مترادف تھا۔ زندگی میں عجیب طرح کی دو عملی اور دوغلا پن سرایت کر چکا تھا۔ جھوٹا اخلاق پر تصنع شائستگی اور ریاکاری پر مبنی اطوار، اہل دی آنا کی خصوصیت تھے۔

سماجی لحاظ سے دو واضح قسم کے طبقات ملتے تھے، حکمران اور ان کے حواریوں کی اقلیت اور عوام کی اکثریت جن کا طرح طرح سے استحصال کیا جاتا تھا، ان کے درمیان متوسط طبقہ پس رہا تھا۔ حکومت کا تمام انتظام و انصرام آسٹریا کے اسی خاندانوں کے ہاتھ میں تھا۔ اور یوں مٹھی بھر لوگوں کے مفاد کی خاطر عوام کو استعمال کیا جا رہا تھا۔

یہودیوں سے یورپ کے عام شہروں کی مانند یہاں بھی تعصب کا سلوک کیا جاتا تھا لیکن امیر یہودی اپنی دولت کی بنا پر سب کو رام کر لیتے تھے اس لیے کم از کم امیر یہودی مزے میں تھے۔

دی آنا تضادات کا شہر تھا، عالی شان محلات اور قدیم گوتھک فن تعمیر کے پرشکوہ گرجوں کے پہلو ہی میں مقیم تاریک گلیوں خستہ حال مکانات اور ان کے آگے گندگی کے ڈھیروں پر مرغوں اور سوروں کے ساتھ ساتھ نیم عریاں بچے بھی شور مچاتے اور کودتے پھاندتے نظر آ جاتے تھے، ادھر عوام کی مفلوک الحالی سے قطع نظر فطرت نے اپنے حسن کو ایک عجیب شان دلربائی سے بے نقاب کیا تھا۔ شہر کے چاروں طرف گھنے درختوں، خوش رنگ پھولوں اور گنگناتے چشموں کو اپنے دامن میں لیے پہاڑیوں کی ایک ٹیڑھی سی قطار چلی گئی تھی، اسی لیے مضافات میں بن باڑیوں اور سرسبز چراگاہوں کی کمی نہ تھی۔

دی آنا کا ہم آسانی کے ساتھ، ۱۸۵۷ء سے قبل کے لکھنؤ کے ساتھ موازنہ کر سکتے ہیں۔ اہل لکھنؤ کی مانند ان لوگوں کا بھی احساس جنس بہت شدید اور تیز تھا، مگر وہ "ادب جنس" "فحش" کتابوں کے پڑھنے سے منع کرتے، نوجوان انہی کا چھپ چھپ کر مطالعہ کرتے۔ اور یہی وجہ تھی کہ ملحقہ جنگل اور چراگاہوں میں نوجوان جوڑے وقت بے وقت پکڑے جاتے تھے۔

گو فرائڈ تمام عمر یہاں رہا مگر اس نے دی آنا کو ہمیشہ ناپسند کیا اور نہ ہی دی آنا نے اس کی کوئی قدر کی، حتیٰ کہ جب فرائڈ بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا اور اس سے ملنے کے لیے لوگ دور دور کا سفر کر کے آتے تھے تو اس وقت بھی اہل دی آنا اس کے وجود سے بے خبر تھے، چنانچہ جب ۱۹۲۱ء میں امریکی نفسیات دان ابراہم کارڈینر۔۔۔

(ABRAM KARDINER) دی آنا میں آیا تو اس کے مالک مکان نے فرائڈ کے بارے میں مکمل لاعلمی کا اظہار کیا، حالانکہ وہ یونیورسٹی کے تمام پروفیسروں کو جانتا تھا فرائڈ کو خود بھی اس کا احساس تھا چنانچہ اس نے HISTORY OF THE PSYCHO-ANALYTIC MOVEMENT میں بھی اس امر کا گلا کیا ہے کہ دی آنا کے تعلیم یافتہ اور دانش ور اصحاب نے جان بوجھ کر تحلیل نفسی کے بارے میں لاتعلقی کا اظہار کیا بلکہ اس ضمن میں ہر ممکن طریقہ سے رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کی۔ اور یہ شاید اسی نفرت کا نتیجہ تھا کہ اس نے شادی کے لیے جس لڑکی کا انتخاب کیا اس کا دی آنا سے دور کا بھی تعلق نہ تھا، وہ ہمبرگ کی تھی اور تمام عمر دی آنا میں گزارنے کے باوجود بھی اس نے اپنے خالص جرمنی لہجہ گفتگو کو نہ چھوڑا۔ اسی طرح فرائڈ کے گھر کا ماحول رہن سہن کا انداز، کمروں کی آرائش اور تزئین غرض کہ ہر ایک چیز سے انفرادیت ٹپکتی تھی اور یوں وہ دی آنا میں رہتے ہوئے بھی اہل دی آنا سے الگ تھلگ تھا۔

جب جبکہ دی آنا آیا تو اس کا بڑا بیٹا عمانوئل مانچسٹر میں جا کر آباد ہو گیا فرائڈ تمام عمر اس کی خوش قسمتی پر رشک کرتا رہا اور اسی لیے اس نے ہمیشہ انگلینڈ کی آسٹریا کے مقابلہ میں زیادہ تعریف کی۔

تعلیم

فرائڈ کو قدرت نے ایک غیر معمولی ذہن دیا تھا اس پر مستزاد اس کی محنت اور شوق — نتیجہ یہ ہوا کہ فرائڈ نے چھوٹی عمر میں گھر پر اچھی خاصی استعداد بہم پہنچائی، وہ خود بھی لکھتا ہے کہ "جیمنزیم" میں وہ مسلسل سات سال تک تمام ہم سبقوں پر سبقت لے جاتا رہا جس کی بناء پر اسے اکثر امتحانات سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا۔

گو فرائڈ کے باپ کی آمدنی وی آنا آنے کے بعد بھی نہ بڑھ سکی، پھر بھی اس نے تعلیم کے لیے اسے ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی اور اسے کھلی آزادی تھی کہ وہ جس پیشہ کو اپنانا چاہے اسے اپنا سکتا ہے۔

ادھر فرائڈ ابتدائی تعلیم ختم کر کے اب عمر کے اس دور میں داخل ہو چکا تھا جہاں انسان کے سامنے بے شمار راستے ہوتے ہیں پہلے فرائڈ کا خیال قانون لینے کا ہوا مگر بعد میں اس نے ڈاکٹر بننے کا ارادہ کر لیا۔

جب اس نے ۱۸۷۳ء میں یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو اس کے یہودی ہونے کی بناء پر اس سے اچھے خاصے تعصب کا اظہار کیا گیا۔ وہ خود بھی اس کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہودی ہونے کی بناء پر اس سے "اجنبی" ایسا سلوک کرتے ہوئے اسے "حقیر" قرار دینے کی کوشش کی جاتی مگر اس نے ان باتوں کی پرواہ نہ کی۔

اس لیے ارنسٹ برُوک (ERNST BRUCKE) کی طبعیاتی تجربہ گاہ میں کام شروع کر دیا۔ وہاں کا ماحول اسے بے حد پسند آیا۔ ان لوگوں کو علمی لگن اور کام کی دھن تھی اور اس لیے فرائڈ کی طبیعت کو بھی یہاں سکون اور راحت کا احساس ہوا۔ برُوک نے اسے نظام عصبی کی نسیج سے متعلق ایک مسئلہ دیا اور اس نے اسے اپنے استاد کی تسلی کے مطابق حل کر دیا۔

۱۸۸۱ء میں اس نے DOCTOR OF MEDICIL کی ڈگری حاصل کر لی۔

اس دوران میں ان کے معاشی حالات اور بھی خراب ہو چکے تھے، ادھر گھر میں صرف فرائڈ ہی نہ تھا بلکہ اس کے علاوہ پانچ بہنیں (اینا، روزا، میری، ایڈولیفن اور پاؤلا) اور دو بھائی (جولیس اور الیگزنڈر۔ اول الذکر ۸ ماہ کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا) اور بھی تھے ظاہر ہے کہ ان سب کی تعلیم اور اخراجات کا بار معمولی نہ ہوگا۔ اس کے والدین ان حالات کو سمجھتے تھے مگر وہ بیٹے کی خواہش کے احترام میں ہر طرح سے اس کے لیے سہولتیں بہم پہنچاتے رہتے تھے۔

ماہر طبعیات

ڈگری لینے کے بعد بھی فرائڈ نے سلسلہ تعلیم منقطع نہ کیا تھا لیکن اس کے استاد نے اسے گھر کے حالات کے بارے میں سمجھاتے ہوئے سلسلہ تعلیم منقطع کرنے کا مشورہ دیا چنانچہ ۱۸۸۲ء میں اس نے تجربہ گاہ کو چھوڑا اور دی آنا کے سب سے بڑے ہسپتال — جنرل ہسپتال — میں ملازمت اختیار کر لی، جہاں تھوڑی مدت کے بعد ہی اسے جونیئر ریذیڈنٹ فزیشن بنا دیا گیا اس نے ہسپتال کے مختلف شعبوں میں کام کیا اور یوں اسے کام کا خوب تجربہ ہو گیا۔

دن بھر مریضوں میں گھرا رہنے کے بعد بھی یہ آرام سے نہ بیٹھتا اس کی دلچسپی کا خصوصی مرکز نظام عصبی تھا چنانچہ طبی مصروفیات سے فرصت پانے کے بعد نظام عصبی کے بارے میں تحقیقات و تجربات میں مصروف رہتا۔ اس کے بعد اسے اپنی تحقیق کو نظام عصبی کے صرف ایک حصہ اور حرام مغز پر مرکوز کر دیا۔ اپنی تحقیقات کے نتائج کے بارے میں اس نے بعض مضامین بھی تحریر کیے۔

نظام عصبی پر کام کرتے رہنے کا یہ نتیجہ ہوا، کہ اس نے عصبی بیماریوں اور ان کے علاج کا مطالعہ شروع کر دیا۔ گو دی آنا میں اس مقصد کے لیے کوئی خاص سہولتیں نہ تھیں مگر فرائڈ کی محنتی اور مشکل پسند طبیعت ایسی دشواریوں سے کہاں گھبرانے والی تھی چنانچہ یہ اپنی سعی میں مگن رہا اور اپنے مشاہدات وغیرہ پر کئی مضامین بھی لکھے اس کے شوق محنت اور رجحان کا ہی کا یہ نتیجہ نکلا کہ ۱۸۸۵ء میں اسے . . . . . (NEUROPATHOLOGY) کا لیکچرر بنا دیا گیا۔ بعد ازاں عصبی بیماریوں کے علاج کے لیے بغرض اعلیٰ تعلیم اور اس کے لیے وظیفہ منظور کیا گیا اور یہ شارکو (CHARCOT) کے پاس پیرس میں آ گیا۔

شارکو نے ہسٹریا کے بارے میں بعض جدید ترین انکشافات کیے تھے اس سے پہلے صرف یہ باور کیا جاتا تھا، کہ ہسٹریا (اختناق الرحم) صرف عورتوں سے ہی مخصوص ہے مگر شارکو کے بموجب مرد بھی اس کے شکار ہو سکتے تھے۔ فرائڈ اس کے جدید نظریات اور علاج کی تکنیک سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔

۱۸۸۶ء میں جب فرائڈ دی آنا واپس آیا تو اس نے سوسائٹی آف میڈیسن کے سامنے اپنے مشاہدات اور تاثرات پر مبنی رپورٹ پیش کی مگر فرائڈ کی توقعات کے برخلاف اس کی بے حد مخالفت اور نکتہ چینی کی گئی۔ سوسائٹی کے صدر نے اس کے بیانات کو "ناقابل یقین" قرار دیا۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ مردوں کو کیسے ہسٹریا ہو سکتا ہے کیونکہ ان کے خیال میں تو اس کا تعلق صرف رحم ہی سے تھا۔

فرائڈ بد دل تو ہوا مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور مرد مریض کی جستجو میں رہا آخر کار اسے ایک مریض مل گیا اور اب اس سوسائٹی کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ گو سب نے تالیاں تو بجائیں مگر کسی نے بھی مزید دلچسپی کا اظہار نہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرائڈ نے ان سب سے تقریباً قطع تعلق کر لیا اور اپنی آزادانہ پریکٹس شروع کر دی۔

اس نے عصبی بیماریوں کے لیے تنویم اور برقیاتی علاج کا سہارا لیا۔ اگلے پانچ سالوں تک فرائڈ نے کسی قسم کا علمی اور تحقیقی کام نہ کیا بلکہ اپنے معاشی حالات کو بہتر بنانے کی غرض سے اپنی پریکٹس ہی میں مشغول رہا۔

تحلیل نفسی کی تحریک

جب فرائڈ کی پریکٹس چل نکلی اور معاشی لحاظ سے اسے کچھ آسودگی نصیب ہوئی تو اس نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ باقاعدگی سے شروع کر دیا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب فرائڈ نے تحلیل نفسی کے ضمن میں پہلی مرتبہ لاشعور کے

حرکات کی اہمیت کو دریافت کیا جن کی بنیاد جنسی جذبات اور بچپن کی ناخوشگواریوں پر استوار ہوتی ہے۔ اپنے ان خیالات کی وضاحت کے لیے اور عوام تک پہنچانے کے لیے فرائڈ نے تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر کو بھی اپنایا۔

یہ لیکچر ہر ہفتہ کی شام کو ہوتے تھے اور گو ہر کس و ناکس کے لیے صلائے عام تھی مگر حاضرین کی تعداد چھ سات سے تجاوز نہ کرتی تھی اور بعد میں بھی اس میں کوئی ایسا خاص اضافہ نہ ہوا۔ اس کی تقریر کے بارے میں تھیوڈور ریخ کا کہنا ہے۔

"یقینی طور سے وہ کوئی شعلہ نوا مقرر نہ تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسے تقریر کرنا مرغوب نہ تھا کیونکہ تقریر شروع کرنے سے پہلے اسے ہمیشہ ایک مخصوص قسم کی جھجک پر قابو پانا پڑتا تھا۔" اور شاید یہی وجہ تھی کہ فرائڈ نے تقریر کے دوران کبھی بھی الفاظ کا جادو جگانے اور اپنے نظریات کو منوانے کے لیے سامعین کے جذبات کو کھلونا بنانے کی سعی نہ کی۔ وہ ہمیشہ فی البدیہہ بولنا پسند کرتا اور اسے ان لوگوں سے سخت چڑ تھی، جو تقریریں لکھ کر لاتے تھے اسی لیے اس نے کبھی بھی اپنے شاگردوں اور دوستوں کو لکھی ہوئی تقریر پڑھنے کی ترغیب نہ دی۔

فرائڈ اپنی تقریر کی تیاری سے قبل لمبی سیر کرتا اور اس فرائڈ نے تیس سال تک لیکچر دیتا رہا پہلے لیکچر میں "سامعین" کی تعداد صرف تین تھی۔ لیکن جب ۲۳ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کو اس نے تحلیلِ نفسی کے لیے تمہیدی لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا تو اس وقت ستر کے قریب سننے والے موجود تھے اگلے ماہ ان کی تعداد سو تک پہنچ گئی۔

چہل قدمی کے دوران وہ تقریر کے تمام پہلوؤں اور موضوع کے سیاق و سباق پر غور کر لیا کرتا تھا۔

اس نے ایک مرتبہ تھیوڈور ریخ کو بتایا کہ میں تقریر کے وقت سامعین میں سے کسی ایک ہمدرد سامع کی حتیٰ کہ یہ فرض کر لیتا ہوں کہ گویا میں صرف اس سے ہی مخاطب ہوں — اور شاید اسی لیے فرائڈ کی تقریر میں بات چیت کا سا انداز پایا جاتا تھا۔ اس کی آواز میں تموج نہ تھا اور نشیب و فراز وغیرہ کی عدم موجودگی کی وجہ سے یہ اس ڈرامائی تاثر سے محروم تھی جو بعض مقررین کی خصوصیت ہوتا ہے گو اس کی آواز میں کھرج نہ تھی اور اسے زیادہ زور دے کر بولنا بھی ناپسند تھا، لیکن پھر بھی وہ لہجہ کی خوشگواری سے سامعین کے ذہن پر قبضہ کر لیتا تھا۔ بعض اوقات وہ سنجیدہ اور علمی قسم کی بحث کے دوران کوئی مزاحیہ واقعہ بطور دلیل پیش کر دیا کرتا تھا، اسی طرح بقول ارنسٹ جونز فرائڈ کا یہ محبوب انداز تھا کہ کسی سوال کے جواب میں وہ کوئی نہ کوئی بہترین قسم کی یہودی کہاوت بیان کر دیتا اور ان کہاوتوں کا ذخیرہ کبھی ختم ہونے میں نہ آتا۔

فرائڈ کو یہ احساس تھا کہ اس کے لیکچروں میں جن نظریات کا اظہار کیا جاتا ہے وہ کیونکہ عام مذہبی ضوابط، اخلاقی اقدار سماجی پابندیوں کے خلاف ہیں اس لیے ہر انسان کا ذہن انہیں اتنی آسانی سے قبول نہیں کر سکتا، اس لیے وہ ہر قسم کے سوالات اور اعتراضات کو مکمل سکون سے سنتا اور نہایت ہی صبر سے معترضین کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن وہ اپنے نظریات سے ذرا بھی نہ ہٹتا، اگر دوسرا اس کے نظریات کو قبول نہیں کرتا یا وہ انہیں نہیں سمجھ سکتا تو یہ اور بات ہے لیکن وہ ایسے لوگوں کی خاطر اپنے نظریات میں ترمیم و تنسیخ کرنے کا قائل نہ تھا۔

ان لیکچروں کے طفیل فرائڈ کو بعض اچھے اور مخلص دوست اور کارکن مل گئے۔ یوں سمجھیے کہ یہ لیکچر اس عظیم علمی تحریک کا سنگِ بنیاد تھے جس نے بعد میں ..... INTERNATIONAL PSYCHO-ANALYTIC ASSOCIATION کی صورت اختیار کی تھی۔

فرائڈ کے ابتدائی معتقدین میں سے یہ سات اصحاب زیادہ نمایاں ہیں، ابراہم ایٹینگون (EITINGON) فرینزی (FERENCZI) جونز (JONES) رینک (RANK) اور ہینس ساچس (HANNS SACHS) فرائڈ کو قدیم تاریخی نوادر جمع کرنے کا شوق تھا اس نے نوادرات کے ذخیرہ میں سے ان ساتوں کو ایک ایک قیمتی پتھر اپنی دوستی اور خلوص کے اظہار کے طور پر دیا۔ اس سے ان سب میں اور بھی زیادہ یگانگت ہو گئی ہینس ساچس نے اپنی کتاب FREUD: MASTER AND FRIEND میں اس حلقہ پر THE SEVEN RINGS کے عنوان سے تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

گو فرائڈ کے سبھی ساتھی اس سے محبت کرتے تھے لیکن کیونکہ ان سب کا مطمحِ نظر علمی تھا اور ان کی دلچسپی کا واحد مرکز تحلیلِ نفسی اور اس سے وابستہ مسائل تھے، اس لیے کوشش کے باوجود بھی یہ لوگ متحد نہ رہ سکے اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ فرائڈ سے پہلے ان مسائل کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ لیکن فرائڈ کے زیرِ اثر ان لوگوں نے اب ان موضوعات پر تحقیق شروع کی اور ظاہر ہے کہ سب کے نتائج یکساں نہ ہو سکتے تھے اس لیے اپنے اپنے نظریات کے تحفظ کی بناء پر اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی، چنانچہ ان علمی اختلافات کی بناء پر فرائڈ کا ساتھ چھوڑنے والوں میں الفرڈ ایڈلر، ڈاکٹر ژونگ، اور اوٹو رینک وغیرہ بہت زیادہ نمایاں ہیں۔

فرائڈ کو ظاہر ہے کہ اس کا بہت دکھ ہوا ہوگا لیکن اس نے اپنے نظریات میں ترمیم گوارا نہ کی اور اسی لیے بعد میں اس نے تحلیلِ نفسی کی تحریک کا سارا بار اپنے کندھوں پر اٹھا لیا، اس کے ابتدائی عقیدت مندوں میں سے صرف ایک ہینس ساچس ہی ایسا تھا، جو آخر دم تک اس کے نظریات پر کاربند رہا اور جس کی عقیدت میں ذرا برابر بھی فرق نہ آیا۔ اس معاملہ میں فرائڈ ایک چٹان ثابت ہوا۔ اسے کیونکہ عام دنیا سے ستائش کی تمنا نہ تھی اور نہ ہی اسے کسی صلہ کی توقع تھی اس لیے اس نے مخالفوں کی نکتہ چینیوں یا تخریبی تنقید کی ذرا برابر بھی پرواہ نہ کی۔ فرائڈ نے خود بھی ایک خط میں لکھا ہے:

"جہاں تک میری ذاتی حساسیت کا تعلق ہے تو وہ ان سالوں میں بالکل کند ہو کر رہ گئی تھی۔ اور یہ میرے فائدہ کے لیے تھا ..... جس زمانہ میں میں صرف تن تنہا تحلیلِ نفسی کے لیے کام کر رہا تھا تو اس دور میں میں نے جو دنیا کی رائے کا کوئی خاص احترام نہ کیا ... یا دانشوروں کی داد و ستائش کی تمنا نہ کی تو اس پر کسی کو تعجب نہ ہونا چاہیے۔"

یہ فرائڈ کی شخصیت کا ایک ایسا اہم پہلو ہے جس سے اس کے کردار پر ایک خاص انداز سے روشنی پڑتی ہے۔ آج فرائڈ کو جدید نفسیات کا بانی اور باپ گنا جاتا ہے لیکن فرائڈ کی زندگی میں یہ حالت تھی کہ بقول ابرام کارڈنر امریکی یونیورسٹیوں میں گو طبیعیات اور کیمیا والے اس کا نام احترام سے لیتے تھے مگر نفسیات کے شعبہ میں اسے "پاگل" قرار دیا جاتا تھا۔ اس کے اپنے وطن میں اس کی جو زیادہ سے زیادہ عزت افزائی ہوئی وہ یہ تھی کہ اسے یونیورسٹی میں لیکچر دینے کی اجازت مل گئی یہ عزت پروفیسروں اور یونیورسٹی کے شعبہ جات سے متعلق دانشوروں کو حاصل ہوتی تھی، واضح رہے کہ وہ باقاعدہ پروفیسر نہ تھا اور یہ بھی اس کے نفسیاتی نظریات کی وجہ سے نہیں بلکہ ابتدائی میں تحقیقات کی بناء پر۔ جب فرائڈ ستر برس کا ہو چکا اور اس کی شہرت تمام دنیا میں پھیل گئی تو اس وقت حکومت نے اسے "پروفیسر" کا خطاب دیا۔

فروری ۱۹۲۶ء میں اسے ارنسٹ جونز کی سعی بسیار کے بعد BRITSH PSYCHOLOGICAL SOCIETY کا اعزازی "فیلو" بنا دیا گیا۔ ارنسٹ جونز کے بیان ہے کہ اس سے پہلے دو مرتبہ اس کی یہ تجویز شدید مخالفت کی بناء پر مسترد کر دی گئی ۱۹۳۰ء میں اسے "گوئٹے پرائز" ملا۔ اور اس کے پانچ سال بعد اسے ROYAL SOCIETY OF MEDICINE کا اعزازی فیلو بنا د

کیا اس وقت کوئی خاص لعنت نہ ہوئی بلکہ سب اراکین نے متفقہ طور سے اس کی تائید کی اس طرح امریکہ کی کلارک یونیورسٹی نے اسے ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند عطا کی۔

فرائیڈ کو اپنے کام سے مطلب تھا اس لیے اس نے ان اعزازات کی اتنی زیادہ پرواہ نہ کی، البتہ رائل سوسائٹی کے بارے میں اسے صحیح معنوں میں مسرت ہوئی اور وہ اسے اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتا تھا۔

محنت! محنت!! محنت!!!

جہاں تک فرائیڈ کی ذاتی زندگی کا تعلق ہے وہ بالکل خشک عام تفریحات سے عاری اور اَن تھک محنت کی زندگی تھی، وہ عام دنیا سے کٹا ہوا صبح سے شام تک اپنے کام میں معروف رہتا تھا۔ کھیل تماشوں کے شوقین حضرات کے لیے اس کی زندگی کسی "ہیرو" کی زندگی نہ تھی وہ انسان جس نے دنیا کے علم میں ایک انقلاب برپا کر دیا، خود اس کی زندگی ہر قسم کے انقلابات سے عاری تھی۔

جنس اور اس کے موضوعات سے جن لوگوں نے تلذذ کا پہلو وابستہ کر رکھا ہے وہ اگر فرائیڈ کی زندگی کو "کاسانوا" کی زندگی کے آئینہ میں دیکھنے کی توقع رکھتے ہوں تو انہیں اس کی زندگی رندی و ہوسناکی کے افسانوں سے تہی داماں نظر آئے گی، وہ تو عام لوگوں کی طرح تھیٹر اور اوپیرا کا بھی شوقین نہ تھا حالانکہ یہ چیزیں تمام یورپ کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں، اس نے تھیٹر نہ دیکھنے کا اصول یونانی المیہ نگار سوفوکلیز SOPHO-CLES کے مشہور ڈرامہ" ایڈی پس" کی خاطر توڑا اور ایڈی پس الجھاؤ کا نظریہ پیش کرنے والے نے اگر اس کی خاطر اپنی قیمتی شام کو چھوڑا تو کچھ گوارا نہ کیا۔ اس کے لیے یہ بھی ایک علمی کام تھا۔ اسی طرح اس نے ایک آدھ مرتبہ شیکسپئر کے ڈراموں (مثلاً ہیملٹ) کی خاطر تھیٹر کا رُخ کیا۔

فرائیڈ کو شروع سے ہی موسیقی سے نفرت تھی اس لیے ظاہر ہے کہ اس کے لیے ان چیزوں میں زیادہ دلچسپی نہ ہو سکتی تھی، فرائیڈ کو وقت ضائع ہونے کا بہت خیال رہتا تھا اس لیے لوگوں سے رسمی قسم کے میل ملاپ دعوتوں اور رسومات میں شرکت وغیرہ سے وہ ہمیشہ محترز رہتا تھا۔ کبھی کبھار شام کو وہ کوئی خاص علمی، ادبی قسم کی تقریر سننے چلا جاتا تو چلا جاتا ورنہ عموماً بھیڑ بھاڑ کے مقامات سے دور ہی رہتا۔

وہ سال کے ۹ ماہ خوب ڈٹ کر کام کرتا اور تین مہینوں کے لیے کہیں باہر سیاحت کو نکل جاتا۔ الپائن کے اکثر تفریحی مقامات کی اس نے خوب سیر کی، بعض اوقات اس کے کنبہ والے اس کے ساتھ ہوتے یا پھر محض بے تکلف احباب کا ساتھ ہوتا اس سلسلہ میں اس نے اٹلی اور یونان کی بھی سیر کی۔ فرائیڈ سیاحت کے ان مواقع پر بالکل نوجوانوں ایسی پھرتی اور چونچال پن ظاہر کرتا تھا، ویسے بھی اس کے بیٹے مارٹن فرائیڈ کے بقول اس کے چلنے کی رفتار بہت زیادہ تھی اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان سب کو دلچسپ باتیں سناتا ہوا خوب سیر کراتا۔

لیکن جہاں تک باقی نو ماہ کا تعلق تھا تو ان میں فرائیڈ خوب کام کرتا۔ گو اس کے گھر کے دیگر کمرے اس عہد کے مذاق کے مطابق آراستہ کیے گئے تھے لیکن ان میں کوئی خصوصیت نہ تھی۔ البتہ فرائیڈ کے مطالعہ کا کمرہ اپنی انفرادیت کی بنا پر ملاقاتی کے ذہن پر ایک خاص تاثر چھوڑتا تھا۔ کتابوں کی الماریاں چھت تک پہنچتی تھیں شیشے کی الماریوں میں قدیم یونانی اور دیگر تاریخی نوادرات سجائے گئے تھے، بقول ابراہم کارڈینر فرنیچر پر گہرے سرخ رنگ کی "پلش" لگی تھی، دیواروں پر بعض غیر ملکی انجمنوں کے عطا کردہ اعزازی رکنیت کے ڈپلومے آویزاں تھے۔ دکٹر وان وطاکر نے ایک فرانسیسی تصویر کا بھی بڑی خصوصیت سے ذکر کیا ہے یہ ایک عریاں عورت کی تصویر ہے جو خود فراموشی کے عالم میں لیٹی ہے۔ یہ تصویر بھی تحلیل نفسی کے علاج سے متعلق تھی۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا یونانی راکھ دان تھا۔

یہی وہ کمرہ تھا جس میں فرائیڈ نے ایک طویل مدت تک اپنے نظریات کو کھنگالا اور انہیں سپردِ قلم کیا۔

اس کے کارِ عمل کے بارے میں ہینس ساچس کا بیان ہے کہ وہ صبح ۹ بجے سے ایک بجے مریضوں سے ملاقات کرتا، اس کے بعد گھر والوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا اور پھر ایک گھنٹہ کی چہل قدمی ۔ لیکن اس وقت وہ عموماً چہل قدمی نہ کرپاتا بلکہ کتابوں کی دوکانوں حجام، سگار فروش یا نوادار فروخت کرنے والوں کے ہاں پھیرا لگا لیتا، اس کے بعد کا ایک گھنٹہ ان مخصوص مریضوں کے لیے تھا جنہوں نے پہلے سے ملاقات کا وقت مقرر کر رکھا ہوتا۔ اس کے بعد شام کے سات یا ساڑھے سات بجے تک پھر مریضوں سے ملاقات، رات کے کھانے کے بعد وہ اپنے دارالمطالعہ میں چلا جاتا جہاں آدھی رات سے پہلے کبھی بھی اس کے کمرہ کی بتی نہ بجھتی، فرائیڈ کے بیٹے مارٹن نے بھی لکھا ہے کہ وہ صبح ۸ بجے سے کھانے کے اوقات نکال کر اگلی صبح کے تین بجے تک کام کرتا رہتا۔ فرائیڈ کی بیوی مارتھا کا کہنا ہے کہ وہ تکیہ پر سر رکھتے ہی سو جاتا اور چند گھنٹوں کی نیند اس کی تمام تھکن کو دور کر کے اسے بالکل تازہ دم بنا دیتی تھی۔

فرائیڈ کی سخت محنت کا اس کی تحریر کردہ کتابوں کی طویل فہرست سے تو اندازہ ہوتا ہی ہے لیکن اس کے علاوہ جب ہم ان لاتعداد کتابوں کی فہرستوں پر نگاہ ڈالتے ہیں جن سے وہ اپنی کتابوں کے سلسلہ میں استفادہ کرتا تھا تو پھر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں اپنے کام میں جان ڈال دیتا تھا۔

فرائیڈ کو سگار نوشی کا بہت شوق تھا، صبح سے لے کر رات کو سوتے تک وہ مسلسل سگار نوشی کرتا اور اس دوران میں وہ کم از کم بیس سگار پی جاتا ہوگا وہ بڑھیا پتی کا معتدل سگار پسند کرتا تھا، اس کی سگار نوشی کی یہ انتہا تھی کہ وہ سگار نہ پینے والوں سے بعض اوقات چڑ جاتا تھا۔ اور یہ غالباً سگار کا تلخ دھواں ہی ہوگا جس کے سہارے وہ اتنا کام کر لینے کا عادی تھا۔

مشفق باپ

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ فرائیڈ کو اپنے کنبہ سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی مگر یہ صحیح نہیں اس کے چھ بچے تھے۔ میتھلڈ MATHILDE مارٹن، آلیور، ارنسٹ، صوفی SOPHIE اور اینا، یہ اینا وہی ہے۔ جس نے اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے خود بھی نفسیات پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں، فرائیڈ کو ان سب سے بہت زیادہ پیار تھا، وہ بچوں کے لیے اپنی مصروفیات میں سے کسی نہ کسی طرح سے وقت نکال لیا کرتا تھا اس نے اپنے دوست ڈاکٹر فلیس FLIESS کو جو خطوط لکھے ہیں ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اسے اپنے بچوں سے کتنی محبت تھی اور وہ ان کا کتنا خیال رکھتا تھا جب وہ شام کو مریضوں سے فراغت پاکر آتا تو گھر میں داخلہ کے وقت وہ جانور کی غراہٹ سے مشابہ آواز نکالتا تاکہ اس کی چھوٹی بچی کو اس کی آمد کا پتہ چل جائے اسی ضمن میں ہیلن واکر پنر HELEN WALKNER PUNER نے ایک واقعہ بیان کیا ہے جس کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہیں ایک دفعہ اس کی سب سے بڑی بیٹی میتھلڈ اتنی سخت بیمار ہوئی کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی۔ فرائیڈ پریشانی کے عالم میں کمرہ میں ٹہل رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ کمرہ میں رکھے وینس کے خوبصورت مجسمہ پر پڑی ۔ اس نے ایک لمحہ کے لیے اسے دیکھا اور پھر پاؤں سے سلیپر اتار کر بت پر دے مارا ۔ نتیجہ ۔ وہ خوبصورت بت گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس پر اس نے بڑے سکون کے ساتھ ایک جرمنی شعر پڑھا جس کا مفہوم یہ ہے۔

افسوس! میڈیسی کی وینس اب ناپید ہے

فرائیڈ نے اپنے اس فعل کے متعلق بعد میں بتایا کہ اسی صبح اس کی بیٹی کی حالت میں قدرے افاقہ ہو گیا تھا اس لیے اس نے بطور قربانی وہ بت توڑا۔

اور یہی وجہ تھی کہ فرائیڈ کے کنبہ والے اس پر جان چھڑکتے تھے۔ بچوں کے لیے ان کا باپ ایک ایسی ہستی تھا جو مستقل طور سے ان کی دلچسپیوں کو اپنی طرف منعطف کرائے رکھتا تھا اس کے لیے بچوں کی شیفتگی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بچہ کچھ عرصہ گھر سے باہر رہنے کے بعد جب واپس آیا تو دوسرے نے ابا کے بارے میں اس کی معلومات میں یہ اضافہ کیا۔ ابا اب تیلی میں نہیں بلکہ سبز پیالی میں چائے پیتے ہیں

جبڑے کا آپریشن

فرائیڈ کی صحت شروع سے ہی بہت اچھی رہی تھی سخت دماغی مشقت کے باوجود اسے چھوٹی موٹی جسمانی خرابیوں سے کبھی بھی سابقہ نہ پڑا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ خود بھی ڈاکٹر تھا اور اپنے معمولات کو اس انداز سے ترتیب دے رکھا تھا کہ مناسب وقفوں کے بعد جسم اور دماغ کو سکون اور راحت ملتی رہے۔

بچپن میں ایک مرتبہ وہ کوئی چیز اتارتے وقت سٹول سے گر پڑا جس سے اس کا نچلا جبڑا زخمی ہو گیا یہ زخم اتنا گہرا تھا کہ اس کا نشان تمام عمر کے لیے رہ گیا ۱۸۸۵ء میں اسے چیچک نکلی مگر اس کا حملہ اتنا سخت نہ تھا اور نہ مرض کا حملہ فرائیڈ کی کیونکہ ایک مصروف زندگی تھی اس لیے وہ عام خاوندوں کی مانند گھر میں عملی قسم کی دلچسپی نہ لے سکتا تھا اور یوں نہ صرف امور خانہ داری بلکہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا بوجھ بھی اس کی بیوی کے کندھوں پر آ پڑا تھا۔ گھر کے انتظامی معاملات میں وہ قطعی طور سے خود مختار تھی اور یہ اس کا انعام تھا کہ فرائیڈ کا گھر سکون کی ایک جنت تھا گھر کی فضا ایسی خوشگوار تھی اور بچے ایسے ایسے تمیز دار تھے کہ کبھی کسی نوکر نے تنگ آ کر گھر سے بھاگنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اچھا ہو گیا بلکہ چہرے پر کسی قسم کے نشانات بھی نہ رہے۔

فروری ۱۹۲۳ء میں فرائیڈ کے جبڑے میں خرابی کے آثار پیدا ہو گئے، اس نے خود بھی اس کا ایک خط میں ذکر کیا ہے اور سگار نوشی کو اس کا باعث بتایا ہے فرائیڈ کی اپنی تشخیص کے مطابق یہ EPITHELIOMA تھا، ابتدا اس نے اپنے طور سے اس کا کچھ علاج بھی کیا مگر جب حالت زیادہ خراب ہو گئی تو اپریل کے تیسرے ہفتہ میں وی آنا کے ایک سرکردہ ماہر ہاجک HAJEK نے اس کا معائنہ کیا اور اس نے صاف کہہ دیا کہ اس مرض والوں کو زیادہ دیر تک زندہ رہنے کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔ اس نے اس کا آپریشن کیا مگر وہ بے سود رہا اور یہ ان ۳۳ آپریشنوں کی ابتداء تھی جو فرائیڈ کو برداشت کرنے پڑے۔ کیونکہ یہ کوئی معمولی بیماری نہ تھی بلکہ یہ ناسور تھا۔ اس سلسلہ میں اس کے جبڑے کی ہڈی کا کچھ حصہ بھی نکالنا پڑا اور خوراک اور گفتگو کے لیے مصنوعی جبڑا لگانا پڑا۔

فرائیڈ کو جسمانی تکلیف کا تو خیر احساس ہو گا ہی لیکن اس سے زیادہ اثر یہ ہوا کہ وہ اب کیونکہ گفتگو میں بعض الفاظ ادا کرنے پر قادر نہ رہا تھا اس لیے بعض اوقات اس کے مفہوم کو سمجھنے میں بڑی مضحکہ خیز قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتیں اس کے ساتھ ہی وہ دوسروں کے سامنے کھانے میں بھی بے حد جھجک محسوس کرتا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فرائیڈ جو پہلے بھی کوئی اتنا زیادہ ملنسار نہ تھا اور جس کا حلقۂ احباب محض گنے چنے چند ہم مشربوں تک محدود تھا، اب بالکل ہی سب سے کٹ کر رہ گیا اور مخصوص دوستوں کے علاوہ باقی سب سے میل ملاپ بند کر دیا۔ اب اسے کتوں سے زیادہ دلچسپی ہو گئی تھی چنانچہ یہ ان کے ساتھ کھیلتا رہتا۔

آخری ایام

پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر معاہدہ وارسیلز میں جرمنی دوسری جنگ کے لیے نفرت و حقارت کے بیج بو دیئے گئے تھے چنانچہ ہٹلر نے نطشے کے فلسفہ کا سہارا لیتے ہوئے آریائی نسل کی سربلندی اور جرمن قوم کی عالمی سربراہی کے لیے جب دوسری جنگ عظیم کا آغاز کیا تو ابتدا میں نازیت کا سیلاب یورپ کو بہا کر لے گیا اور آسٹریا اس کے اولین شکاروں میں سے تھا۔

فرائیڈ کو نازی عہد میں اپنے لیے کسی بہتری کی توقع نہ تھی کیونکہ نازیوں نے جن مفکرین اور دانشوروں کی کتابوں کو نئے جرمنی کے لیے خطرہ کا باعث سمجھتے ہوئے جرمنی کے چوک میں نذرِ آتش کیا تھا۔

ان میں فرائیڈ کی تصانیف بھی تھیں۔

اسی دوران میں فرائیڈ کو اکثر مقامات سے دعوت نامے موصول ہوئے مگر اس نے وی آنا چھوڑنے سے انکار کر دیا، لیکن حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے یہودی خاص طور سے ستائے جا رہے تھے اور فرائیڈ کی بین الاقوامی شہرت اور اس کا علمی مرتبہ بھی اس کے بچاؤ کا ذریعہ نہ بن سکے۔

فرائیڈ کے بہی خواہوں کو اس کی سلامتی کی فکر لگی تھی چنانچہ لندن سے اس کا مخلص دوست ارنسٹ جونز اور پیرس سے یونان کی شہزادی میری بوناپارٹ وی آنا میں آئے اور نیویارک کی ڈورو تھی برلنگھم نے اس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن سعی کی۔

ارنسٹ جونز نے لندن میں سر سیموئیل ہور SIR SAMUEL HOARE ہوم سیکرٹری سے ملاقات کر کے اسے برطانیہ لانے کے لیے ضروری مراحل طے کرا لیے

بقول مارٹن فرائیڈ کو جرمنوں نے خوب تنگ کیا تھا لیکن جب یہ ملک چھوڑنے لگا تو "گسٹاپو" GESTAPO کے کچھ نمائندوں نے آ کر اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اس امر کی ایک سند دے کہ اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا گیا ہے اس پر فرائیڈ نے لکھا:

"میں ہر ایک کے لیے "گسٹاپو" کی پُرزور سفارش کر سکتا ہوں" وہ فوجی اس کے طنز کی گہرائی کو نہ سمجھ سکے اور خوشی خوشی چلنے لگے۔

اسے جانے کی اجازت تو مل گئی لیکن جرمن حکام نے اس کی لائبریری، شفاخانہ، دارالاشاعت اور قدیم تاریخی نوادرات وغیرہ سب پر قبضہ کر لیا۔ گو شہزادی میری نے کثیر معاوضہ ادا کر کے اس کے نوادرات اور لائبریری بچا لی لیکن اس کے دارالاشاعت کی تمام مطبوعہ کتب ضائع کر دی گئیں، اس کی بیٹی اینا اور بیٹے مارٹن فرائیڈ کو جسمانی اذیتیں دی گئیں یعنی ہر ممکن طریقہ سے انہیں ذلیل اور رسوا کیا گیا۔

مگر اہل انگلستان نے اس کی آمد پر اتنی عزت افزائی کی کہ پچھلی تلخیوں کا ایک حد تک مداوا ہو گیا

یہ ۱۹۳۸ء تھا!

لندن میں فرائیڈ کا قیام ۲۰ مارسفیلڈ گارڈنز MARES FIELD GARDENS میں تھا۔ گذشتہ واقعات کے ذہنی صدمہ کے ساتھ ساتھ اب اس کی صحت بالکل جواب دے چکی تھی۔ اس کے جبڑے میں مستقل طور سے درد رہتا اور وہ بمشکل گھنٹہ آدھ گھنٹہ کے لیے اونگھ سکتا۔ ورنہ نیند تو اب دور دیس کی شہزادی بن چکی تھی، بات چیت بھی ناممکن سی ہو کر رہ گئی تھی اور ایک ایک لفظ کی ادائیگی شدید درد کی صورت میں خراج وصول کرتی تھی۔ لیکن اس کی قوت ارادی اب بھی ایسی ہی تھی اور جب کبھی درد سے ذرا افاقہ ہوتا تو وہ فوراً کام شروع کر دیتا۔

بعد میں اس کے لیے کھانا پینا بھی مشکل ہو کر رہ گیا اور اب وہ محض ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں اور وہ انسان جس کے افکار نے انسانیت کے

قدروں کو بدل دیا تھا۔ اب خاموش ایک کمرہ میں کھڑکی سے باہر باغ کے پھولوں کو دیکھتا رہتا
اس کے آخری ایام کے متعلق ارنسٹ جونز نے یوں لکھا ہے۔

"ناسور اب گال سے بڑھ کر باہر کی طرف پھیل رہا تھا اور رسنا د خون بھی بہنے لگا تھا
تھا اس کی کمزور حالت اور تکلیف کو بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے ۱۹ ستمبر کو
مجھے بلوایا گیا تاکہ میں اسے الوداع کہہ سکوں، میں نے اس کا نام لے کر اسے بلایا وہ اس
وقت آنکھیں بند کئے تھا میری آواز سن کر اس نے آنکھیں کھول کر جب مجھے پہچان
لیا تو اپنا ہاتھ ہلایا اور بت اس نے اپنے ہاتھ کو اس طرح معنی خیز انداز سے گرایا کہ اس
میں معانی کا ایک بے پایاں سمندر پنہاں تھا۔ خیر مقدم، الوداع اور حالات پر خود کو
چھوڑ دینا۔ اس ایک اشارہ میں بھی کچھ پنہاں تھا اور گویا اس نے واضح طور سے کہہ دیا:
"اب تو خاموشی ہی خامشی ہے"

ہمیں اس موقعہ پر بولنے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوئی، کیونکہ اگلے ہی لمحے وہ پھر
سو چکا تھا ۲۱ ستمبر کو فرائیڈ نے اپنے ڈاکٹر شور سے کہا۔ "میرے عزیز شور ۔ کیا
تمہیں ہماری ابتدائی گفتگو یاد ہے؟ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تکلیف برداشت
سے باہر ہوگئی تو تم میری امداد کروگے ۔۔۔ اب تم دیکھ رہے ہو کہ یہ محض اذیت ہے
اذیت ہے اور اب اس کی کوئی تک نہیں رہی۔ شور نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے
وعدہ کیا کہ وہ اسے مسکن دوا دے گا جس پر فرائیڈ نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا
"ہماری اس بات چیت کے متعلق اینا کو بتا دینا" فرائیڈ کے لہجہ میں نہ تو جذباتیت
تھی اور نہ ہی خود ترسی کا شائبہ، محض حقیقت پسندی۔ یہ منظر اپنی اثر انگیزی کی
بنا پر ناقابل فراموش ہے۔

اگلی صبح شور نے فرائیڈ کو مارفیا کا ½ گرین دیا۔ فرائیڈ ایسے کمزور انسان کے
لیے اتنی تھوڑی سی مقدار بھی کافی رہی اور پھر ویسے بھی تمام عمر اس قسم کی چیزوں سے
اس کا کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ اس لیے اس نے سکون کی ایک آہ بھری اور طمانیت بخش
نیند اس پر چھا گئی۔ اب یہ ظاہر تھا کہ اس کے مضمحل قویٰ اس کا مزید ساتھ نہ دے
سکیں گے چنانچہ اگلے دن کی نصف شب کے قریب یعنی ۲۳ ستمبر ۱۹۳۹ء میں اس کا
انتقال ہو گیا۔ اس کی طویل اور مشقت سے بھرپور زندگی اب ختم ہو چکی تھی اور یہ اس
کی مشکلات اور تکالیف کا اختتام تھا، فرائیڈ ایک حقیقت پسند تھا اور اس کی موت
بھی اس کی زندگی ہی کی مانند تھی

۲۶ ستمبر کی صبح کو فرائیڈ کی نعش جلا دی گئی CREMATION اس
المیہ تقریب کے موقع پر اس کے احباب اور بہی خواہوں کی کثیر تعداد موجود تھی اور
اس کی راکھ کو اس کے ایک محبوب یونانی مرتبان میں محفوظ کر دیا گیا۔

۲۔ فرائیڈ۔ نفسیاتی مطالعہ

گذشتہ صفحات میں ۸۳ سالوں پر محیط فرائیڈ کی زندگی کا جو تانا بانا پیش کیا گیا
اس سے ایک ایسے انسان کی تصویر ذہن میں آتی ہے جو عزم صمیم کے ساتھ ان تھک محنت
اور لامحدود ذہنی قابلیت کا حامل ہو۔ بظاہر فرائیڈ کی زندگی ایک عام قسم کی زندگی ہے
جس میں انقلابات اور عروج و زوال کا کوئی دخل نہیں ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے
سامنے ایک واضح منزل تھی جس کو حاصل کر لینے کے وسائل اور ڈگر سے وہ واقف معلوم
ہوتا ہے اس کی زندگی میں بعض دیگر عظیم شخصیات (مثلاً روسیو) ایسے نشیب و فراز
کا فقدان نظر آتا ہے۔ لیکن اگر ژرف بینی سے اس کی ذہنی کیفیات اور نفسیاتی ساخت
کا جائزہ لیا جائے تو فرائیڈ کی زندگی اکثر لوگوں کی نسبت کہیں زیادہ دلچسپ نظر آتی ہے

مجموعۂ اضداد

فرائیڈ کی شخصیت کا یہ پہلو ایسا ہے کہ فرائیڈ کے ہر ایک
سوانح نگار نے اس پر زور دیا ہے۔ فرائیڈ کو شاید
خود بھی اس کا احساس تھا چنانچہ اس نے ایک مرتبہ ڈاکٹر ژنگ سے کہا کہ اگر وہ کبھی
کسی نفسیاتی الجھن میں مبتلا ہوا تو وہ خبط ہو گی جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ذہن
بیک وقت نفرت اور محبت کے دو قوی مقناطیسوں کے درمیان ایک بے بس پن
کی طرح سے تھا، اس سلسلہ میں ارنسٹ جونز رقم طراز ہے:

"جہاں تک انس رجحان کا تعلق ہے تو فطری طور سے ہی انسان اس کا رشتہ
فرائیڈ کی اپنی شخصیت کے مظاہر سے استوار کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے ذہن میں
سائنسی نظم و ضبط اور فلسفیانہ خیال انگیزی کے درمیان ہمیشہ چپقلش رہتی اس لیے
محبت کی گرم جوشی کے ساتھ ہی شدید قسم کا جنسی دباؤ بھی تھا اس کی قوت مردانگی
(جس کا اظہار اس کی تحریروں سے ہوتا ہے) اور اس کی فطرت کی نسائی احتیاجات
ہمیشہ بر سر پیکار رہتیں۔

اس کی یہ خواہش تھی کہ اپنے گرد و پیش میں وہ خود ہی ہر چیز کا خالق ہو مگر
نتیجہ کے لیے وہ دوسروں کی تمنا کرتا، اسے آزادی سے محبت تھی مگر وہ دوسروں پر ہدایت
بھی کرنا چاہتا تھا"۔

تھیوڈور ریخ کا کہنا ہے کہ گو اس میں محبت کی بے انتہا صلاحیت تھی
لیکن وہ شدید قسم کی نفرت کرنے پر بھی قادر تھا۔ بقول ایرک فرام:

"فرائیڈ لوگوں پر انحصار کرنا پسند کرتا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس سے شرمندگی
محسوس کرتے ہوئے اس کے اظہار کرنے سے منفرت بھی کرتا تھا"

فرائیڈ کو خود بھی اس کمزوری کا احساس تھا اور وہ اسے "گداگرانہ فانتزی" کہا
کرتا تھا اس نے ایک ایسی ہی فانتزی کا ذکر کیا ہے جس میں اسے پیرس کے ایک متمول
خاندان کی دولت ورثہ میں ملتی ہے۔

اس کی طبیعت کی متناقضیت

اسے طرح طرح سے متاثر کرتی رہتی تھی لہٰذا اس کی تحریروں کے تجزیاتی مطالعہ سے
بھی یہ حقیقت ایک حد تک آشکار ہو جاتی ہے مثلاً INTERPRETATION
OF DREAMS میں وہ ایک جگہ لکھتا ہے۔

"جہاں تک میں اپنے بارہ میں جانتا ہوں تو مجھے بڑا بننے کی تمنا نہیں"
لیکن آگے جا کر اس نے خوابوں کے ایک سلسلہ کی تعبیر سے اپنے اس دعویٰ کی خود ہی
تردید کر دی، اسی کتاب میں ایک اور جگہ اس نے لکھا ہے کہ اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرنا
محض حماقت ہے لیکن بعد میں اس نے اس تمنا کا اظہار کیا ہے کہ کاش اس کا باپ
پروفیسر یا پریوی کونسلر ہوتا۔

فرائیڈ دنیا کے عظیم ترین حقیقت پسندوں میں سے تھا اس لیے اس سے یہ توقع
رکھی بے جا تھی کہ وہ اپنے کردار کے ان کمزور پہلوؤں کے جواز ——————
مہیا کرتے ہوئے ان سے گریز کے پہلو وضع کرے گا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس قسم کی
کمزوریوں سے فرار ناممکن ہے۔ اس لیے ہنس ساچس کے الفاظ میں اس کا ردعمل یہ
ہوا کہ "اس نے خود کو بہترین فولاد کے دو دھاری نشتر کی مانند مضبوط بنا لیا" اور
اس لیے فرائیڈ کے پاس کمزور اور عاجز لوگوں کے لیے کسی قسم کی ہمدردی نہ تھی چنانچہ
ساچس نے ایک مثال پیش کی ہے اس کے ایک پرانے دوست نے خودکشی کر لی مگر
فرائیڈ پر اس المیہ کا کوئی اثر نہ ہوا۔

اس "نشتر ایسی سختی" پیدا کرنے میں ایک اور رجحان کو بھی دخل ہے ارنسٹ

جونز کا کہنا ہے کہ خواہ مخواہ دوسروں سے بعض غلط قسم کی توقعات وابستہ کر لینے کی بناء پر جب اس کی خوش فہمیاں پوری نہ ہو سکتیں تو اسے کوفت ہوتی اور اسی لیے فرائیڈ کی عوام کے متعلق کوئی اچھی رائے نہ تھی اس کے خیال میں صرف عوام کی ایک محدود سی اقلیت ہی خالص سونے کی ہوتی ہے۔ اور شاید اسی لیے زندگی کے ان مواقع پر جہاں عام لوگوں کی ہمدردی سے پھوٹ پڑتی وہاں فرائیڈ کا انداز نظر عموماً اقلیت کا حامل ہوتا۔

فرائیڈ کی یہ سب سے بڑی کمزوری تھی کہ وہ دوسروں پر اعتبار بھی کرتا اور پھر اس سے اپنی آزادی کو مجروح ہوتا سمجھتے ہوئے وہ اپنے اس رجحان کو ناپسند بھی کرتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یہ ناپسندیدگی افراد پر منطبق ہو جاتی اسی لیے تو اس کے عزیز ترین احباب۔ برئیر، فلیس، اڑنگ، ایڈلر، رینک اور فرینزی — سبھی سے اس کے تعلقات خراب ہو گئے گو تعلقات کی کشیدگی میں نظریاتی اختلافات کو بھی بڑا دخل تھا لیکن ایک اہم وجہ فرائیڈ کا یہ رجحان بھی بنتا ہے وہ پہلے شدید اور جذباتی قسم کی دوستی بڑھاتا، اس کے بعد آہستہ آہستہ اس میں کمی آتی جاتی اور پھر ایک وقت آتا کہ وہ اس سے شدید نفرت شروع کر دیتا۔ اس نفرت کی گہرائی کا اندازہ ایڈلر کی موت پر اس کے ردعمل سے لگایا جا سکتا ہے، جب اس کے دوست آرنلڈ زویگ ARNOLD ZWEIG نے اسے لکھا کہ ایڈلر کی موت نے اس پر کتنا گہرا اثر کیا تو فرائیڈ نے اسے یوں جواب دیا

"میں ایڈلر کے لیے تمہارے ہمدردانہ جذبات کو نہیں سمجھ پایا۔ وی آنا کے مضافات میں جنم لینے والے یہودی بچہ کی ایبرڈین میں موت ہی کی ترقی کی شاہد اور اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ زندگی میں کس مقام تک پہنچ سکا۔ تحلیل نفسی کی تردید سے اس نے جو خدمات سرانجام دی تھیں اس کے لیے دنیا نے واقعی اسے انعام و اکرام سے نوازا۔"

ایک سابق دوست اور مشہور شخصیت کی موت پر اس خط کا طنزیہ اور برہم لہجہ جس شدید نفرت و حقارت کا غماز ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اپنی "تشتریت" کی بنا پر فرائیڈ عام حالات میں کبھی بھی اپنے جذبات اور ہیجانات کا مظاہرہ نہ ہونے دیتا اور ہمیشہ اپنے پرسکون انداز کو برقرار رکھتا جب اس کا بیٹا اپنی مختصر رخصت گزارنے کے بعد روس میں واپس محاذ جنگ کو جانے لگا تو اس نے اسے "گڈ بائی" کہتے ہوئے پرجوش طریقہ سے مصافحہ کیا اور بس!

اس کی وجہ یہی ہے کہ فرائیڈ اس طرح کے مواقع پر جذبات کے اظہار کو ناپسندیدہ خیال کرتے ہوئے اس سے سخت نفرت کرتا تھا۔

فرائیڈ کو عموماً غصہ نہ آتا کیونکہ وہ حتی الامکان اس پر قابو پانے کی کوشش کرتا، اور تھیوڈور ریک نے جب ایک دفعہ اسے سخت غصہ کے عالم میں دیکھا تو اس نے منہ تو گالیاں نکالیں نہ ہی اول جلول بکی — بس اس کے چہرہ کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا اور اس کے دانت اس کے سگار میں گڑ کر رہ گئے۔ لیکن وہ بات کو کبھی نہ بھلاتا تھا یہ کیونکہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو غصہ کا اظہار الفاظ کی صورت میں کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں اس لیے یہ اپنی بے عزتی یا ہتک کو کبھی نہیں بھلا سکتا تھا۔ پیرس سے واپسی پر میڈیکل سوسائٹی کے اراکین نے اس کا مذاق اڑایا تھا، فرائیڈ نے اسے فراموش نہ کیا چنانچہ اس نے مدتوں ان سے کسی قسم کا رابطہ نہ رکھا۔

ذاتی خصائص

"آزادی، جرأت اور احساس فخر — اس کے کردار کے اساسی پہلو ہیں، اور ان ہی تین عظیم ترتوں کو بروئے کار لا کر اس نے "کیوں؟" کا جواب تلاش کیا۔ یہ "کیوں" وہ ہے جو ایک تکلیف دہ احساس کی طرح سے انسانی ذہن پر شعور کی صبح اولیں سے ہی مسلط چلا آرہا ہے۔

فرائیڈ کی ان کرداری خصوصیات کا جائزہ لینے سے پہلے اس کے بچپن کے اس دور کا مطالعہ ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں بچہ خیالوں کے تانے بانے سے خوابوں کے محل تعمیر کرتا ہے۔

فرائیڈ کو شروع سے ہی قوت سے دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ بطل پرستی سے نہ صرف بچوں ہی کی (بلکہ بعض حالات میں بالغ افراد کی) ذہنی پسند و ناپسند کے حانیہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے — اور فرائیڈ اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ جب اس کا چھوٹا بھائی پیدا ہوا تو اس کے باپ نے تمام اراکین کنبہ سے نوزائیدہ کے نام کے بارے میں رائے طلب کی اور فرائیڈ کا نام پسند کیا گیا، اس کا نام ایگزینڈر سکندر رکھا گیا۔ اس نے اس نام کی پسندیدگی کی دو وجوہات بتائی تھیں، قوت اور سخاوت۔ اس ضمن میں ہیلن واکر کا بیان ہے:

"عنفوان شباب کے تمام دور میں اس کا (یعنی فرائیڈ کا) ذاتی ہیرو سکندر نہیں تھا بلکہ ایک دوسرا جرنیل — جی ہاں! کارتھیجیا کا یہ عظیم رہنما جو پس منظر سے ابھرا تھا اس نے روم کی سلطنت کے لیے لازوال نفرت کی قسم کھائی تھی اور اسے تباہ کرنے میں تقریباً کامیاب ہو ہی گیا تھا۔"

فرائیڈ کی دلچسپی صرف ہنی بال تک ہی محدود نہ تھی بلکہ بقول ایرک فروم نپولین کا ایک یہودی جرنیل مسینا MESSENA بھی اس کی محبوب شخصیات میں سے تھا اس کے پاس کاٹھ کے سپاہی تھے جن کی پشت پر اس نے نپولین کے تمام نامور افسروں کے نام چپکا رکھے تھے گو پسندیدگی کا یہ دور بچپن تک ہی رہتا ہے لیکن اس سے اس کی طبیعت کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔

ارنسٹ جونز کے بموجب فرائیڈ نے ایک دفعہ حضرت موسیٰ اور بیسویں صدی پر لیونارڈو ڈاونسی کے ساتھ بھی اپنی تطبیق کی تھی — واضح رہے کہ فرائیڈ نے حضرت موسیٰ پر پہلے ایک مضمون لکھا اور بعد میں ایک کتاب لکھی اسی طرح — موخر الذکر پر بھی فرائیڈ نے ایک کتاب لکھی تھی جس کے بارے میں ارنسٹ جونز کا بیان ہے کہ لیونارڈو کی شخصیت کی عکاسی کے پردے میں دراصل فرائیڈ نے اپنے ہی بارے میں لکھا ہے۔

عظیم شخصیات سے تطبیق ایک اور انداز سے بھی ظاہر ہوتی ہے فرائیڈ اچھا بھلا ایک معقول سا مکان لے رہا تھا لیکن ایک وقتی جذبہ کے تحت اس نے ایک اور مکان لے لیا اور وی آنا کی تمام مدت بعد ازاں اسی مکان میں گزری یہ مکان دراصل اچھی خاصی تاریخی اہمیت رکھتا تھا کیونکہ اس میں ڈاکٹر وکٹر ایڈلر رہ چکا تھا۔ یہ آسٹریا کی SOCIAL DEMOCRATIC PARTY کا داعی تھا اور جنگ عظیم اوّل میں آسٹریا کی سیاست کا ایک اہم نام تھا یہ سیکرٹری آف سٹیٹ بھی رہا تھا۔ اس کے بیٹے نے آسٹریا کے وزیراعظم کاؤنٹ سٹورگھ (COUNT STURGKH) کو قتل کیا تھا اسے پھانسی کی سزا ملی تھی مگر بعد میں وہ عمر قید میں تبدیل کر دی گئی اور پھر اسے رہا کر دیا گیا — فرائیڈ کو اس مکان میں کوئی خاص رہائشی سہولتیں نہ تھیں مگر اس نے اسے کبھی نہ چھوڑا فرائیڈ کے مطالعہ کے کمرہ میں ہی اس بچے نے اپنے بچپن کے دن گزارے تھے، اور یوں فرائیڈ نے ہر قیمت خود کو تاریخ کی ایک اہم کڑی سے منسلک کیے رکھا۔ فوجی جرنیلوں اور خصوصاً ہنی بال سے اس کی دلچسپی — خاں، وہ دلچسپی نہیں وہ شے جس نے بچپن سے ہی عظیم جنگوں اور فوجی مہمات میں اپنے محبوب جرنیلوں کو زندہ دیکھا ہو تو تعجب ہے کہ اس نے اپنے لیے فوجی زندگی کو کیوں نہ پسند کیا۔

گو اس نے فوجی وردی زیبِ تن کر کے جنگیں نہ لڑیں لیکن پھر بھی اس کی تمام زندگی اچھی خاصی رزم گاہ بنی رہی۔ اس کے جنسی نظریات نے زمانہ بھر میں آگ لگا دی۔ تحلیل نفسی کو علمی دنیا نے یوں ہی نہیں تسلیم کر لیا تھا بلکہ اس کے پیچھے فرائیڈ کی ان تھک جد و جہد اور لازوال قوتِ مقاومت کارفرما تھی اور یوں فرائیڈ اپنے بعض نظریات کا علم بلند کیے تمام عمر کہنہ روایات اور فرسودہ اقدار کے خلاف معروفِ پیکار رہا۔

ساری دنیا نے اس کی مخالفت کی مگر یہ اپنے نظریات سے ذرا بھی نہ ہٹا شدید مخالفت کی بنا پر اس کے قریبی دوستوں نے اس سے استدعا کی یہ لفظ "جنسی" کی بجائے اس کا مترادف کوئی اور لفظ استعمال کر لیا کرے کیونکہ بعض ثقہ طبائع کے لیے یہ لفظ ناگوار تھا مگر فرائیڈ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کی وجہ جیسے جاہلانہ نہیں بلکہ اس لیے کہ فرائیڈ نے یہ نظریات سستی شہرت یا انوکھی بات کر کے دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے نہ پیش کیے تھے بلکہ ان کی تہہ میں فرائیڈ کا خلوص اور سچائی کی جستجو کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ فرائیڈ کے کردار کا یہ ایک اہم پہلو ہے جسے کسی صورت سے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس نے فرائیڈ میں ایک خاص قسم کا احساسِ فخر پیدا کر دیا۔ یہ فخر وہ اندھا فخر نہیں جو نفسی پندار سے جنم لیتا ہے بلکہ یہ وہ فخر ہے جو ہر اس انسان کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے جسے اپنے جذبہ کی سچائی اور خلوص کا اندازہ ہوتا ہے اور دنیا کی اکثر عظیم شخصیات اس احساسِ فخر کی حامل پائی گئی ہیں اسی لیے فرائیڈ کا صرف عقل اور استدلال پر ایمان تھا۔ اس نے کسی بات اور نظریہ کو محض کسی اور کی پسند کی بنا پر تسلیم نہیں کیا بلکہ دانش کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ہی اسے مانا! کیونکہ وہ ہر چیز کو عقل کے معیار پر پرکھتا تھا اس لیے اس میں وہ جرأت بھی پیدا ہو چکی تھی جس کے بل بوتے پر انسان زمانہ بھر سے جنگ آزما ہو جاتا ہے۔ یہ جرأت اس کے کردار کی ممتاز ترین خصوصیت ہے اور یہ اس جرأت کی وجہ ہی تو تھی کہ فرائیڈ نے اس پر تصنع یورپ میں جنس اور اس کے جبلّی تقاضوں کی اہمیت کو روشناس کرانے کا عزم کیا ورنہ کوئی اور ہوتا تو اپنے نظریات سے خود ہی خوف زدہ ہو جاتا — لیکن فرائیڈ نے کسی کی پرواہ نہ کی اور آخر زمانہ نے اس کے نظریات کی عظمت کو تسلیم کر لیا۔

نفسیاتی رجحانات

فرائیڈ جدید نفسیات کا امام ہے اور لفا ہر یہ کتنی عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ انسان جس نے ذہنی الجھنوں اور نفسیاتی بیماریوں کو سمجھنے اور ان کے علاج کے طریق کار میں ایک انقلاب برپا کر دیا وہ خود بھی عام انسانوں کی طرح بعض نفسیاتی الجھنوں کا شکار تھا لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وہ بھی تو ایک انسان ہی تھا۔

فرائیڈ ایک نارمل انسان تھا لیکن پھر بھی اس میں بعض نفسیاتی خوف ملتے تھے جن میں سفر کا خوف سب سے نمایاں ہے۔ اس کا آغاز فرائیڈ کی زندگی کے اولیں سفر سے ہوتا ہے وی آنا میں سکونت اختیار کرنے سے قبل کچھ عرصہ کے لیے اس کا باپ (LEIPSIG) کے قصبہ میں بھی رہا تھا۔ بعد میں فرائیڈ نے خود بھی اپنی تحلیل نفسی کی اور اسے دور کر دیا تجزیہ پر معلوم ہوا کہ سفر سے خوف کی وجہ گھر اور بالآخر اپنی ماں کی چھاتیاں، چھوڑنے کا خطرہ تھا۔ گو اس کا یہ نفسیاتی خوف ختم تو ہو گیا مگر پھر بھی اس کے اثرات بہت دور رس ثابت ہوئے اور اسے یہ احساس رہتا کہ کہیں اس سے گاڑی نہ چھوٹ جائے اور اس لیے وہ سٹیشن پر وقت سے بہت پہلے ہی آموجود ہوتا۔ گاڑی چھوٹ جانے کا یہ خوف بھی اس لاشعوری تمنا کا غماز تھا کہ گاڑی نکل جائے اور میں سفر سے بچ جاؤں۔ اس سے فرائیڈ کی اپنی ماں کے ساتھ شدید وابستگی بھی ظاہر ہوتی ہے کیونکہ وہ لوگ جو گھر اور خصوصاً اپنی ماں سے شدید وابستگی رکھتے ہوں تو ان کے لیے سفر ہمیشہ ایک تکلیف دہ کام ثابت ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی گھر کی طمانیت اور ماں کی آغوش کا سکون چھوڑنا ہوتا ہے۔

فرائیڈ کے ذہن پر موت کا خوف بھی ایک چمگادڑ کے سایہ کی مانند ہر وقت دہشت ناک انداز سے منڈلاتا رہتا تھا۔ بقول ارنسٹ جونز ایک طویل مدت سے اس کی یہ عادت چلی آ رہی تھی کہ کسی دوست سے رخصت کے وقت وہ یوں کہتا۔

"الوداع — ہو سکتا ہے تم مجھے دوبارہ کبھی نہ دیکھو" بعض دفعہ تو موت کا یہ خوف گویا ایک بخار کی صورت اختیار کر کے اس کے دل و دماغ اور اعصاب پر مسلط ہو جاتا اور مناسب وقفوں کے بعد موت کے خوف کے دورے اسے پڑتے رہتے تھے، گو عملی زندگی اور عام حالات میں اس کی جرأت ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کرنے والوں میں سے تھا لیکن موت کے خوف نے گویا اپنی مٹھی میں اس کے دل کو قابو کر رکھا تھا اور بعض اوقات تو اس خوف کا ردِ عمل اس شدید انداز سے ظاہر ہوتا کہ وہ خود ہی موت کی تمنا کرنے لگتا جب ۱۹۱۲ء میں وہ میونخ میں بے ہوش ہو گیا تو ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلے اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔

"موت کتنی شیریں چیز ہے!"

ژونگ نے اپنی "خود نوشت" سوانح عمری میں ایک اور واقعہ کا بھی تذکرہ کیا ہے ۱۹۰۹ء میں جب فرائیڈ اور ژونگ امریکہ کا دورہ کر رہے تھے۔ تو بریمن (BREMEN) میں رات کے کھانے پر موضوعِ بحث لاشیں تھیں فرائیڈ کے اعصاب لاشوں کا تذکرہ برداشت نہ کر سکے اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ ہوش میں آنے پر اس نے ژونگ پر الزام لگایا کہ وہ اس کی موت چاہتا ہے اس لیے وہ لاشوں کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ میونخ میں بے ہوشی کے موقعہ پر بھی موضوع موت ہی تھا کہ فرائیڈ — کئی آدمیوں کے مجمع میں — بے ہوش ہو گیا۔ ژونگ لکھتا ہے "میں اسے اٹھا کر دوسرے کمرے میں لایا اور ایک صوفہ پر لٹا دیا جب میں اسے لے جا رہا تھا تو اسے کچھ کچھ ہوش آ چکی تھی اور اس نے مجھے جس طرح دیکھا میں اسے کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ اس کمزوری کے عالم میں اس نے مجھے یوں دیکھا گویا میں اس کا باپ تھا اس کی بے ہوشی کی اور وجوہات بھی ہوں گی لیکن اتنا ہے کہ فضا پر تناؤ تھی اور دونوں صورتوں میں باپ کے قتل پر مبنی فانتزی مشترک تھی"

فرائیڈ کو اپنی بڑھتی عمر اور بڑھاپے سے سخت نفرت تھی پھر اسے ایک اور نفسیاتی خوف یہ تھا کہ کہیں وہ اپنی ماں کی زندگی ہی میں نہ مر جائے

فرائیڈ نے صرف دو جبلتوں جنس اور موت کے خوف — پر زور دیا ہے۔ گو اس نے موخر الذکر کو بالکل علمی انداز سے استدلال اور دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے لیکن پھر بھی یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ نظریہ پیش کر کے اس خوف کو گویا کسی جن کی مانند "بوتل" میں بند کر دیا، اور خود آزاد ہو گیا۔

ایرک فروم کا کہنا ہے کہ فرائیڈ میں عدم تحفظ کا احساس بہت قوی اور شدید تھا اور یہ بھی ایک لحاظ سے نفسیاتی خوف کی صورت اختیار کر چکا تھا اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں اس کے باپ کی غیر متوازن مالی حالت — یہودی ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ متعصبانہ سلوک اور عملی زندگی میں خود اس کا مالی مشکلات سے دوچار ہونا۔ بلکہ منگنی کے بعد جو چار سال تک شادی نہ ہو سکی تو اس کے بیٹے مارٹن کے بقول اس کی اہم ترین وجہ بھی غربت تھی کیونکہ دونوں گھرانے ۔۔ غریب تھے۔ فرائیڈ کے نلیس کو تحریر کردہ ایک خط (۲۱ دسمبر ۱۸۹۹ء) سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے۔

"میرا نفسیاتی خوف غربت تھی یا بالفاظ دیگر بھوک کا نفسیاتی خوف، جو میری بچپن کی پرخوری کی بنا پر ہے۔ ادھر بعد کے حالات بھی ایسے رہے کہ میری بیوی نے

کوئی تجہیز نہ لائی تھی، اور مجھے اس پر ناز ہے۔"

خارجی حالات میں غربت اور داخلی طور سے ماں سے وابستگی — یہ دو عوامل ایسے تھے کہ ان کے مجموعی اثرات نے فرائیڈ کی نفسیاتی ساخت میں بے حد اہم کردار ادا کیا۔ فرائیڈ نے خود کو جو "دو دھاری نشتر" بنایا تو وہ اس عدم تحفظ کے احساس کا ایک ردِ عمل تھا۔ اس سلسلہ میں ایرک فروم رقم طراز ہے، "کہ فرائیڈ کے کردار میں سچائی کی جستجو کا جو جذبہ تھا اس کی اساس، اس کے کردار کی بعض منفی خصوصیات پر استوار تھی مثلاً اس میں جذباتی گرم جوشی بالکل نہ تھی، وہ اپنے آپ میں گمن رہتا تھا، وہ محبت بھی نہ کر سکتا تھا اور ان سب پر مستزاد یہ کہ اس میں زندگی سے حظ اٹھانے کا جذبہ نہ تھا — اور یوں فرائیڈ نے مصافِ زیست میں "غیرت فولاد" پیدا کر کے عدم تحفظ کے احساس پر فتح یاب ہونے کی سعی کی، کیونکہ

"وہ ایک ایسا انسان تھا جو خود کو غیر محفوظ خیال کرتا تھا، اسے آسانی سے ہراساں کیا جا سکتا تھا، اسے لوگوں نے عقوبت پہنچائی تھی اور اس کے بالاتحقہ دغا کی گئی تھی اس لیے ظاہر ہے کہ اسے تحفظِ ذات کا سب سے زیادہ خیال رہتا ہوگا"

ڈبھم نے اس کے انداز میں "تلخی" کا ذکر کیا ہے وہ بھی اسی کا ردِ عمل تھا۔ گو فرائیڈ ایک مکمل مرد تھا اور بظاہر اس میں جسمانی لحاظ سے ایسی خصوصیات موجود نہ تھیں جو صنفِ مخالف سے وابستہ ہیں مگر پھر بھی ارنسٹ جونز کے بقول اس میں ذہنی لحاظ سے کچھ نسائیت پائی جاتی تھی۔ حلیفوں اور دوستوں سے تعلقات کی خرابی میں اس رجحان کا بھی ایک حد تک دخل تھا۔

فرائیڈ کی بہن کا کہنا ہے کہ یہ خون دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتا تھا — اس نے میڈیکل کو اپنایا اس کا مطلب یہ ہے کہ بعد میں اس نے اس خوف پر قابو پا لیا ہوگا۔

فرائیڈ کی شخصیت میں انا اور اس کا پیدا کردہ احساسِ برتری اہم حیثیت رکھتے ہیں وہ خود کو ایک عظیم شخصیت نہ سمجھتا ہو لیکن پھر بھی وہ اپنے اور دوسروں کے درمیان ایک حد رکھنے کی کوشش ضرور کرتا تھا۔ اس کا ژنگ کے تحریر کردہ ایک واقعہ سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب امریکہ میں دونوں نے ایک دوسرے کی تحلیلِ نفسی شروع کی، تو ژنگ نے فرائیڈ کے ایک خواب کے تجزیہ کے دوران اس سے اس کی نجی زندگی کے بارے میں کچھ تفصیلات دریافت کیں۔ "فرائیڈ کا ردِ عمل ایک عجیب سی نظر تھی۔ ایسی نظر جس میں شک و شبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔"

فرائیڈ کو دو چیزوں سے شدید نفرت تھی۔ ٹیلی فون اور موسیقی!

ٹیلی فون کے بارے میں اس کے بیٹے کا بیان ہے "میرے والد ٹیلی فون سے نفرت کرتے تھے اور جہاں تک بھی ممکن ہوتا وہ اس کے استعمال سے احتراز کرتے کیونکہ گھر کی تمام چیزوں کو ان کی خواہشات سے ہم آہنگ کیا جاتا تھا اس لیے ہم ہر ممکن اعتماد کرتے تھے کہ انہیں ٹیلی فون استعمال نہ کرنا پڑے"

ٹیلی فون سے نفرت کی وجہ کے بارے میں تو کچھ وثوق سے کہا نہیں جا سکتا، لیکن موسیقی سے نفرت کی جڑیں اس کے بچپن میں پیوست چلی گئی ہیں۔ اس کی بہن اینا کی پیدائش پر فرائیڈ تقریباً ۲/۱ ۲ برس کا تھا اور عام بچوں کی طرح جب اس نے اپنی ماں کی محبت میں ایک اور ہستی کو شریک دیکھا تو اس نے اینا سے حسد کا اظہار کیا (یہ حسد بچپن تک ہی محدود نہ رہا کیونکہ اس نے تمام عمر اس بہن کو ناپسند کیا)

اس کی بہن کو موسیقی سے دلچسپی ماں سے ورثہ میں ملی تھی۔ اینا پیانو پر موسیقی کی مشق کیا کرتی تھی جس پر فرائیڈ نے اپنی ماں سے کہا کہ یا تو پیانو یہاں سے اٹھوا دیا جائے ورنہ وہ گھر سے چلا جائے گا — فرائیڈ کی جیت ہوئی اور اس دن کے بعد ان کے گھر میں نہ کبھی پیانو بجا اور نہ ہی کسی اور صورت سے موسیقی کا کبھی تذکرہ آیا۔ حتیٰ کہ بچوں کی تعلیم سے بھی موسیقی کو یکسر خارج کر دیا گیا۔ حالانکہ اس دور کا ویانا رقص و موسیقی کا گہوارہ تھا۔

ہو سکتا ہے اس نفرت کا باعث اس کا بھائی الیگزنڈر بھی ہو کیونکہ اسے بھی موسیقی سے بہت شغف تھا اور وہ سیٹی میں اوپیرا کے تمام راگ راگنیوں کو بجا سکتا تھا۔ اور یہ ممکن ہے کہ فرائیڈ ان دونوں کو اپنی ماں کی محبت میں شریک سمجھ کر جس نفرت کا ان پر شعوری طور سے اظہار نہ کر سکتا ہو، اس نے اپنے اظہار کے لیے موسیقی کو چن لیا۔

جنسی زندگی (۱)!

فرائیڈ نے اپنی کتاب — INTERPRETATION OF DREAM میں اپنے بعض خوابوں کا اپنے نظریات کی روشنی میں تجزیہ کیا ہے اسی طرح اپنی بعض دیگر تصانیف اور خصوصاً خطوط میں بھی اس نے کہیں کہیں اپنے متعلق بعض نجی قسم کی باتیں بھی لکھ دی ہیں اس نے ذاتی تحلیلِ نفسی بھی کی تھی۔ ان سب کو جب مجموعی لحاظ سے دیکھا جائے تو فرائیڈ کی جنسی زندگی کو سمجھنا اور اس کی شخصیت کے ارتقا میں جنس نے جو حصہ لیا ہے اسے متعین کرنا اتنا دشوار نہیں رہ جاتا۔

فرائیڈ کی اپنی ہی اصطلاح کو استعمال کرتے ہوئے اس کی جنسی زندگی کا محور اگر اڈیپس الجھاؤ نہیں تو کم از کم اس کے تعین میں اس الجھاؤ کا ایک اہم کردار ضرور ہے — اور اس الجھاؤ کے ساتھ مادرانہ وابستگی تو ناگزیر ہے!

فرائیڈ اپنی ماں کا پہلا بچہ تھا اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اس کی ماں نے اس سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کی تھیں اس لیے وہ پلوٹھی کا ہونے کے علاوہ بھی اس سے دوسرے بچوں کی نسبت بہت زیادہ پیار کرتی تھی۔ جب یہ ۲/۱ ۲ برس کا تھا تو اس نے اپنی ماں کو عریاں حالت میں دیکھا اور فلیس کو (۱۸۹۷ء) تحریر کردہ ایک خط میں اس نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ "اس کا لبیڈو اس کی ماں کے لیے منتقل ہو گیا۔" اس خط میں ایک اور دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ اس میں فرائیڈ نے اپنی اس وقت کی عمر ۲/۱ ۲ برس بتائی ہے حالانکہ یہ واقعہ ویانا کے سفر کے دوران میں پیش آیا۔ اور اس وقت اس کی عمر چار برس تھی اس سے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ شاید دو مختلف واقعات اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو گئے۔

اس نے "تعبیرِ خواب" میں اپنے تیس خوابوں کا تجزیہ کیا ہے ان میں سے ۲ خواب اس کی ماں کے متعلق ہیں اور دونوں جنسی نوعیت کے ہیں، ان میں سے ایک خواب درج ذیل ہے اس وقت فرائیڈ کی عمر سات آٹھ سال کی تھی اور اتنی طویل مدت تک اس خواب کا یاد رہ جانا بھی اس کی اہمیت تسلیم کرانے کے لیے کافی ہے۔

"میں نے اپنی پیاری ماں کو اس حال میں دیکھا کہ اس کے نقوش پر عجیب و غریب سکون اور نیند کا تاثر ہے اسے دو (یا تین) لوگ اٹھا کر کمرے میں لا رہے تھے ان کی پرندوں ایسی چونچیں تھیں اور انہوں نے اسے بستر پر لٹا دیا۔"

فرائیڈ روتا اور چیختا ہوا بیدار ہوا تھا۔ بظاہر یہ خواب موت سے متعلق ہے لیکن فرائیڈ نے تجزیہ پر بتایا کہ جرمن زبان میں مجامعت کے لیے ایک گھٹیا قسم کا لفظ VOEGELN بھی ہے اور جرمن میں پرندہ کو VOGEL کہتے ہیں اب "پرندوں کی چونچوں" والے لوگوں کا مطلب سمجھنا دشوار نہیں۔ فرائیڈ کی جنسی خواہشات نے اظہار کے لیے یہ روپ دھارا تھا۔ ارنسٹ جونز کے بقول اس نے اپنی ماں کی عصمت دری کی لاشعوری فانتزی سے بھی کام لیا ہوگا۔

اس کی زندگی کے اور بھی کئی واقعات مل جاتے ہیں جن سے اس کی مادرانہ وابستگی آشکار ہوتی ہے۔

ظاہر ہے جو بچہ اپنی ماں سے اتنی شدید وابستگی رکھتا ہے اس کا اپنے باپ سے حسد (لاشعوری یا شعوری) ناگزیر ہے۔ چنانچہ فرائڈ کی ہیجانی زندگی کی تشکیل میں اس کے باپ سے حسد کے جذبات کو بہت زیادہ دخل ہے اس سے پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ اس کے باپ کی پہلی بیوی کے بچوں کی وجہ سے کنبہ کے افراد میں۔ عموں کے تفاوت نے رشتوں میں جو بظاہر مضحکہ خیزی پیدا کر دی تھی وہ ننھے فرائڈ کے ذہن کے لیے ناقابلِ فہم تھی اس لیے یوں بھی اس نے اپنے باپ کو "باپ" تسلیم نہ کیا تھا، اس کی دانست میں اس کا سوتیلا بھائی عمانوئیل اس کی ماں کے جوڑ کا تھا۔

فرائڈ خود طفل کا تھا جب وہ جنسی تجسس کی بناء پر اپنے والدین کی خوابگاہ میں جا گھسا — اور سات برس کی عمر میں اس نے ان کی خواب گاہ میں پیشاب کر دیا۔ پیشاب کرنے کا مطلب بالکل واضح ہے اس سے جنسی فعل کی ادائیگی کی "مقدس" جگہ کو ناپاک کرکے اپنے معاندانہ جذبات کے اظہار کے علاوہ اپنے باپ (اور ساتھ ہی ماں) کو یہ احساس کرانا بھی مقصود تھا کہ میرا بھی اپنے باپ ایسا عضو ہے — جو طاقت اور قوت کا سرچشمہ ہے! ویسے بھی فرائڈ راتوں کو پیشاب کرکے بستر خراب کرنے کا عادی تھا، جب اس کے باپ نے اسے ڈرانا، تو اس نے جواب دیا:

"پاپا"! آپ بالکل فکر نہ کریں میں آپ کو ایک نیا اور خوب صورت سرخ پلنگ خرید دوں گا۔" اس طرح ایک مرتبہ اس نے گندے ہاتھوں سے جب ایک کرسی خراب کر دی تو اس نے اپنی ماں کو یوں تسلی دی کہ وہ بے فکر رہے۔ جب وہ بڑا ہو کر ایک بڑا آدمی بنے گا تو وہ اسے ایک نئی کرسی خرید دے گا۔ یہ دونوں واقعات ایک ہی رجحان کے غماز ہیں۔

جب فرائڈ نے کمرہ میں پیشاب کیا تو اس کے باپ نے کہا تھا:

"یہ لڑکا کسی قابل بھی نہ ہوگا۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے فرائڈ کی انا کو ٹھیس پہنچی کیونکہ "تعبیر خواب" میں اس نے خود بھی اس واقعہ کے متعلق یوں لکھا ہے:

"یہ میری اولوالعزمی کے لیے ایک زبردست دھچکا ہوگا کیونکہ میرے خوابوں میں اسی واقعہ اور اس کے ساتھ ہی میری کامیابیوں اور کارناموں کے بارے ... حوالے ملتے ہیں گویا میں یہ کہتا ہوں، تم نے دیکھا: میں واقعی کچھ بن گیا ہوں۔"

اسی طرح ایک مرتبہ فرائڈ کے باپ نے اسے ایک واقعہ سنایا کہ کس طرح ایک سپاہی نے اس کی نئی سموری ٹوپی گرا کر اس سے کہا "اے یہودی! رستہ چھوڑ کر چلو" اور جب فرائڈ کے باپ نے اسے بتایا کہ بجائے سپاہی سے جھگڑنے کے اس نے ٹوپی اٹھائی اور خاموشی سے چل دیا تو فرائڈ کو خاموشی سے یوں بے عزتی گوارا کر لینا بہت برا لگا۔

باپ سے حسد اور ناپسندیدگی کے یہ جذبات لاشعوری بھی رہے لیکن اس ... فرائڈ ... بے حد متاثر ہوا ... بعض نقادوں کا تو یہ کہنا ہے کہ فرائڈ کے تمام نظریات ... معصومیت سے ... ایڈی پس الجھن کا نظریہ تو اس کے اپنے ہی ذہن کی بازگشت ہے۔ ویسے فرائڈ کے اپنے باپ سے تعلقات بڑے اچھے تھے اور اس کی وفات پر انہوں نے اپنے دوست فلیس کو جو خط لکھا ہے اس کے ایک ایک لفظ محبت کا اظہار ہوتا ہے یہ بات بھی خالی از دلچسپی نہیں کہ اس کی موت سے ہی اسے "تعبیر خواب" لکھنے کا خیال آیا تھا۔

فرائڈ نے ۱۸۹۷ء میں جو ذاتی تجزیہ کیا تھا اس لیے اس سے ابتدائی جنسی زندگی پر بڑی اچھی طرح سے روشنی پڑتی ہے۔ اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی کے کوائف چھپانے کی ہر ممکن سعی کرتا تھا لیکن پھر بھی اس نے اپنے، اور علمی دنیا کے فائدہ کے لیے اپنے لاشعور میں دبی خواہشات اور بچپن کی خفتہ یادوں کو بیدار کرکے اپنے ماضی کے اس حصہ کے نقوش واضح کر دیئے جو دوسروں کی نظروں سے کیا خود اپنی بھی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ جب سوا سال کا تھا تو اپنے بھائی کی پیدائش پر اسے سخت کوفت ہوئی اور وہ اس کے مرنے کی "دعائیں" مانگا کرتا اور جب وہ واقعی مرگیا تو اس "ندو پشیمان" پر پشیمانی کا اثر تمام عمر رہا۔

فرائڈ نے اپنی بھتیجی پاؤلین (Pauline) کی — اپنے بھتیجے جان کی معیت میں — عصمت دری کے بارہ میں لاشعوری فانتزی کا بھی ذکر کیا ہے۔

جنسی زندگی (۲)

جہاں تک فرائڈ کی جنسی زندگی کا تعلق ہے تو اس کی تحریروں اور جنسی نظریات کی بناء پر قاری کے ذہن میں فرائڈ کی جو تصویر ابھرتی ہے یہ درحقیقت اس سے بہت مختلف ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ اس میں زمین اور آسمان کا فرق ہے اس کی دو وجوہات ہیں۔ اوّل تو یہ ہے کہ مجموعی لحاظ سے فرائڈ عورتوں کے بارے میں کوئی بلند رائے نہ رکھتا تھا بلکہ فرائڈ کی صاف گوئی کی داد دینی پڑتی ہے کہ ایک مرتبہ میری بونا پارٹ سے گفتگو کے دوران میں اس نے یہ تسلیم کیا:

"وہ ازلی سوال جس کا آج تک جواب نہ دیا جا سکا اور نسوانی پہلوؤں سے وابستہ اپنی تیس سالہ تحقیق کے باوجود جس سوال کا میں بھی جواب نہ تلاش کر سکا وہ یہ ہے کہ ایک عورت کیا چاہتی ہے؟"

فرائڈ کے عورتوں کے بارے میں خیالات آج کی عام پاکستانی اکثریت سے مشابہ ملتے ہیں اس کے نزدیک ایک عورت کو مرد کی ذہنی زندگی، معاش، مساوات اور آزادی سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئیے، وہ تو بس گھر کی زینت ہو اور اس کا کام دن بھر کے تھکے ماندے مرد کے مضمحل اعصاب کو سکون پہنچانا ہے۔ اس کے خیال میں مرد افضل ہے اور عورت اس کی تابع ہے اور اسی پر گھر کے سکون اور معاشرہ کی بہبود کا انحصار ہے۔

جے ایس مل نے ایک مضمون میں عورتوں کی آزادی کی حمایت کی تو فرائڈ نے اس پر کڑی تنقید کرتے ہوئے اسے "لغو" اور "غیر انسانی" قرار دیا۔

اس نے مارتھا کے ایک خط میں لکھا:

"یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ہم مل کر ایک انسان نہیں پلتے۔ جدوجہد زیست میں عورتوں کو بھی مردوں کی مانند جھونک دینا ایک ایسا نظریہ ہے جس کا سکہ نہ چل سکے گا میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ ہم قانون اور تعلیم کو خواہ کتنی ہی اصلاح یافتہ کیوں نہ بنا دیں لیکن وہ سب کچھ اس حقیقت کے سامنے باطل ثابت ہوگا۔ کہ جہاں ایک مرد معاشرہ میں اپنی حیثیت منوانے کے لیے طویل جدوجہد کرتا ہے، تو وہاں قدرت نے اس مقصد کے لیے عورت کو حسن، دل ربائی اور خوش ادائی عطا کی ہے جہاں تک ان کے تلف شدہ حقوق کا تعلق ہے تو قانون اور رسم و رواج کو ابھی انہیں بہت کچھ دینا ہے لیکن اس سے عورت کی حیثیت پھر بھی غیر تغیر پذیر رہے گی۔ جوانی میں محبوبہ دلنواز اور پختہ عمر میں ایک پیاری بیوی!" ان خیالات کے ساتھ ساتھ فرائڈ کی جنسی زندگی بہت باضابطہ اور بے حد خشک تھی لیکن بہتر ہے کہ اس سے پہلے فرائڈ کی عاشقانہ زندگی پر روشنی ڈال دی جائے

فرائڈ نے تمام عمر میں ایک ہی لڑکی سے صحیح محبت کی اور وہ تھی اس کی بیوی، لیکن اس سے قبل بھی ایک "ناکام" محبت کا ذکر ملتا ہے۔ فرائڈ کی عمر اس وقت ۱۶ سال تھی

جب یہ اپنی جنم بھومی گیا۔ ان کا کنبہ اس کے باپ کے دوست کے گھر ٹھہرا۔ وہاں فرائڈ نے جب انیس سالہ گیسلا (Gisela) کو دیکھا تو پہلی نگاہ میں ہی اسے دل دے بیٹھا۔ وہ صاحب خانہ کی بیٹی تھی فرائڈ بے حد شرمیلا اور ڈرپوک ثابت ہوا۔ چنانچہ یہ اولیں الفت تنہائی میں ٹھنڈی آہیں بھرنے اور اس کے تصور سے باتیں کرنے پر ختم ہو گئی کیونکہ چند دنوں کے بعد یہ لوگ واپس آ گئے — اور بظاہر یہ قصہ ختم ہو گیا

۲۰ اپریل ۱۸۸۲ء کی ایک خوشگوار شام تھی جب مارتھا اور اس کی بہن ان کے گھر آئی ہوئی تھی۔ فرائڈ کا دستور تھا کہ گھر آتے ہی سیدھا اپنے کمرہ کا رخ کرتا۔ مگر مارتھا کے چہرہ میں اسے ایک ایسی جاذبیت نظر آئی کہ وہ ان کے پاس آ بیٹھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ یوں کسی لڑکی کے پاس آ کر بیٹھا ہو۔ اس کے بعد کی ملاقاتوں میں کیونکہ فرائڈ کو اپنے جذبات کا صحیح طور سے اندازہ نہ ہو سکا تھا اس لیے اس کا طرز عمل بعض اوقات عجیب و غریب اور متضاد قسم کا ہوتا تھا لیکن جوں ہی اسے اپنے جذبات کی گہرائی کا اندازہ ہو گیا تو اس نے مارتھا کو گلاب کے پھول بھیجنے شروع کئے جن کے ساتھ کارڈ پر مناسب اور موزوں الفاظ میں تعریفی جملے لکھے ہوتے تھے۔

تقریباً ایک ماہ بعد انہیں بازو میں بازو ڈال کر پہلی مرتبہ کھل کر بات کرنے کا موقع ملا

جہاں تک ظاہری حسن اور جنسی کشش کا تعلق ہے تو مارتھا میں کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی اس کا قد قدرے چھوٹا تھا۔ رنگت زرد تھی لیکن اس پتلی دبلی اور کامنی سی مارتھا میں بعض ایسی دل موہ لینے والی ادائیں تھیں کہ اکثر نوجوان اس کے طلب گاروں میں سے تھے لیکن فرائڈ کے ذہن میں اپنی محبوبہ کی خصوصیات کے ضمن میں جسمانی کشش کو اتنی اہمیت نہ تھی۔ اس نے ایک خط میں اسے لکھا:

"اگر ایک مجسمہ ساز یا مصور کی آنکھ کا تعلق ہے تو تم خوب صورت نہیں ہو بلکہ اگر تم الفاظ کے صحیح اور لغوی معنوں کے استعمال پر زور دو تو مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ تم واقعی خوب صورت نہیں ہو — جہاں تک ظاہری حسن کا تعلق ہے تو میں خود بھی اس کے بارے میں کچھ بے حس سا ہوں" اس کے بعد ایک اور خط میں اس نے یوں لکھا:

"اس حقیقت کو کبھی نہ بھولو کہ حسن تو صرف چار دن کی چاندنی ہے اور ہم نے ایک طویل عمر اکٹھی گزارنی ہے۔ جب چند سالوں کے بعد شباب کی تازگی اور چمک ماند پڑ جاتی ہے تو پھر حسن دل کی اچھائی اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں رہ جاتا ہے اور اسی میں تم بازی لے جاتی ہو"

خیر — تو کہنے کا یہ مطلب ہے کہ فرائڈ نے اپنی محبوبہ کو ایک پیکر خوبی و رعنائی کی صورت میں نہیں دیکھا تھا بلکہ اس کے دل و دماغ کو سمجھ کر اس کی خوبیوں سے پیار کیا — ویسے بھی بقول فرائڈ اس کی ٹھوڑی اور ہونٹوں کی ساخت میں مردانہ پن پایا جاتا تھا۔

دو ماہ کی ملاقاتوں نے دونوں کے دلوں میں محبت کی آگ بھڑکا دی ۱۵ جون ۱۸۸۲ء کو فرائڈ نے اسے پہلا محبت نامہ بھیجا۔ یہ تمام خط جرمنی میں تھا صرف سرنامہ انگریزی میں تھا۔

"My sweet darling girl!"

گو ان کی منگنی جلد ہی ہو گئی لیکن شادی ہوتے ہوتے پانچ سال لگ گئے۔ ان میں سے تقریباً تین سال جدائی کے تھے۔ اس دوران میں یہ دونوں ایک دوسرے کو تقریباً ہر روز کم از کم ایک خط لکھتے تھے۔ دونوں کے باہمی خطوط کی تعداد ۱۵ سو کے قریب بنتی ہے جن میں سے ۹ سو سے زائد فرائڈ کے تحریر کردہ تھے۔ یہ خطوط مختصر نہیں بلکہ چھوٹے سے چھوٹا خط بھی ۴ صفحات سے کم کا نہیں بنتا۔ خطوط کی اوسط لمبائی دس، بارہ صفحے بنتی ہے اور ایک خط تو بائیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے

جہاں تک ان خطوط کا تعلق ہے ان کے مطالعہ سے صرف فرائڈ کی اتھاہ محبت ہی پر روشنی نہیں پڑتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کی تمام شخصیت جیسے بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ ان طویل خطوط میں اس نے زندگی کے اکثر مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے، اس کی شدید جذباتیت کا اندازہ اس خط سے لگایا جا سکتا ہے:

"اب مجھے احساس ہو چکا ہے کہ تم مجھے کتنی پیاری ہو، میری تو اب صرف ایک ہی تمنا ہے کہ میں ایک مرتبہ اور تمہارا بوسہ لوں اور پھر تمہارے ساتھ ہی مر جاؤں ہم نے اتنی مدت جس بے تکلفانہ قربت میں گزاری ہے اس کے بعد تو ایک دن کے لیے بھی تم سے جدا رہنا میرے لیے خوف ناک ہے"

مارتھا سے محبت کا اندازہ ایک اور واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے ۱۸۸۴ء میں یہ کوکین کے ذریعہ سے تجزیہ جسم سن کر دینے کے تجربات کر رہا تھا۔ ۲ سال کی جدائی کے بعد مارتھا سے ملاقات کا موقع ملا اور فرائڈ اپنے تمام تجربات کو درمیان ہی میں چھوڑ کر چلا گیا۔ اتفاق سے کولر KOLLER بھی یہی تجربات کر رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے کوکین کے ذریعہ سے جسم کو سن کر دینے کا طریقہ معلوم کر لیا۔ فرائڈ نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں خود ہی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

جب ہم ان دونوں کی طبائع کے تضاد اور باہمی اختلافات کا اندازہ لگاتے ہیں تو ان کی محبت کی شدت اور ان کی کامیاب ترین ازدواجی زندگی پر بے اختیار کلمہ تحسین نکل جاتا ہے۔

فرائڈ کی محبت کا سب سے نمایاں پہلو اس کا جذبہ رقابت اور شکوک ہیں گو مارتھا بے حد حسین نہ تھی لیکن پھر بھی بہت سے نوجوان اس کے طلب گاروں میں سے تھے۔ فرائڈ سے پہلے اس کی ایک امیر آدمی سے (جو عمر میں اس سے کہیں بڑا تھا) منگنی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ فرائڈ کی مالی حالت بھی دگرگوں تھی — اسے ان سب باتوں کا تو احساس تھا ہی لیکن اس پر مستزاد یہ اندیشہ تھا جو ہر وقت اس کے ذہن میں جیسے ڈنگ مارتا رہتا کہ کیا وہ واقعی اس سے ایسی ہی شدید محبت کر رہی ہے یا یہ محض اس کی خام خیالی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس پر کچھ عرصہ کے بعد حسد اور شکوک و شبہات کا جیسے دورہ سا پڑ جاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ہر مرتبہ مارتھا کو کسی نئے ہی طریقے سے اسے اپنی بے پایاں محبت کا یقین دلانا پڑتا لیکن مارتھا کی حالت اس سے بالکل برعکس تھی، اسے اپنی محبت کی پختگی کا ہی احساس نہ تھا، بلکہ فرائڈ کی محبت کا بھی یقین تھا۔

مجموعی لحاظ سے مارتھا کی طبیعت میں نرمی، حلیمی اور کردار کی بلندی کے ساتھ ساتھ بعض معاملات میں فولاد ایسی غیر لچکیلی فطرت کا عنصر بھی موجود تھا۔ ادھر فرائڈ اسے پورے طور سے اپنے رنگ میں رنگ لینا چاہتا تھا ویسے بھی فرائڈ کی شخصیت سے وہ بے حد متاثر تھی اور اس کی ماں کی طرح اسے بھی یقین تھا کہ وہ ایک عظیم انسان بنے گا — چنانچہ اکثر معاملات میں وہ اس کی پسند کے سانچے میں خود کو ڈھالتی چلی گئی۔

جہاں تک چھوٹی چھوٹی باتوں کا تعلق تھا تو ان کے بارے میں کوئی خاص فرق نہ پڑا مثلاً ایک مرتبہ سردیوں میں مارتھا نے اس سے سکیٹنگ کے لیے اجازت طلب کی، (اس زمانہ میں عورتوں کے لیے اسے — معیوب خیال کیا جاتا تھا) فرائڈ نے سختی سے منع کر دیا، اس لیے نہیں کہ اسے مارتھا کے چوٹ لگنے کا خطرہ تھا بلکہ اس لیے کہ سکیٹنگ کے دوران اسے کسی دوسرے مرد کے بازوؤں میں بازو ڈالنے پڑیں گے۔ گو بعد میں فرائڈ

نے اسے اجازت دے دی لیکن اس شرط پر کہ وہ تنہا سکیٹنگ کرے گی۔

اس طرح فرائیڈ کو فلسفہ نفسیات اور انگریزی ادب سے جو دلچسپی تھی مارتھا کا ذہن اس تک نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس کی ادبی دلچسپی ناولوں اور شاعری تک تھی بلکہ مارتھا نے (اور صرف ایک مرتبہ فرائیڈ نے بھی) منظوم محبت نامے بھی لکھے تھے۔

بعض اختلافات کی وجہ سے فرائیڈ کو پہلے مارتھا کی ماں اور اس کے بھائی سے سخت نفرت ہو گئی۔ اور اس نے مارتھا سے مطالبہ کیا کہ وہ ان سب سے قطع تعلق کر لے۔ اور یہ ایسے مواقع تھے جہاں مارتھا صبر اور سکون گر مستقل مزاجی سے کام لے کر اس کے غصہ کو ٹھنڈا کیا کرتی تھی۔

۱۳ ستمبر ۱۸۸۶ء کو ان کی شادی ہو گئی!

اتنی پرجوش اور سرگرم محبت کے بعد جو شادی ہوئی گو وہ ایک کامیاب ترین شادی ثابت ہوئی لیکن ایسے معلوم ہوتا ہے کہ فرائیڈ کو "فتح" حاصل کرنے سے زیادہ دلچسپی تھی کیونکہ شادی کے بعد اس نے تمام امور خانہ داری سے ہی خود کو علیحدہ نہیں کیا بلکہ اس کی بیوی اس کے لیے محض ایک "بیوی" بن کر رہ گئی۔ ایسی بیوی جو اس کے بچوں کی پرورش کرے، جو اس کے گھر کی نگہداشت کرے، جو اس کی جسمانی آسودگی کا ذریعہ ہو۔ اور بس! بقول ہیلن واکر، "اسے ایک ایسی عورت کی ضرورت تھی جو اس کی ماں کا نعم البدل ثابت ہو سکے — اور مارتھا اس لحاظ سے مکمل ترین عورت ثابت ہوئی"

فرائیڈ کا کردار بہ حیثیت ایک شوہر کے بالکل بے داغ ہے لیکن جہاں تک اس کی ذہنی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا تعلق ہے تو فرائیڈ نے اپنے گرد ایک "مقدس دائرہ" کھینچ رکھا تھا جس کے اندر اس کی بیوی قدم نہ رکھ سکتی تھی بعض شادی شدہ جوڑوں میں جو ایک احساس یگانگت پایا جاتا ہے اور دونوں میاں بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ دوست اور ہم جلیس بھی ہوتے ہیں — فرائیڈ اور مارتھا کے تعلقات میں یہ بات نہ تھی وہ جب تین ماہ کی سیاحت کے لیے باہر جاتا تو اس کی بیوی کبھی بھی اس کے ساتھ نہ ہوتی فرائیڈ کی اپنی سالی مینا سے اس معاملہ میں زیادہ بنتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ نہ صرف شام کو تاش بھی کھیلتا تھا بلکہ سیر و تفریح کے لیے وی آنا سے باہر بھی اس کے ساتھ چلا جاتا۔ فرائیڈ نے بعض خطوط میں بڑے سوگوارانہ انداز سے اپنی بے کیف اور خشک زندگی کا تذکرہ کیا ہے اور ایسے خطوط میں اس نے کبھی بھی یہ نہیں لکھا کہ اس کی بیوی کی ذات بھی اس کے لیے حصول مسرت کا ذریعہ ہے۔

فرائیڈ نے "تعبیر خواب" میں مارتھا کے متعلق اپنے خواب بیان کر کے ان کے تجزیہ سے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ فرائیڈ کو اس کے ساتھ کسی قسم کی دلچسپی ہی نہیں بلکہ ایک حد تک وہ اسے ناپسند بھی کرتا ہے اس ضمن میں ہیلن رقم طراز ہے:

"فرائیڈ نے اس عورت کی۔ جس نے نصف صدی سے زائد عرصہ تک اس کی بے لوث خدمت کی — اس انداز کی تصویر کشی کی ہے۔ مارتھا زرد رو تھی؟ اس کے دانت نقلی تھے اور وہ جلد ہانپ جاتی تھی، وہ نہ صرف بیمار ہی تھی بلکہ شرمیلی اور بدمزاج بھی تھی — جس کی سب سے نمایاں خامی اس کی اطاعت شعاری تھی لیکن وہ پھر بھی پوری اطاعت شعار نہ تھی، جہاں تک ازدواجی تعلقات کا ذکر ہے تو یقینی طور سے یہ ایک لاثانی تصور ہے اس کے خوابوں کے جہان میں مارتھا کے لیے ایک بھی خوبی اور وصف نہیں ملتا"

ہیلن کے اس بیان کی توثیق اس امر سے ہو جاتی ہے کہ فرائیڈ نے اپنے بعد اپنے بچوں کی سرپرستی اور نگہداشت کے لیے اپنی بیوی کی بجائے اپنی سالی مینا اور اپنے دوست ادونوٹو پیا

جہاں تک فرائیڈ کی جنسی قوت کا تعلق ہے تو بظاہر یہ بات عجیب ہی کیوں نہ معلوم ہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ عام مردوں کے مقابلہ میں وہ جنسی لحاظ سے جلد ہی سرد ہو گیا۔ فرائیڈ نے ۴۱ سال کی عمر میں فلیس کو ایک خط میں یہ بھی لکھا ہے:

"مجھ جیسے آدمی کے لیے اب تو جنسی اشتعال بھی کسی مصرف کا نہیں ہے"

اسی عمر ہی کے دوران اس نے ایک نوجوان عورت کے لیے جسمانی کشش محسوس کرتے ہوئے اسے غیر ارادی طور سے "تھوڑا سا چھوا"۔ "تعبیر خواب" میں اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ وہ اس بات پر حیران رہ گیا کہ "ابھی تک" اس میں اس قسم کی جنسی کشش کا امکان باقی رہ گیا ہے اور ۵۶ سال کی عمر میں اس نے ایل۔ بن سوانگر (L. BINSWANGER) کو جو خط لکھا ہے۔ اس سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ اب جنسی قوت کے لحاظ سے وہ بالکل ختم ہو چکا تھا

فرائیڈ کے جنسی نظریات سے قطع نظر اس کی جنسی زندگی اور جنسی کردار کے لیے اکثر لوگوں نے پیورٹن کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ گو لوگوں نے اس کے نظریات سے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ وہ جنسی آزادی اور شہوانی بے لگامی کا حامی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے نزدیک اپنی ہیجانی اور شہوانی تحریکات کو دبانا ہی ایک متمدن فرد کا فرض ہے۔ اس دباؤ کے طفیل وہ ایک متمدن زندگی گزارنے کے قابل ہو گا۔ "یہ تو صرف متمدن لوگ ہی ہیں جو ایسی قربانی کے قابل ہوتے ہیں" اسی طرح فرائیڈ کو اکثر لوگوں کی مانند جنسی لطائف اور شہوانی حکایات بیان کر کے جنسی تسکین کا پہلو نکالنے کا بھی شوق نہ تھا۔ اس کے نزدیک جنس کا ذکر علمی انداز کے علاوہ کسی اور طریقہ سے یا کسی اور مقصد کے لیے ناپسندیدہ تھا۔

اس معاملہ میں فرائیڈ کے ساتھ ساتھ ہیولاک ایلس (HAVELOCK ELLIS) کا نام بھی ذہن میں آ جاتا ہے۔ دونوں ہی جنس پر عظیم ترین محققین میں سے ہیں، مگر دونوں کی جنسی زندگی بڑی سیدھی سادی اور شہوانی سرگرمیوں سے مبرا رہی یا شاید یہ ان کے نسبتاً "ٹھنڈا" ہونے ہی کی وجہ ہو کہ یہ لوگ اس "گرم" موضوع پر لازوال اہمیت کا کام کرنے کے قابل ہو سکے کیونکہ عام لوگوں کے لیے تو جنس کا موضوع ہی بارود کے مترادف ہے۔ ذرا دیا سلائی دکھائی اور ان لوگوں کا جذباتی سکون بھک سے اڑ گیا۔ اس لیے ہر انسان جنس پر محققانہ انداز سے نہ تو لکھ سکتا ہے اور نہ ہی ہر انسان فرائیڈ بن سکتا ہے — وہ جذبہ جو دوسروں کے لیے زندگی کی سب سے بڑی کمزوری ثابت ہوتا ہے اس کے لیے دماغی قوت کا سب سے بڑا سرچشمہ ثابت ہوا۔ اور اسی میں فرائیڈ کی عظمت کا راز مضمر ہے۔

"نظریات"

"مجھ ایسے شخص کے لیے کسی شغل کے بغیر زندگی گزارنا ناممکن ہے۔ ایک ایسا جذبہ جو روح کو گھلا کر رکھ دے — جو شلر کے الفاظ میں ایک قاہر اور جابر ہو۔ میں نے اپنے جابر کو ڈھونڈ لیا ہے اور اس کی خدمت گزاری میں میں نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میرا جابر ہے — نفسیات! جو ہمیشہ سے میری منزل مقصود رہی ہے"

(فرائیڈ: بنام ول ہیلم، نوشتہ ۲۵ مئی ۱۸۹۵ء) فرائیڈ نے نفسیات کے لیے اپنی محبت کے جس جذبہ کو قاہر اور جابر سے تعبیر کیا ہے وہ محض ایک عام قسم کی محبت نہ تھی، بلکہ فرائیڈ نے تمام عمر دے کر اس مضمون کو جن نظریات سے روشناس کرایا انہوں نے نفسیات کو نہ صرف ایک باقاعدہ سائنس بنا دیا۔ بلکہ آج جو نفسیات زندگی کے ہر شعبہ میں دخیل ہے تو یہ محض فرائیڈ کی ان تھک محنت

کا نتیجہ ہے۔ آج نفسیات چند ذہنی مباحث تک محدود نہیں رہی بلکہ کسی مخصوص پیشہ کے لیے افراد کے انتخاب سے لے کر پیچیدہ ذہنی امراض کے علاج تک ہماری زندگی کا ایک ایک گوشہ اس سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔

فرائیڈ ان چند محدود مفکرین میں سے ہے جو اپنی جدت طبع اور ذاتی لیاقت سے کام لیتے ہوئے کسی مضمون کے لیے نئی راہیں تراشتے ہیں۔ گو ایک وقت تھا کہ اس کی کتابوں کا ایک ایک ایڈیشن بھی کئی کئی سال تک نہ بکتا تھا "تعبیر خواب" ایک ہزار کی تعداد میں چھاپی گئی تھی مگر ۸ سال میں یہ پہلا ایڈیشن ختم ہوا لیکن آج فرائیڈ اور اس کے نظریات کی تشریح و تعبیر اور تردید پر لاتعداد کتب زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ اس کی مقبولیت کا آغاز اس کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا۔ چنانچہ (INDEX PSYCHOANALYTICUS) میں ۱۸۹۳ء سے لے کر ۱۹۲۶ء تک ایک ہزار اندراجات ملتے ہیں اور اس وقت سے آج تک کا اندازہ لگانا کچھ ایسا مشکل نہیں ہے۔

اس مختصر کتاب میں فرائیڈ کے نظریات پر مفصل روشنی نہیں ڈالی جا سکتی لیکن پھر بھی کوشش کی جائے گی کہ اس کی تعلیمات کا ایک مجمل سا خاکہ پیش کر دیا جائے۔

اس کی تعلیمات کا مرکزی نقطہ تحلیل نفسی ہے اور باقی نظریات مثلاً ایڈی پس الجھاؤ، لاشعور کی تشریح، خوابوں کی تعبیر، طفلانہ جنسیت وغیرہ اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، کیونکہ زیادہ تفصیلات کی گنجائش نہیں۔ اسی لیے اس کے مختلف نظریات کا جداگانہ طور سے جائزہ لیا جائے گا اس سے ان لوگوں کو زیادہ سہولت رہے گی جو اس سے پہلے فرائیڈ کے نظریات کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں۔

۱۔ شعور و لاشعور کی کش مکش

جہاں تک لاشعور کا ایک نفسیاتی اصطلاح کی حیثیت سے تعلق ہے تو نہ تو فرائیڈ نے اسے وضع کیا اور نہ ہی یہ اس کی دریافت ہے، بلکہ بقول تھیمل واکر — ہربرٹ اور ایڈورڈ وان ہرٹ مین (EDWARD-VAN HARTMANN) اس مسئلہ پر فرائیڈ سے پہلے روشنی ڈال چکے تھے۔

فرائیڈ نے سب سے پہلے لاشعور کے دیگر اعمال ذہنی کے ساتھ الجھے ہوئے رشتہ کو نہ صرف اجاگر کیا بلکہ اس نے لاشعوری محرکات کے شعور کی دنیا پر گہرے اثرات کو واضح کرتے ہوئے ان سے پیدا شدہ ذہنی الجھنوں کا حل تلاش کر کے نفسیات کو ایک نئے انقلاب سے روشناس کرایا۔

لاشعور کی پیچیدہ نوعیت کی تشریح سے پہلے بعض بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

شعور

آپ یہ کتاب پڑھ رہے ہیں۔ آپ کے قریب ہی ریڈیو پر گانے لگے ہیں، سامنے کھڑکی کا پردہ تیز ہوا سے سرسرا رہا ہے، کمرہ میں آپ کے بچے کھیل رہے ہیں — یہ سب کچھ آپ کا شعور ہے کیونکہ بغیر کسی کاوش اور سعی کے آپ ان کی موجودگی کو جانتے ہیں۔ شعور ایک رواں دواں ندی کی مانند ہے۔ یہ ہر لمحہ اور ہر پل تغیر پذیر ہے۔ نت نئے خیالات و تصورات احاطۂ شعور میں آتے رہتے ہیں۔ "شعور کی رو" کی اصطلاح اس کی سیال حالت کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ افسانوی ادب میں جو جدید ترین تجربات کیے گئے ہیں وہ سبھی شعور کی رو کے نفسیاتی اصول کے تحت کیے گئے ہیں۔

قبل شعور

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آپ کسی دیکھی ہوئی فلم کے نام کو بھول جاتے ہیں۔ وہ نام یادداشت کے ارد گرد کسی بھنبھیری کی مانند منڈلاتا رہتا ہے مگر شعور کے دام میں گرفتار نہیں ہوتا لیکن ذرا سی کوشش سے آپ اسے قابو کر ہی لیتے ہیں۔

یہ یاد کہاں تھی؟ یہ قبل شعور میں تھی، اس کا یہ مطلب ہوا کہ اگر شعور ہمارا مکان ہے تو قبل شعور کو ہم مکان سمجھ سکتے ہیں۔ — اس گودام کی مانند ہے جس میں آپ اپنی فالتو اشیاء کا ذخیرہ کرتے ہیں۔ آپ یہ تو جانتے ہیں کہ آپ نے فلاں وقت میں فلاں شے وہاں رکھی تھی مگر کب اور کہاں — تو اس کے لیے تھوڑی تلاش کی ضرورت ہوتی ہے یہی حال قبل شعور کا ہے۔ بعض اوقات بھولی بسری بات فوراً ہی یاد آ کر در شعور پر دستک دے دیتی ہے لیکن بعض اوقات اچھی تلاش کے بعد آپ اس "چور" کو پکڑنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

لاشعور

لیکن آپ ہمیشہ اتنے پر تیلے اور خوش قسمت نہیں ثابت ہوتے کہ اس "چور" کو پکڑ لیں آپ سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں، رات کی نیند حرام کر لیتے ہیں — لیکن وہ گئے ہوئے وقت کی طرح دوبارہ کبھی شعور کی روشنی میں نہ آئے گا۔ یہ کچھ ایسے ہی ہے جیسے آپ سایہ کو پکڑنے کے لیے اندھیرے کمرہ میں چھپ کر بیٹھ جائیں — لیکن بے فکر رہیے، سایہ کبھی نہ پکڑا جائے گا اسی طرح آپ ان بچھڑے ہوئے واقعات کو کبھی بھی شعوری کاوش سے شعور میں نہیں لا سکتے ہیں۔

اسے تمثیلاً یوں سمجھیے کہ سطح سمندر شعور ہے پر یہی جہاں تک آپ کی نگاہ کو کام کرنے دیتی ہیں وہاں تک قبل شعور اور اس سے آگے — لاشعور! اتھاہ — گمبھیر اور بے کراں!! کرچن ملر نے اپنی کتاب میں ایک شکل کے ذریعہ ان تینوں کے تعلق کو ایک سلسلہ کوہ اور وادی کے ذریعہ سے سمجھایا ہے "اس شکل میں ایک سلسلۂ کوہ اور وادی دکھائی گئی ہے۔ سورج کی روشنی ایک دوسرے اونچے پہاڑ کے باعث وادی میں نہیں آ سکتی۔ اس پہاڑ کی چوٹیاں سورج کی روشنی سے پوری طرح مستفید ہوتی ہیں۔ اور یہی ہمارے نفس کا وہ حصہ ہے جسے ہم شعور کہتے ہیں، اس کے بعد وہ حصہ آتا ہے جہاں کہ روشنی محض دوپہر کو پہنچتی ہے یہ ہے قبل شعور، آخر میں وہ وادی ہے جہاں چوٹیوں کے باعث سورج کی روشنی نہیں پہنچ

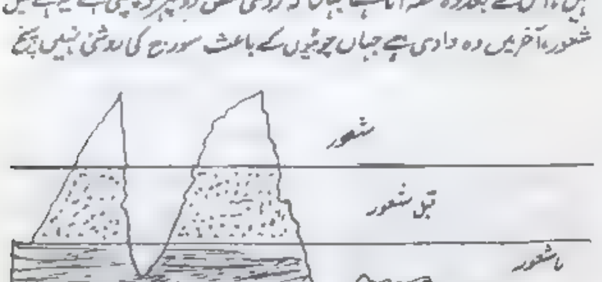

سکتی اور یہ ہے لاشعور۔ اس میں اب بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ شعور و قبل شعور کی بنیادیں لاشعور پر استوار ہیں۔"

فرائیڈ نے "تعبیر خواب" میں لاشعور کی تعریف یوں کی ہے:

"لاشعور ہی نفس ہے لیکن اس کی صحیح ماہیت اور فطری خصوصیات سے ہم خارجی دنیا کی مانند نا آشنا رہتے ہیں۔ لاشعور کے بارے میں شعور ہمیں جو کچھ بتاتا ہے وہ خارجی دنیا کے بارے میں حواس خمسہ سے اخذ شدہ معلومات کی مانند نامکمل ہوتا ہے۔"

اپنے تحریر کردہ مضمون "The Unconscious" میں اس نے

اس پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بقول یہ اصطلاح ایک سے زائد معانی میں استعمال ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ محض تشریحی نوعیت کی ہوتی ہے مثلاً ذہن کا وہ حصہ جو شعور سے عاری ہو۔ لیکن بعض اوقات یہ زیادہ باضابطہ طور سے استعمال کی جاتی ہے اور اس سے مخصوص معانی وابستہ ہوتے ہیں تب اس سے ذہن کا وہ حصہ مراد لیا جاتا ہے جو بعض مخصوص خصائص کا حامل ہو۔

شروع شروع میں فرائیڈ کا یہ خیال تھا کہ لاشعور صرف ان ناخوشگوار تجربات سے عبارت ہے جن سے فرد پیدائش کے بعد دوچار ہوتا رہتا ہے لیکن بعد میں جب اس نے طفلانہ جنسیت کا نظریہ پیش کیا تو اس نے اس میں بھی ترمیم کر کے فرد کے تجربات میں قبل پیدائش کے دور کو بھی شامل کر لیا۔

لاشعور کی تشکیل کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں۔ انسانی فطرت کا یہ خاص پہلو ہے کہ میٹھا میٹھا ہپ ہپ کوڑا کوڑا تھو تھو۔۔۔ ہر انسان یہی چاہتا ہے، کہ زمانہ بھر کی خوشیاں اس کے قدموں میں بیٹھی دم بھرتی رہیں۔ وہ اپنے ہر ارادہ میں کامران اور زندگی کے ہر معاملہ میں شادماں رہے ۔۔ لیکن ایسا ہونا ناممکن ہے اس لیے انسان حقائق کی تلخیوں سے فرار حاصل کرتے اور سامنے عیش کو غم و آلام سے محفوظ رکھنے کے لیے تمام ناخوشگوار واقعات کو احاطہ شعور سے باہر دھکیل دیتا ہے، جس طرح معاشرہ اپنے امن و سکون کو بچانے کی خاطر ناپسندیدہ عناصر کو شہر بدر کر دیتا ہے اسی طرح ان غارت ہوش تجربات کو کسی بے نظیر کی مانند شعور کے جگمگاتے محل سے اٹھا کر لاشعور کے اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا جاتا ہے ۔۔ تو یہاں سسک سسک کر مرو ۔۔۔ !

معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا کیونکہ یہ شہزادہ بے نظیر کی طرح سے نرم و نازک نہیں بلکہ یہ تو ان رہزنوں کی مانند ہیں جو چھپے رہتے ہیں لیکن موقعہ پا کر راہ گیروں کو لوٹ لیتے ہیں۔ دبائے گئے ناخوشگوار واقعات اظہار کے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں یہ دباؤ کیونکہ شعوری ہوتا ہے اس لیے اب یہ تجربات شعور میں آنے کے لیے سیدھے راستوں کی بجائے چور دروازوں کی تلاش کرتے ہیں، خواب اور زبان و قلم کی لغزش اس اظہار کے بظاہر بے ضرر کے ذریعہ ہیں۔

زیادہ شدید دباؤ کی صورت میں یہ ناخوشگوار یادیں کیونکہ شعور میں نہیں آسکتیں اس لیے یہ اندر ہی اندر لاشعور میں کھولتی رہتی ہیں۔ یہ ناگنوں کی طرح پیچ و تاب کھا کر بس گھولتی رہتی ہیں اور یوں ذہن میں ایک عجیب و غریب کش مکش سی برپا رہتی ہے اسی کیفیت کا نام ہے ۔ "الجھاؤ"۔ جیمز ڈریور (JAMES -- DREVER) نے اس کی یوں تعریف کی ہے:

"یہ ایک ایسا خیال یا خیالوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو شدید ہیجانی رنگ میں رنگا ہوا ہو اور جسے جزوی یا کلی طور سے اس لیے دبا دیا جائے کہ وہ فرد کے کم و بیش تسلیم شدہ خیالات اور تصورات کے برعکس اور مخالف ہوتا ہے۔"

مندرجہ ذیل نقشہ کے ذریعہ سے اس کے عمل کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے

شکل نمبر ۱۔ الجھاؤ کی عام حالت ہے، جس میں کسی قسم کے دباؤ کی عدم موجودگی کی بناء پر یہ شعور پر آسانی سے اثر انداز ہو سکتا ہے۔ شکل نمبر ۲۔ اس حالت کو ظاہر کرتی ہے جس میں دباؤ سے کام لے کر اسے اظہار کا موقعہ نہیں دیا جاتا۔ خ ، ان خیالات کی نمائندگی کرتا ہے جو کسی الجھاؤ کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ شکل نمبر ۱ میں یہ شعور پر آزادانہ اثر انداز ہو رہے ہیں جبکہ شکل نمبر ۲ میں دباؤ ان کے اور شعور کے درمیان سد سکندری کی طرح قائم ہے۔ شکل نمبر ۳۔ اس حالت کو ظاہر کرتی ہے جس میں الجھاؤ کے تابع فرمان خیالات نے شعور سے رابطہ قائم کرنے کے لیے دیگر بالواسطہ طریقے اختیار کئے ہیں۔ شکل نمبر ۳ میں خ۔ اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ خیالات نے دباؤ کو "جُل" دینے کے لیے اپنی صورت اور انداز تبدیل کر لیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ دباؤ کیا ہے؟ فرائیڈ اپنی تحقیقات سے اس نتیجہ پر پہنچا کہ جب ذہن میں ۔ کعبہ میرے آگے تو کلیسا میرے پیچھے ۔۔ سے ملتی جلتی حالت پیدا ہو جائے اور جب دو قوی محرکات ذہن کو اس بے بس پن کی طرح بنا دیں جو یکساں قوت کے دو مقناطیسوں کے درمیان لرز رہی ہو تو فرد اس ذہنی رجحان کے پیدا کردہ تناؤ کی کیفیت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ایک خیال کو شعور سے نکال دیتا ہے اس عمل کو نفسیات کی اصطلاح میں "دباؤ" کہتے ہیں۔

گو دباؤ کا یہ عمل لاشعوری ہوتا ہے اور شعور کسی ایک خیال کو اپنی حدود سے نکالنے کے بعد مطمئن ہو جاتا ہے لیکن یہ اطمینان عارضی ہوتا ہے کیونکہ (جیسا کہ شکل نمبر ۳ سے واضح ہوتا ہے) دباؤ کے باوجود بھی یہ خیالات بھیس بدل بدل کر شعور پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے فرائیڈ کے خیال میں ہمارا کوئی فعل اتفاقی یا غیر ارادی نہیں ہوتا۔ ہمارا شعور اپنی دانست میں تو بہت "باشعور" اور "مطلق العنان" بنتا ہے لیکن یہ لاشعوری محرکات چھپ چھپ کر کچھ ایسے طریقہ سے وار کرتے ہیں کہ انسان سمجھتا ہے۔ یہ تو محض ایک اتفاق تھا۔ لیکن فرائیڈ کہتا ہے کہ کوئی فعل اتفاقی نہیں ہوتا بلکہ لاشعور پہلے سے ہی اس کے وقوعہ کو معین کر رکھا ہوتا ہے البتہ اس کی پیش کش اس انداز سے کی جاتی ہے کہ شعور اسے "اتفاقی" اور "نادانستہ" قرار دے کر مطمئن ہو جاتا ہے فرائیڈ نے اس عمل کے لیے "جبریت" کی اصطلاح وضع کی تھی۔

فرائیڈ کے نزدیک زبان و قلم کی لغزشیں بھی اسی زمرہ میں آتی ہیں۔ اس نے تحلیل نفسی پر اپنے لیکچروں میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ایک پوری کتاب بعنوان PSYCHO - PATHOLOGY OF EVERY-DAY LIFE بھی تحریر کی ہے، تحلیل نفسی پر اپنے چوتھے لیکچر میں فرائیڈ نے اس کے بارے میں یوں کہا:

"بات کرنے والے نے یہ تہیہ کر لیا ہوتا ہے کہ وہ اس خیال کو الفاظ کا جامہ نہ پہننے دے گا۔ لیکن ہوتا یوں ہے کہ اس کی زبان سے ایک غلط لفظ نکل جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خیال جسے اظہار کی اجازت نہیں ملتی وہ اس کی قوت ارادی کے خلاف اظہار کے لیے یا تو کسی اور طرح کے مفہوم کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے

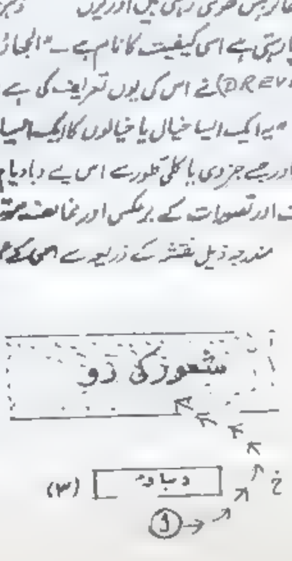

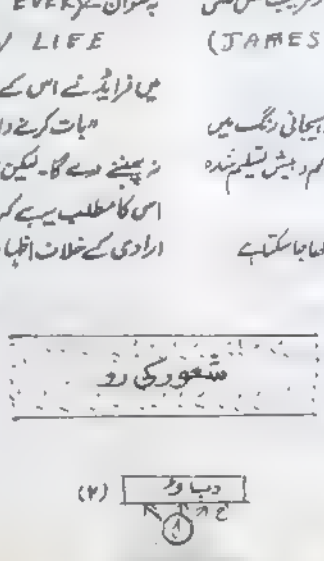

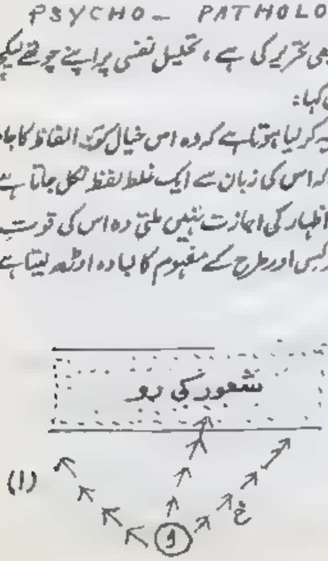

یا پھر وہ اسے غلط ملط کر دیتا ہے اور یا خود اس کی جگہ حاصل کر لیتا ہے' کچھ یہی حال تکلم کی ٹھوکروں کا ہے۔ مجموعی لحاظ سے ان لغزشوں کی درجہ بندی یوں کی جا سکتی ہے:

۱۔ حرکی

(۱) نطق و تکلم کی ایسی ٹھوکریں جو بظاہر تو بے ضرر سی معلوم ہوتی ہیں لیکن جو کسی اندرونی کش مکش کی غماز ہوتی ہیں۔

(ب) کسی ایسی حرکت یا فعل کا انجام پا جانا جس سے خود فرد بھی ناآشنا رہتا ہے۔

۲۔ حسیاتی

(۱) بات کا بھول جانا۔ کوشش بسیار کے بعد بھی جب آپ کوئی بھولا ہوا نام یا چہرہ یاد نہیں کر سکتے تو وہ اس کا باعث ہوتا ہے۔

(ب) بعض اوقات آپ کے تصورات، یادداشت وغیرہ کو غلط راہ پر ڈال دیا جاتا ہے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ چیز سامنے پڑی ہے مگر نظر نہیں آتی۔ بغل میں لڑکا اور شہر میں ڈھنڈورا اس کی بڑی اچھی مثال ہے۔

بعض اوقات دباؤ کا یہ عمل اس قدر شدید ہوتا ہے کہ تصورات و تجربات کا وہ حصہ ہمیشہ ہی کے لیے شعور سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ جب بعض تجربات ذہن کے لیے سخت خوفناک، کربناک یا اذیت دہ ثابت ہوں تو اس صورت میں ذہن کو ان سے وابستہ کربناک کیفیات سے محفوظ رکھنے کے لیے شعور ان کو کسی عضو معطل کی مانند کاٹ دیتا ہے۔ جنگ میں گولہ بارود کے دھماکوں کی وجہ سے بہت سے فوجی اپنی یادداشت گنوا بیٹھے۔ اسے اصطلاح میں "علیحدگی" کہتے ہیں۔

لاشعور کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں۔

۱۔ یہ منطق اور استدلال کے اصولوں سے ماورا ہے چنانچہ اس کے وسیع دامن میں متناقض قسم کے خیالات بھی پہلو بہ پہلو ادھر مچاتے ملتے ہیں۔

۲۔ یہ منطقی اصولوں کا پابند نہیں اس لیے اس میں زمان سے وابستہ تصورات کا فقدان ملتا ہے اس لیے اس میں ماضی بعید کے تصورات اور تحریکات حال کے سلسلوں سے آنکھ مچولی کھیلتے ملتے ہیں۔

۳۔ اسے حقائق سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ ایک ضدی بچے یا وحشی کی مانند ہے جو صرف اپنی خوشی کو مقدم سمجھتے ہوئے ہمیشہ من مانی کرنے کو تلا رہتا ہے اسے اخلاقی اقدار معاشرتی پابندیوں اور مذہبی ضوابط سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اور اسی لیے اس کے مطالبات سراسر "غیر اخلاقی" اور "غیر قانونی" ہوتے ہیں۔

۴۔ لاشعوری خیالات کی باہمی تکثیف و ایجاز اور ایک خیال سے دوسرے خیال کی تبدیلی کا عمل آزادانہ اور بلا روک ٹوک جاری رہتا ہے یہ وہی عمل ہے جسے فرائیڈ نے "تعبیر خواب" میں "ابتدائی عمل" کا نام دیا تھا۔ فرائیڈ نے اسے تسلیم کیا ہے، کہ ابتدائی اور ثانوی عمل میں امتیاز کے لیے وہ بریئر کا مرہون منت ہے۔

۵۔ اس کا کثیر حصہ جنسی ہے کیونکہ جنسی محرکات ہی زیادہ تر تشنہ اور ناآسودہ رہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جبلت سے وابستہ مطالبوں کی آزادانہ تکمیل پر سب سے زیادہ اور کڑی پابندیاں ملتی ہیں اس لیے اس کا معتدبہ حصہ جنسی خیالات سے ماخوذ ہوتا ہے۔

اید، انا اور فوق الانا:

آپ اب انسانی ذہن، اس کی کارکردگی اور شعور، لا شعور کی باہمی آویزش کو سمجھ چکے ہوں گے۔ فرائیڈ انسانی ذہن کی اس تشریح سے مطمئن نہیں ہوا چنانچہ اس نظریہ کو منطقی انتہا تک لے جانے اور اس کے بعض کمزور پہلوؤں کو رفع کرنے کے لیے اس نے انسانی نفس کی داخلی کارکردگی کی بھی تشریح کی۔ ویسے فرائیڈ سے پہلے "مجذوب فرنگی" نطشے اور ڈاکٹر گروڈیک (TR. GRODDECK) نے اید اور انا کے درمیان امتیاز پیدا کر لیا تھا، اسی طرح فرائیڈ کا فوق الانا کا تصور بھی نطشے کے خراب ضمیر Bad Conscience سے ایک حد تک مشابہ ہے۔

فرائیڈ نے ۱۹۲۳ء میں اس مسئلہ پر ایک کتاب The Ego & the Id لکھی تھی۔ اس کے دس سال بعد جب New Introductory lectures on Psycho-anaysis شائع ہوئی تو اس میں ایک باب اس کے لیے بھی مختص تھا۔ بظاہر اید ایک عجیب سا لفظ ہے اور بطور ایک علمی اصطلاح یہ بالکل بے معنی نظر آتا ہے۔ فرائیڈ کی تحریریں جرمن میں ہوتی ہیں۔ جرمن میں It کے لیے Es استعمال ہوتا ہے۔ جس طرح یہ لفظ It غیر شخصی سا نظر آتا ہے اسی طرح فرائیڈ نے ذہن کے لاشخصی حصے کی تشریح کے لیے اور اسے نفس اور انا سے میز کرنے کے لیے اسے بطور اصطلاح استعمال کیا۔ نطشے اور ڈاکٹر گروڈیک فرائیڈ سے قبل اسے ایک علمی اصطلاح کی حیثیت سے متعارف کرا چکے تھے۔ فرائیڈ کے انگریز مترجم نے انگریزی کے It کو اس لیے نہ اپنایا کہ عام بول چال کا لفظ ہونے کی بنا پر اس سے عبارت میں الجھن پیدا ہونے کا احتمال تھا۔ اس لیے لاطینی کا Id لیا گیا جو It کا مترادف ہے۔

فرائیڈ نے "The Ego & the Id" میں اید اور انا کی یوں تشریح کی ہے۔

"انا فہم اور ذہنی توازن کی نمائندہ ہے۔

برعکس اس کے اید صرف نفسانی خواہشات کا مجموعہ ہے ۔ ۔ ۔ اس لیے اید کے ساتھ اس کا تعلق کچھ ۔ ۔ شہ سوار ایسا ہے جیسے گھوڑوں کی زیادہ قوت پر لگام کے ذریعے قابو رکھنا ہوتا ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ گھوڑ سوار کی قوت اپنی ہوتی ہے جبکہ انا کی قوت مستعار ہوتی ہے۔"

آئیے اب ان تینوں کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کر کے ان کے باہمی تعلق کو متعین کریں۔

اید: اید کی خصوصیات کو مجموعی لحاظ سے یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ فرد کی جنسی، ہیجانی اور جبلی قوتوں کا باعث ہے۔ ماہیت کے اعتبار سے یہ لاشعوری ہے اور اس لیے یہاں بھی اصول مسرت کا سکہ چلتا ہے۔ اپنی آسودگی اور خواہشات کی تکمیل کے لیے یہ اخلاقی ضوابط سے خود کو ماورا سمجھتے ہوئے بیمانہ اظہار کو ترقی دیتا ہے اس لیے یہ بھی غیر منطقی ہے۔ اسے دلیل اور استدلال سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اس میں وحدت مقاصد کا فقدان ہے۔ دبائی گئی خواہشات بھی اس کا ایک حصہ بنتی ہیں۔ گو یہ قوت کا ذخیرہ ہے مگر اس کی قوت ذاتی نہیں ہوتی بلکہ زندگی کی دو جبلتوں، موت اور زندگی — سے مستعار ہوتی ہے اس لیے یہ محض جبلی ہے اس میں نظم و ضبط کا نام و نشان بھی نہیں۔

انا: انا اور اید میں اساسی فرق ہی یہ ہے کہ یہ نظم و ضبط کی تشکیل شدہ ہے اس لیے یہ دونوں کسی حد تک ایک دوسرے کے متضاد ہیں انا کی تشکیل میں وہ مواد سب سے زیادہ اہم کردار ادا کرتا ہے جو بام عقل اور لڑکپن میں قبل شعور سے گزر کر آتا ہے، کیونکہ اس کی اساس نظم و ضبط پر استوار ہے اس لیے یہ صرف شعوری ہی نہیں بلکہ منطقی بھی ہے۔ کارکردگی کے اعتبار سے یہ داخلی نہیں اسے خارجی ماحول اور گرد و پیش سے واسطہ ہے۔ اس کی حیثیت ایک "باجگذار مملکت" ایسی ہے جو اپنی جگہ خود مختار ہوتے ہوئے بھی کسی کے تابع ہو۔ اس پر فوق الانا کا دباؤ ہوتا ہے

اس کے اصول و قوانین اخلاقی اقدار کے مرہون منت ہوتے ہیں، اسے اخلاق کا اتنا خیال رہتا ہے کہ نیند کے وقت اِیڈ کے خوف کی وجہ سے یہ اپنی عدم موجودگی کی صورت میں محتسب چھوڑ جاتی ہے۔ اس کے زیریں حصے اِیڈ میں مدغم ہو جاتے ہیں اس لیے اس کا کچھ حصہ شعور میں ہے تو کچھ لاشعور میں ـــ تمام دباؤ اس کے رہین منت ہوتے ہیں اور اس کی کوششوں سے ارتفاع کا عمل تکمیل پاتا ہے۔

فوق الانا: اس کا اور انا کا تعلق بہت گہرا ہے۔ گو یہ انا سے ہی منسلک ہے۔ مگر یہ انا کے ہر فعل کا حساب کتاب رکھتی اور جانچ پڑتال کرتی رہتی ہے یہ گویا آڈٹ آفس AUDIT OFFICE ہے۔ ویسے اس کا اِیڈ کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے اور انا کی نسبت اس کا بہت کم حصہ شعور میں آسکتا ہے اس لیے یہ انا کی پہنچ سے باہر رہتی ہے۔ اس کا سب سے اہم فریضہ اخلاقی ناقد کا ہے، یہ اپنی ہر وقت کی شدید تنقید سے انا میں احساس جرم ابھارتی رہتی ہے۔ فرائڈ نے پہلے اسے اناتی معیار کا نام دیا تھا مگر بعد میں اس نے فوق الانا کی اصطلاح وضع کی۔

اب آئیے ان کے باہمی روابط کو متعین کریں۔

انا کا کردار سب سے اہم اور مشکل ہے۔ اس کا واسطہ ایک نگران سے ہوتا ہے ایک طرف اِیڈ کے جبلی مطالبات دوسری طرف فوق الانا کی کڑی تنقید اور تیسری طرف خارجی حقائق اور ان سے وابستہ تقاضے ـــ آپ ایک لڑکی کو دیکھتے ہیں اور آپ کے اندر اسے حاصل کرنے کا جذبہ سر ابھارتا ہے (اِیڈ) مگر آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ برا کام ہے (فوق الانا) اور خارجی حقائق کی مدد سے آپ کو اپنے اس فعل کا انجام بھی معلوم ہے اب اگر تو یہ کشمکش ویسے ہی رہے تو اس سے ذہن ایک خلفشار اور آویزش میں مبتلا رہے گا۔ اور ایک الجھاؤ کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس موقع پر انا ان تینوں تقاضوں کے درمیان مصالحت کی صورت پیدا کرتی ہے، دراصل اِیڈ کے معاملہ میں انا کو دو فرائض سرانجام دینے ہوتے ہیں۔

۱۔ خارجی دنیا کا جائزہ لیتے رہنا اور جب بھی موزوں وقت ملے تو اِیڈ کی بے مہار سی خواہشات کو آسودہ کر دینا۔

۲۔ اِیڈ کو مجبور کرتے رہنا کہ وہ اپنے مطالبات سے دست بردار ہو جائے لیکن اگر اس سے ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر ان میں ترمیم کرنا یا کسی موزوں وقت تک کے لیے انا کی آسودگی کو معرض التوا میں ڈال دینا۔

لیکن جب اِیڈ اور انا میں مصالحت کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکے اور انا کی سعی کشمکش در تو پس شروع ہو جائے تو پھر فرد اعصابیت اور عصبیت کا شکار ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود انا ہی سب کچھ بھول کر اِیڈ کے چکر میں پھنس جاتی ہے۔ اور اس کی آنکھوں پر جیسے پٹی سی بندھ جاتی ہے اس صورت میں فوق الانا اسے برا فعل کرنے سے باز رکھنے کی سعی کرتی ہے۔ یہ وہی ہے جسے ضمیر کی آواز سمجھا جاتا ہے، اس کی شدید صورت میں مجرمانہ الجھاؤ جنم لیتا ہے جس کی انتہائی صورتوں میں ذہنی توازن تک بگڑ کر رہ جاتا ہے۔

فرائڈ نے ان تینوں کو مندرجہ ذیل شکل کے ذریعے سمجھایا ہے

۲۔ جنس کی اہمیت:

فرائڈ کی شہرت بلکہ بدنامی کا سب سے بڑا سبب اس کا نظریۂ جنس ہے معاشرہ نے اس حیاتیاتی احتیاج کو جس طرح سے دبا کر اور اس سے وابستہ تقاضوں کی تکمیل میں رکاوٹوں کی جو دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں ان میں سب سے پہلے اس کے نظریات نے رخنے ڈالے۔ فرائڈ سے قبل "جنس" سے مراد صرف وہ مخصوص کارکردگی تھی جس کا مرکزی نکتہ جنسی فعل کو قرار دیا جا سکتا ہے اس لیے عام لوگوں کے لیے یہ لفظ اچھا خاصا "ہوا" بنا ہوا تھا۔ اور اس کے استعمال میں اتنا تکلف برتا جاتا تھا کہ معالجین بھی اس موضوع پر کھل کر بات کرتے ہوئے جھجکتے تھے۔ لیکن فرائڈ نے اس لفظ کے معانی میں بے کرانی پیدا کر دی۔ اب یہ صرف جنسی فعل تک ہی محدود نہ رہا۔ بلکہ زندگی کی رنگا رنگی اور اس کی بوقلمونی میں جاری و ساری قوت کا نمائندہ بن گیا۔

اگر فرائڈ نے جنس کی جگہ کوئی اور بے ضرر سا لفظ (مثلاً محبت، تولید وغیرہ) استعمال کیا ہوتا تو شاید اس کی اتنی مخالفت نہ کی جاتی مگر فرائڈ نے قبول عامہ کی خاطر جنس ایسے "کریہہ" لفظ کا استعمال ترک نہ کیا۔

فرائڈ نے پہلی مرتبہ جنس کا رشتہ فرد کی شخصیت کے ارتقائی قانون، ذہنی توازن، علم و ادب کی قدروں اور فن کے معاییر سے وابستہ کرتے ہوئے انسانی معاشرہ کی ترقی اور ارتقا کو اس کا مرہون منت بنا دیا۔

تحلیل نفسی پر اپنے اولین لیکچر میں اس نے کہا:

"۔۔۔۔ ان جنسی تحریکات نے انسانی ذہن کی ثقافتی، فن کارانہ اور سماجی نوعیت کی اعلیٰ ترین کارگزاریوں کی تشکیل میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔" [1]

جنس کے بارے میں فرائڈ کے خیالات کتنے ہی انوکھے اور چونکا دینے والے کیوں نہ محسوس ہوں لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ فرائڈ کاروان دانش کے ایک خاص مرحلہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ مختلف لوگوں کی تحریروں میں جنس کے بارے میں کسی نہ کسی انداز سے اظہار خیال ملتا تھا البتہ فرائڈ تک ایک ایسی ذہنی فضا تیار ہو چکی تھی جس نے فرائڈ کے لیے خام مواد کا کام کرتے ہوئے اسے اپنے نظریات کی تشکیل میں امداد دی۔ مثلاً اس سے پہلے شار کو نے بھی اپنی گفتگو اور کہیں کہیں تحریروں میں انسانی زندگی میں جنس کی اساسی اہمیت پر زور دیا ہے۔

یونانی فلسفہ دانوں نے زندگی کے ہر پہلو کا عقل و دانش کی روشنی میں جائزہ لینے کی سعی کی تھی، اس لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ جنس کے بارے میں بالکل ہی خاموش رہتے ویسے بھی ان کے ہاں اعلیٰ ترین دوستی اور ارفع محبت کا تصور ہم جنسیت پر مبنی تھا۔ اس لیے عورت مرد کے تعلقات پر خالص جنس (طبعی) انداز سے سوچنے میں ان کے لیے زیادہ سہولت تھی۔

جنسیت اور افلاطونی محبت کا داعی افلاطون اس کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتا ہے:

"۔۔۔۔ اور تخم کیونکہ زندگی رکھتا ہے اس لیے اس میں تنفس کی صلاحیت

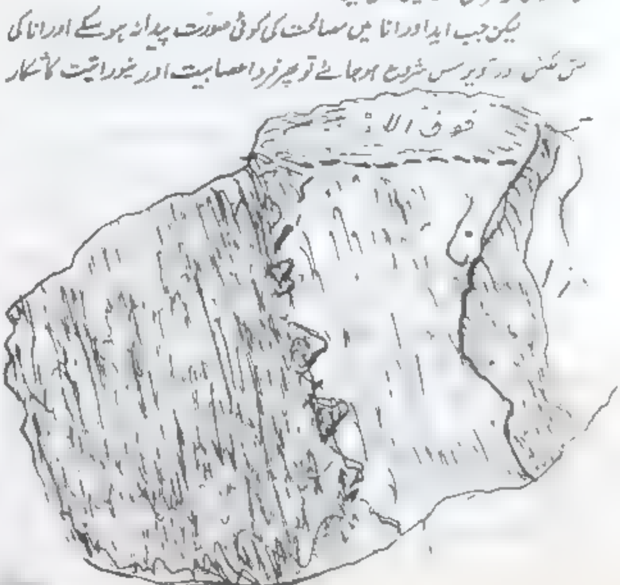

ودیعت ہوتے ہی دم لینے والا حصہ اخراج کی پُرجوش خواہش پیدا کرتے ہوئے ہم میں تولیدی مقاصد کی لگن کا باعث بنتا ہے جس کی وجہ سے مردوں میں تولیدی آلہ بااختیار ہو کر اس جوان کی مانند ہو جاتا ہے جو عقل کی تابعداری نہیں کرتا اور شہوت کی شدت اسے گویا پاگل سا بنا دیتی ہے اس لیے وہ (اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے) مکمل اختیارات کا طالب ہوتا ہے۔ یہی حال عورت کے نام نہاد رحم یا بچہ دانی کا ہے۔ ان کے اندر بیٹھا ہوا جوان بچوں کی تولید کا خواہش مند ہوتا ہے اور جب ایک خاص وقت گذر جانے کے بعد تک بھی وہ بارآور نہیں ہوتی تو وہ (جوان) بے تاب ہو کر غصہ کا اظہار کرتے ہوئے جسم کے تمام حصوں میں آوارہ گردی شروع کر دیتا ہے وہ تنفس کے راستے بند کر کے اور ان کے عمل میں رکاوٹ ڈال کر ان میں انتہا پسندانہ کیفیت پیدا کر کے اس وقت تک ہر قسم کی بیماریاں پیدا کرنے کا موجب بنتا رہتا ہے۔ جب تک کہ مرد اور عورت کی خواہش اور باہمی محبت ان کا ملاپ نہیں کرا دیتی یہ بالکل درخت سے پھل توڑنے کے مترادف ہے، جس طرح زمین میں بیج ڈالتے ہیں اسی طرح رحم میں تخم ریزی کی جاتی ہے، جیوانات جو غیر شکلی اور جسامت میں بے انتہا مختصر ہوتے ہیں اندرون میں پختگی حاصل کرتے ہیں اور تب بالآخر یہ روشنی میں لائے جاتے ہیں، اور یوں حیوانات کی نسل تکمیل پا جاتی ہے۔"

طفلانہ جنسیت

فرائڈ سے قبل جنسی کارکردگی (ذہنی یا جسمانی) کا آغاز بلوغت سے سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے فرائڈ نے جب طفلانہ جنسیت کا نظریہ پیش کیا تو اس پر بہت زیادہ لے دے ہوئی لیکن لطف کی بات تو یہ ہے کہ فرائڈ سے پہلے بعض ماہرین اس نظریہ تک پہنچ چکے تھے۔ ہنگری کے ڈاکٹر لینڈ سر نے پہلی مرتبہ بچہ کے انگوٹھا چوسنے کی جنسی اہمیت کو واضح کیا تھا اسی طرح "ڈاکٹر گلنٹ نے ایک نوجوان لڑکی کے اعترافات میں لکھا ہے کہ "وہ ابھی تک انگوٹھا چوسنے کی عادی ہے اور اسے اس سے ویسے ہی لذت محسوس ہوتی ہے جیسی جنسی تسکین سے، خصوصاً اپنے محبوب کو بوسے دینے میں!

اس لڑکی نے بتایا کہ بوسہ دینے میں وہ لذت کہاں جو انگوٹھا چوسنے میں میسر آتی ہے۔ انگوٹھا چوستے وقت لذت کی جو لہر سارے بدن میں دوڑ جاتی ہے اس کا بیان ممکن نہیں، اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں اس دنیا سے دور کہیں چلی گئی ہوں۔ میرا دل مسرتوں اور خوشیوں سے لبریز ہو جاتا ہے۔ میں اس وقت کے احساسات کو بیان نہیں کر سکتی، یہی جی چاہتا ہے کہ مکمل خاموشی ہو اور اس خاموشی کو توڑنے والا کوئی نہ ہو۔ کتنا عجیب سماں ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں نہ تو دکھ کی یاد ہوتی ہے اور نہ کسی غم کی۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا میں کسی دوسری دنیا میں چلی جاتی ہوں"۔

فرائڈ نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ اس کے نظریہ سے تین سال قبل امریکی ماہر ڈاکٹر سین فورڈ بیل (DR. SANFORD BELL) نے ۱۹۰۲ء میں طفلانہ جنسیت پر اپنے خیالات کا اظہار علمی انداز سے کیا تھا، اس نے ۱۵ سالہ تحقیقات کے دوران ۲۵۰۰ بچوں کے (جن میں سے ۸۰۰ اس کے ذاتی مشاہدات سے اخذ شدہ نتائج کی بناء پر یہ دعویٰ کیا کہ "ان ہزاروں بچوں کے مشاہدات کی بنا پر غیر متعصب ذہن رکھنے والا انسان جنس کو ان کا باعث قرار دیئے بغیر نہیں رہ سکتا"

لیکن ان ابتدائی ماہرین کے کام کی وجہ سے فرائڈ کی اہمیت کسی لحاظ سے کم نہیں ہوتی اور طفلانہ جنسیت کا تصور تحلیل نفسی کے عنوان سے آنے والے اس کے وسیع نظام فکر کی ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔

فرائڈ کا یہ خیال بچوں کے مطالعہ اور مشاہدہ پر مبنی نہ تھا۔ اس کے پاس جو بالغ مریض آتے تھے۔ جب وہ آزاد تلازمہ کے ذریعے ان کی ذہنی الجھنوں کی تہہ تک پہنچتا تو وہاں ہمیشہ بچپن کے کسی نہ کسی واقعہ کو موجود پاتا۔ اس نے اس ضمن میں اپنی خود نوشت سوانح عمری میں تحریر کیا ہے: "میرے مریضوں کی اکثریت نے اپنے بچپن کے ایسے واقعات بیان کئے جن میں کسی زیادہ عمر کے آدمی نے جنسی لحاظ سے ان کو ورغلایا ہوتا تھا۔ مریض عورتوں کی صورت میں یہ کردار ہمیشہ مریضہ کے باپ کو سونپا جاتا تھا۔ میں اس وقت ان کو صحیح تسلیم کرتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن بالآخر میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ واقعات کبھی بھی ظہور پذیر نہ ہوئے تھے بلکہ یہ ان کی فانتزی تھی" (ص ۴۰) فرائڈ نے اسی نکتہ سے اپنی جنسی تحقیقات کا آغاز کیا۔

فرائڈ نے معلوم کیا کہ ابتدا میں جب بچہ آنکھیں کھولتا ہے تو بیرونی دنیا میں سے اس کا صرف ایک چیز سے واسطہ پڑتا ہے اور وہ ہے ماں کی چھاتی! شروع شروع میں بچہ ان کو اپنے ہی وجود کا ایک حصہ تصور کرتے ہوئے اپنی ملکیت سمجھتا ہے لیکن جلد ہی اسے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ یہ تو اس کے وجود سے ایک علیحدہ شئے ہے ادھر ماں اسے دودھ ہی نہیں پلاتی بلکہ اس کی دیگر جسمانی آسائشوں کا خیال بھی رکھتی ہے۔ وہ اسے نہلاتی ہے، جھولا جھلاتی ہے اور اسے لوریاں سناتی ہے۔ غرضیکہ اس مستقل قرب کی بناء پر بچہ کی ماں ہی اس کے جنسی جذبات کو ابھارنے کا موجب بنتی ہے۔ یہ بچہ کی اولیں محبت ہوتی ہے اور اس کے بعد تمام عمر کے لیے یہ محبت ایک ہمزاد کا روپ دھار کر اس کے ذہن کو متاثر کرتی رہتی ہے اور بلوغت کے بعد جب بھی وہ کسی جنسی فریق کا انتخاب کرے گا تو یہ اولیں محبت لاشعوری طور سے اس کے انتخاب کو متعین کرتی ہے۔ اس کے دو رد عمل ہوتے ہیں۔ ایک تو چھاتیوں، (یا بالفاظ دیگر ان کی مالکہ سے) بچہ کو وابستگی ہو جاتی ہے اور وہ ہر ممکن طریقہ سے اسے اپنے قابو میں رکھنے کا آرزومند ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی اسے ایک "رقیب" کی موجودگی کا بھی احساس ہو جاتا ہے۔ یہ رقیب ہے اس کا — باپ!! جب وہ دیکھتا ہے کہ ماں اسے بھی چاہتی ہے، تو وہ جل جاتا ہے۔ ابھی یہ جلن موجود ہی ہوتی ہے کہ بعض اوقات شرارت کرنے پر اسے باپ کی طرف سے یہ دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر وہ باز نہ آیا تو اس کا عضو مخصوص کاٹ دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ گھر میں عموماً ایسے مواقع آتے ہیں جب وہ اپنی ماں یا اور عورتوں کو عریاں حالت میں دیکھتا ہے تو اپنے ایسے عضو کی عدم موجودگی اسے باپ کی دھمکی یاد دلا دیتی ہے، وہ سوچتا ہے کہ جس طرح ان عورتوں کو شرارت کی یہ سزا ملی کہ ان کے عضو مخصوص کاٹ دیئے گئے اسی طرح میرا بھی کاٹ لیا جائے گا۔ بچہ کے لیے یہ ذہنی دھچکا ایک ایسے خوف اور دہشت کا باعث بن جاتا ہے جس سے ویسے تو اس کی جنسی زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے متاثر ہو کر رہ جاتی ہے لیکن وقتی طور پر اس میں ایک الجھاؤ پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے اسے خوف الجھاؤ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور بقول فرائڈ: "جب خوف کی الجھاؤ اس طرح سے مضبوط ہوتا ہے تو کردار اور اعصابیت کی تشکیل میں وہ اہم ترین کردار ادا کرتا ہے کیونکہ اس دور میں بچہ مرد اور عورت کی جسمانی تفریق سے ناآشنا ہوتا ہے، اس کے نزدیک تو جن کے اعضاء کاٹے گئے وہ اب مرد نہیں ہیں۔ اس لیے اسے اپنی مردانگی کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

۱۹۲۳ء میں اس نے خوف کی الجھاؤ کے نظریہ میں اتنی سی ترمیم کر لی کہ یہ بغیر دھمکیوں کے بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

ایڈی پس الجھاؤ:

بچہ اپنے باپ کو پہلے سے ہی اپنا رقیب سمجھے بیٹھا تھا۔ اب جب اسے عضو کاٹ دینے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں تو وہ جان جاتا ہے کہ اس شخص نے اس کی ماں کو تو اس سے چھین ہی رکھا تھا۔ اب یہ اس کی سب سے قیمتی متاع کے بھی درپے ہے چنانچہ باپ سے

نفرت اور شدت اختیار کر جاتی ہے۔ اسی کا نام اڈیپس الجھاؤ ہے

لیکن ردِ عمل کی یہ واحد صورت نہیں بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات بچہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنسی لحاظ سے احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ خصوصاً اس صورت میں اگر اسے اپنے باپ کا مکمل نشو نما یافتہ عضوِ تناسل دیکھنے کا موقع ملا ہو۔ زیادہ شدید صورتوں میں فرد تمام عمر جنسی فعل کو بُرا سمجھتا رہتا ہے۔ اسی طرح ہم جنسیت اور جلق وغیرہ بھی بعض اوقات اسی کی بناء پر ہوتی ہیں۔

اس کے اثرات دور رس ہوتے ہیں اور ۱۹۱۷ء میں تحریر کردہ ایک پیش لفظ میں فرائڈ نے دعویٰ کیا ہے کہ مذہب کی اولیں اور ابتدائی صورت اسی کی بناء پر معرض وجود میں آئی، اس نے اپنی کتاب "TOTEM and TABOO" میں بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔

اڈیپس الجھاؤ پر مبنی احساسات کے بارے میں ایک دلچسپ استثناء، افریقہ کے Matrilineal tribes میں ملتا ہے جہاں یہ احساسات باپ کے خلاف نہیں بلکہ ماموں کے خلاف پائے جاتے ہیں کیونکہ کنبہ کی سربراہی کا بوجھ اس کے کندھوں پر پڑا ہوتا ہے۔

اب آئیے لڑکی کی طرف — !

ابتداء لڑکی بھی لڑکے کی مانند ماں سے ہی وابستگی اختیار کرتی ہے لیکن جب اسے احساس ہوتا ہے کہ لڑکے کی طرح وہ عضوِ تناسل سے محروم ہے تو وہ اس کا الزام اپنی ماں پر رکھتی ہے وہ اس لیے کہ ماں ہی تو اس کی نگرانی اور دیکھ بھال کیا کرتی تھی اگر وہ لڑکے کی مانند اس کے بارے میں بھی "احتیاط" برتتی تو یوں اس کا عضو نہ کھویا جاتا: چنانچہ خود کو لڑکا ثابت کرنے اور اپنے آپ کو بھی یہ احساس کرانے کے لیے پہلے تو وہ لڑکوں ایسے طور اطوار اپناتی ہے لیکن خارجی ماحول قدم قدم پر اسے اس کی سعی ناکام کا احساس کراتا رہتا ہے۔ اس لیے اس عادت کو چھوڑ دیتی ہے اور اب پھر ماں کے خلاف نفرت ذہن میں اجاگر ہو جاتی ہے، ادھر باپ کے پاس عضوِ تناسل بھی ہوتا ہے اس لیے وہ اسے اپنی ماں سے برتر اور ارفع سمجھتی ہوئی اس کی طرف اس امید پر جھکتی ہے کہ وہ اسے اس کی گمشدہ متاع واپس دلوا دے گا۔ اور یوں باپ کو "رجھانے" کے لیے وہ خود کو ماں کے روپ میں پیش کرتی ہے۔ عضوِ تناسل سے وابستہ احساس ایک اور طریقہ سے بھی اپنا اظہار کرتا ہے۔ اب اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنی ماں کی ذات کو درمیان سے نکال دے اور خود اپنے باپ کے عضوِ تناسل کی مالک بن جائے یہ ابتدائی احساس "ترقی" پا کر باپ کی ساری شخصیت پر محیط ہو جاتا ہے۔ بیٹیوں کو باپ کے لیے دل سے پیار رکھنا ہمارے اپنے معاشرے کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ اس کا اصطلاحی نام الیکٹرا الجھاؤ ہے۔

آبائی الجھاؤ: یہ دونوں اصطلاحیں ایک ہی تصویر کے دو پہلوؤں کی نمائندہ ہیں اور محض آسانی کی خاطر دو نام رکھ لیے گئے ہیں۔ تحلیلِ نفسی میں دونوں کے لیے ایک ہی نام ہے۔ اڈیپس الجھاؤ — آتا ہے فرائڈ نے اسے بنیادی یا آبائی الجھاؤ کا نام دیا ہے۔ کیونکہ فرد کی جنسی زندگی کے لیے یہ سنگِ اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لیے آبائی الجھاؤ کی اصطلاح بھی وضع کی گئی ہے۔ یہ الجھاؤ اس رجحان کی نمائندگی کرتا ہے جس کے زیرِ اثر بچہ لاشعوری طور پر مخالف جنس یا ہم جنس والدین کے ساتھ جنسی فعل کی خواہش کرتا ہے۔

اس الجھاؤ کا اظہار فرد کی شخصیت پر دو طرح سے اثر انداز ہوتا ہے۔

مثبت: اس صورت میں بچہ مخالف جنس کے والدین سے جنسی لحاظ سے متاثر ہو کر جنسی فعل کی لاشعوری خواہش رکھتا ہے مثلاً

اگر کسی لڑکی کو یہ الجھاؤ ہے تو وہ اپنی ماں سے نفرت کرے گی اور اسے اپنے راستہ سے ہٹانے کی خواہش مند ہوگی۔

منفی: یہ اوّل الذکر کے برعکس ہے اس صورت میں بچہ جنسی لحاظ سے ہم جنس کے والدین کو پسند کرتا ہے۔ اس صورت میں لڑکی کو اپنی ماں سے محبت ہوگی اور وہ اپنے باپ سے نفرت کرے گی۔

گو یہ سب کچھ لاشعوری ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی ایک فرد کی جنسی زندگی اور عام طور و اطوار اور خیالات و نظریات کی تشکیل میں اس الجھاؤ کے لاشعوری محرکات کا اہم ترین کردار ہوتا ہے، بعض ایسے لوگ ہیں جو جنسی لحاظ سے اپنے سے زیادہ عمر کی عورتوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ آبائی الجھاؤ کے مثبت پہلو کے حامل ہوتے ہیں۔ مشہور امریکی اداکار کلارک گیبل کی مثال نمایاں ہے۔ یہ عظیم اداکار جسے "ہالی وڈ کا شہنشاہ" کہا جاتا تھا، جنسی لحاظ سے ہمیشہ اپنے سے زیادہ عمر کی عورتوں کو پسند کرتا تھا اس نے کل پانچ شادیاں کیں۔ ان میں سے پہلی بیوی تقریباً تیس کی تھی جبکہ یہ ۲۳ سال کا نوجوان تھا۔ اس کی دوسری بیوی کی پہلی شادی اس وقت ہوئی جب یہ ابھی پیدا بھی نہ ہوا تھا۔ اس کی شادیوں کی ناکامی کی وجہ بھی یہی تھی کہ یہ بیوی کو ماں کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا، صرف ایک بیوی، اس کے معیار پر پوری اتری لیکن وہ بھی ہوائی جہاز کے ایک حادثہ میں ماری گئی۔

منفی انداز کے حامل کیونکہ ہم جنس کے والدین سے متاثر ہوتے ہیں اس لیے یہ جنسی تعلقات کی استواری کے وقت مخالف فریق میں ایسی خصوصیات دیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں جو ان کے اپنے ہم جنس کے والدین میں پائی جاتی ہوں۔ اگر ان کو اپنی پسند کا فریق نہ ملے تو جنسی بے راہ روی کی صورت میں ان کے لیے ہم جنسیت کو اپنانے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔

بعض اوقات کسی نہ کسی وجہ سے لاشعور کی ان "گندی" خواہشات کا شعور کو مکمل طور سے نہیں، علم ہو جاتا ہے اس صورت میں فرد اس سے فرار حاصل کرنے کی جستجو کرتا ہے۔ اب وہ اپنے لیے ایسے جنسی فریق کا طالب ہوتا ہے جو کسی طرح سے بھی اسے اپنے والدین کی یاد نہ دلا سکے، لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے تو تنزدیج فرمات کے نفسیاتی خوف کی وجہ سے جنسی قوت تک بھی سلب ہوتی دیکھی گئی ہے۔ مردوں میں نامردی اور عورتوں میں جنسی سرد مہری کی اہم ترین نفسیاتی وجوہات میں سے ایک یہ بھی ہوتی ہے۔ فرائڈ نے اس کے لیے جنسی بے حسی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ الجھاؤ گویا ایک آسیب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس صورت میں فرد جنسی تلون مزاجی کا شکار ہو جاتا ہے وہ ایک سے تعلقات استوار کرتا ہے مگر ایک لمحہ ایسا آتا ہے کہ اسے اس میں اپنے باپ یا ماں کی جھلک نظر آتی ہے اور اس کا سارا جوش سرد ہو جاتا ہے۔

اب کیونکہ لاشعوری تمنا اور اس سے وابستہ تنزدیج فرمات کا خوف جس کی بنیاد مذہبی، اخلاقی اور سماجی اقدار پر استوار ہوتی ہے، شعور میں آجاتے ہیں وہ خود کو گناہ گار سا محسوس کرتا ہے، اور یوں وہ اپنے تعلقات کشیدہ کر لیتا ہے اس کے بعد کوئی نئی صورت نظر آتی ہے اور وہ نہایت شوق اور بے تابی سے اسے مرکزِ تمنا قرار دے لیتا ہے لیکن کیونکہ اس کے لاشعور میں تو والدین میں سے کسی ایک کی مہر لگی ہے، اس لیے وہ جب بھی جنسی فریق کا انتخاب کرے گا تو وہ کسی نہ کسی صورت سے اپنے محبوب والدین کے خصائص کا حامل ہوگا۔ وہ اسے بڑے خلوص سے چاہتا ہے، لیکن پھر ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب اسے اپنی "غلطی" کا احساس ہوتا ہے اور وہ پھر اپنے تعلقات بگاڑ لیتا ہے — اور یہ چکر یونہی چلتا رہتا ہے۔

بعض اوقات فرد شروع سے ہی اس الجھاؤ کے ہاتھوں اتنا پریشان ہوتا ہے کہ وہ خود بھی دنیا اور دنیا والوں سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہیں پاتا۔ میرا مطلب ہے اس کی جنسی بے حسی کسی ایک فریق کے معاملہ میں آڑے آتی ہے مثلاً دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ عملی ہم جنس پرستی کے معاملہ میں تو بڑے تیز ہوتے ہیں مگر (بقول ان کے) عورت سے کوئی لذت نہیں ملتی۔ اسی طرح بعض عورتیں بھی عملی لحاظ سے ہم جنس پرست ہونے کے باوجود کسی مرد میں کوئی جنسی کشش نہیں پاتیں اس ضمن میں یونان کی طوائف سیفو (SAPHO) کی مثال بڑی کلاسیکل قسم کی ہے جس نے فاؤن کے عشق میں لیوکیڈیا کی چٹان سے گر کر خودکشی کر لی فاؤن اپنے دور کی دنیس تھی اور اس پہ لاتعداد عورتیں مرتی تھیں

اس طرح وہ لوگ بھی ہیں جو جلق لگا لیتے ہیں لیکن جن کے لیے ہم جنسیت اور غیر جنسیت دونوں ہی قابل نفرت اور کراہت انگیز ہیں۔ یہ لوگ ہر طرح سے صحت مند اور نارمل ہوتے ہوئے بھی اپنی آسودگی کے لیے جلق کو کافی سمجھتے ہیں ایسے لوگوں کو عورتوں سے جو "خوف" محسوس ہوتا ہے اس کی وجہ بھی مادرانہ وابستگی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ تمام دنیا کی عورتوں کو واقعی ماں سمجھتے ہیں۔

المختصر! آبائی الجھاؤ کے اثرات بہت گہرے اور دور رس ہوتے ہیں۔

جنس کے ضمن میں جتنی اہم اصطلاحات تھیں ان تمام کی وضاحت ہو چکی ہے اور اب ہم فرد کی جنسی نشوونما کا جائزہ لینے کے قابل ہو چکے ہیں۔

لیبیڈو: یہ وہ اصطلاح ہے جس کے استعمال کے بارے میں بعض اوقات بڑی الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔

جنس اور جنسی جبلت کے دو پہلو ہیں۔ ایک جسمانی اور ایک ذہنی۔ اصطلاحی طور سے ہم جنس کو "نفسی عضویاتی رجحان" کہہ سکتے ہیں اس لیے اس کے اثرات تناسلی اعضا تک ہی محدود نہیں بلکہ ذہن بھی ان سے اتنی ہی شدت سے متاثر ہوتا ہے۔ فرائیڈ نے لیبیڈو کو موخرالذکر معنی میں استعمال کیا ہے چنانچہ اس نے ایک جگہ لکھا ہے:

"وہ قوت جس کے ذریعے سے جنسی جبلت کو ذہن میں نمائندگی ملتی ہے ہم اسے لیبیڈو (جنسی طلب) کہتے ہیں اور یہ شدت کے لحاظ سے بھوک اور ہوس اقتدار سے مشابہ ہے۔"

لیکن فرائیڈ اپنی تعریفات کی ہمیشہ پابندی نہ کیا کرتا تھا۔ اس لیے ایک جگہ اس نے لیبیڈو کو وہ قوت بتایا ہے جس کے ذریعہ سے جنس اپنا اظہار کرتی ہے۔ ایک اور جگہ اس نے لیبیڈو کو ان جبلتوں کی قوت قرار دیا ہے جنہیں ہم محبت کے زیر عنوان ترتیب دے سکیں۔"

اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اس نے یوں لکھا:

"میں نے لیبیڈو کی اصطلاح جنسی جبلتوں کی قوت کے لیے وضع کی اور صرف اسی قسم کی قوت کے لیے اسے استعمال کیا ہے۔"

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ گو فرائیڈ نے بعض اوقات لیبیڈو کو تدرے مختلف مفہوم میں بھی استعمال کر لیا ہے لیکن اس کے ذہن میں اس کا بنیادی مفہوم "جنسی جبلت کی قوت" کے معنی میں پوشیدہ تھا۔ ویسے اس نے اکثر مقامات پہ لیبیڈو اور جنس کو بطور مترادف استعمال کیا ہے۔

جنسی نشوونما: اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ عنفوان شباب میں تولیدی اعضا کی جنسی کارکردگی کا آغاز جنسی زندگی کے صرف ایک پہلو کی نمائندگی کرتا ہے اور وہ بھی ایسا پہلو جس کا آسانی سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے ورنہ جنسی کارکردگی کا آغاز تو قیام حمل سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ بچہ دانی کا سکون خاموشی اور تنہائی۔ جہاں بچہ غم اندوز اور فکر فردا سے بے گانہ ہوتا ہے بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے اسے خوراک ملتی رہتی ہے اور وہ جدھر دیکھتا ہوں ادھر مجھ ہی میں ہوں سے کے مترادف وہاں کا مطلق العنان شہنشاہ ہوتا ہے۔

لیکن پیدائش اس طلسم کو شکست دے کر اب اسے جس طلسم سے روشناس کراتی ہے وہ اچھا خاصا ہوشربا ثابت ہوتا ہے۔

جنسی نشوونما ارتقا کے تین مراحل طے کرتی ہے۔

ا۔ خود جنسیت بچہ سب سے پہلے اپنے اعضا سے متعارف ہوتا ہے وہ جب ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا ہے تو بعض اوقات اس کا ہاتھ عضو تناسل سے جا ٹکراتا ہے اس لیے وہ ایک پرکیف احساس سے دوچار ہوتا ہے۔ شیر خوار بچوں کا اپنے اعضائے تناسل سے کھیلتے ہوئے پایا جانا ایک عام مشاہدہ ہے بچوں میں پستان اور انگوٹھا چوسنا، رانوں کو آپس میں مسلنا، بول و براز کے عمل سے دلچسپی یا جسم کے بعض دیگر اعضا کو سہلانا، یہ سبھی خود جنسیت کی مثالیں ہیں۔ اگر آپ کم عمر (خواہ شیر خوار ہی کیوں نہ ہوں) بچوں کے عضو تناسل کو چھیڑیں تو اس میں ایستادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ خود جنسیت کی شعوری اور ترقی یافتہ صورت جلق میں ملتی ہے۔

یہ عمر اس لحاظ سے بیحد اہم اور عمر کا یہ دور اس لیے بہت نازک ہوتا ہے کہ اس میں بچہ کو عضو کاٹنے کی دھمکی دی جاتی ہے جس سے خوف کا الجھاؤ جنم لیتا ہے، اس لیے اگر بچوں کو "ایسی ویسی" حرکتیں کرتے دیکھ لیا جائے تو ان سے کچھ تعرض نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ بعض اوقات بے وقت کی سرزنش اور سختی بچہ میں احساس جرم پیدا کر کے ساری عمر کے لیے اس کی جنسی زندگی کا بیڑا غرق کر دیتی ہے۔ بچہ اور بالغ کے نقطہ نظر میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ بالغ جسے "گندگی" اور "گناہ" سے تعبیر کرتے ہیں بچہ کے لیے وہ محض ایک دلچسپ مشغلہ ہوتا ہے۔ اس کے ذہن میں نہ تو جنس کا کوئی واضح تصور ہوتا ہے اور نہ ہی وہ استلذاذی کیفیات کے بارے میں باشعور ہوتا ہے۔ ہاں! بار بار ٹوکنے کی صورت میں چوری کے گڑ والی بات ہو جاتی ہے۔ اس رجحان میں کسی قسم کی استثناء نہیں پائی جاتی۔ بعد میں لوگ جھینپتے ہوئے "بچپن کی غلط کاریوں" کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس میں جھینپنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس منزل سے ہر ایک گزرتا ہے بلکہ برگر (BERGER) کے بقول "ننانوے فیصد نے کبھی نہ کبھی جلق ضرور لگایا ہوتا ہے اور ایک فیصد انکار کرنے والا جھوٹا ہے۔"

فرائیڈ نے جلق کے تین مدارج بتائے ہیں۔

ا۔ عالم طفلی میں

ب۔ طفلانہ جنسیت کے نکتہ عروج والی عمر یعنی تقریباً ۴ برس کی عمر میں

ج۔ عنفوان شباب میں

فرائیڈ کا خیال ہے کہ تقریباً ۴ برس کی عمر تک بچہ کی جنسی نشوونما مسلسل ہوتی ہے اس کے بعد گیارہ برس کی عمر تک درمیان کے سات آٹھ سالوں میں جنسی نشوونما کے لحاظ سے تعطل سا رہتا ہے، اسے وہ دور اخفاء کہتا ہے اس کے بعد عنفوان شباب آ جاتا ہے۔

بچوں میں طلب علم کئی رجحانات کی بنا پر پیدا ہوتا ہے لیکن ان میں سے جنس کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس دور میں بچہ جنسی معلومات کے حصول کے لیے بے تاب ہوتا ہے اور یہی رجحان بعد میں ارتفاع پذیر ہو کر علم و ادب کی ترقی کا باعث بنتا ہے۔

۲۔ ہم جنسیت جنسی نشوونما کا دوسرا دور وہ ہے جس میں بچہ اپنی جنس کے افراد سے رابطہ کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس دور میں بچے

کو مخالف جنس کے افراد سے نہ صرف کسی قسم کی دلچسپی ہی نہیں ہوتی بلکہ ان کے بارے میں اس کا رویہ معاندانہ اور ایذا دہی پر مبنی ہوتا ہے۔

اس دور میں جب بچے مل جل کر کھیلتے ہیں تو ایک دوسرے کے لمس سے جنسی حظ اٹھاتے ہیں۔ چھپ چھپ کر "جنسی کھیل" بھی اسی ضمن کی چیزیں ہیں۔ اس صورت میں وہ ایک دوسرے کے اعضائے تناسل دیکھتے ہیں۔ بعض اوقات وہ مل جل کر جلق لگاتے ہیں۔ اسی سے ہی عمل ہم جنس پرستی — یعنی لواطت اور اغلام بازی کا آغاز ہوتا ہے۔ عمل ہم جنس پرستی میں فاعل اور مفعول بننے میں (جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے، صرف جسمانی نزاکت اور کمزوری کو اتنا دخل نہیں ہوتا جتنا آبائی الجھاؤ کو — علاوہ ازیں مفعول بننے والے عموماً وہ بچے ہوتے ہیں جنہیں بچپن سے ہی مقعد اور پاخانہ کے فعل سے دلچسپی رہی ہوتی ہے۔ بعض اوقات قبض وغیرہ کی وجہ سے ماں بچہ کے حقنہ کرتی ہے اس سے جو استلذاذی کیفیات پیدا ہوتی ہیں بچہ انہیں فراموش نہیں کرتا۔ بلکہ ان کے اعادہ کے لیے وہ بار بار پاخانہ روک لیتا ہے۔ پاخانہ اور حقنہ سے وابستہ اس دلچسپی کو "مبرزیت" کا نام دیا جاتا ہے) ایسے ہی بچے مفعول بننا پسند کرتے ہیں۔ یہ امر اس سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ یورپ میں مخالف جنس سے جنسی تعلقات (جائز یا ناجائز) کی استواری کے ہزار ہا مواقع کے باوجود بھی وہاں ہم جنس پرستی پردہ کے پابند ایشیائی ممالک سے کچھ بڑھ کر ہی ہے۔ مثلاً برطانوی پارلیمنٹ میں ایک لیبر ممبر نے ایک بیان کے دوران ان خیالات کا اظہار کیا۔

"ہر ۲۵ مردوں میں سے کم از کم ایک ہم جنس پرست ملتا ہے۔ برطانیہ میں ہر چوبیس گھنٹے کے بعد پیدا ہونے والے بچے کے مقدر میں ہم جنسیت ہے"

جنسی معلومات کے حصول کا جذبہ یہاں بھی کارفرما ملتا ہے کیونکہ اپنے اعضاء سے واقفیت کے بعد وہ دوسروں کے بارے میں بھی حصول معلومات کے لیے بے تاب ہوتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ یہ کیسے ہے؟ اور یہ کرنے سے کیا ہوگا؟ یہ سوالات ہم جنسیت کے دور میں پہلے سے بھی زیادہ شدت اختیار کر جاتے ہیں۔ اور ان ہی سوالات کے جواب ڈھونڈنے کی ایک کوشش عمل ہم جنسیت کے روپ میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔

اس کی جنم دہی میں "نرگسیت" کا بھی ہاتھ ہے (نرگسیت کا تفصیلی ذکر بھی بعد میں آئے گا)

یہ رجحان قوی ہو جانے کی صورت میں فرد کے ذہن میں اسے گناہ اور جرم سمجھنے سے جو کشمکش اور آویزش پیدا ہوتی ہے اس کی بناء پر بعض اوقات خبط عقوبت جنم لیتا ہے۔ اس صورت میں فرد کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ساری دنیا اسے تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے اور اس کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کی جا رہی ہیں۔

۳ - مخالف جنسیت

"دور اخفاء کی اس لحاظ سے بہت زیادہ اہمیت ہے کہ عہد طفلی کی جنسی کارکردگی کے بارے میں اپنے اپنے حالات اور ماحول کے مطابق بچے کے ذہن میں کچھ ردعمل پیدا ہو کر وہ لاشعوری محرکات اور الجھاؤ کی ترویج کا باعث بنتے ہیں اور یوں مخالف جنسیت کے ڈھانچہ کی تشکیل کر کے اس کی جنسی زندگی کا انداز متعین کرتے ہیں۔

دور اخفاء کے اختتام پر فرد مخالف جنسیت کی منزل میں داخل ہو جاتا ہے یہ وہ دور ہے جس کے مطالبات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے خود فطرت بھی اس کی امداد کرتی ہے۔ جنسی ہارمونوں کی کارکردگی کے باعث اس میں وہ جسمانی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں جن کے باعث وہ جنسی کشش کا حامل ہو کر مخالف جنسیت سے وابستہ تقاضوں کی تکمیل کر سکتا ہے۔ اس دور میں احاطہ جنسیت کی کارکردگی بھی جس کا آغاز بچپن ہی سے ہو جاتا ہے۔ اپنے عروج تک جا پہنچتی ہے۔ فرائیڈ نے یہ نام جسم کے ان اعضاء اور مقامات کے لیے مخصوص کیا ہے جن میں جنسی لحاظ سے اشتعال پذیری کی صلاحیت ہوتی ہے اور جو فرد میں جنسی اشتعال کا موجب بن کر جنسی فعل کے لیے فریقین کو تیار کرتے ہیں۔ اہم ترین اعضاء یہ ہیں:

اعضاء تناسل، مقعد، چھاتیاں، منہ، زبان، آنکھیں، ہاتھ، بال، کانوں کی لو، پاؤں، رانیں، جانگھ، بغل۔

کیونکہ جنسی لحاظ سے عورت کو بیدار ہونے میں زیادہ دیر لگتی ہے اس لیے جنسی فعل سے قبل ان کا مساس اور ان سے کھیلنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔

گو مخالف جنسیت کا دور تمام عمر کے لیے ہوتا ہے لیکن یہ اس لحاظ سے قطعی طور سے خود مختاری اور انفرادیت کا مالک نہیں ہوتا کہ خود جنسیت اور ہم جنسیت کے اثرات انسان کے پیدا کردہ الجھاؤ تمام عمر کے لیے اس پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اور شاید ہی کوئی ایسا انسان مل سکے جو مکمل طور سے مخالف جنسیت پر مبنی جنسی رجحانات رکھتا ہو۔ کیونکہ بقول فرائیڈ:

"تحلیل نفسی سے علم ہوتا ہے کہ ہر ایک میں کم و بیش ہم جنسی پرستانہ رجحانات موجود ہوتے ہیں"

(خود نوشت سوانح حیات)

فرائیڈ نے ایک ایسے نوجوان کا تذکرہ کیا ہے جو لاشعوری طور پر ہم جنسیت پر مبنی رجحانات رکھتا تھا وہ جب کبھی بھی بیوی کے ساتھ سوتا تو اس کے ذہن میں ایک کشمکش سی پیدا ہو جاتی جس سے اس کا ذہن یوں چھٹکارا حاصل کرتا کہ وہ اپنی بیوی سے حسد کرتا۔ اسے اس کا کردار مشکوک معلوم ہوتا اور وہ اسے بے وفا سمجھتا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنے ناآسودہ ہم جنس پرستانہ رجحانات کی عدم تسکین کی بناء پر اپنی بیوی کو یوں "سزا" دے کر تسکین کا ایک پہلو نکال لیتا تھا۔

اور یوں گو طفلانہ جنسیت کا دور زیادہ سے زیادہ پانچ برس تک رہتا ہے مگر اس کے اثرات تمام عمر کی جنسی زندگی کو اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں اور بعض حالات میں (خصوصاً مجرمانہ الجھاؤ میں شدت کی بناء پر) تو یہ ایک ایسا زہر ثابت ہوتے ہیں جو مئے حیات کو تلخ کر دے۔

لبیڈو کا ارتقاء

جنسی نشوونما کے مندرجہ بالا تین مدارج وہ ہیں جو کم و بیش جسمانی ہیں اور جن کی کارکردگی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے ساتھ ساتھ لبیڈو بھی ارتقاء پذیر رہتا ہے اس سلسلہ میں ایک نکتہ ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ لبیڈو کا ارتقاء اور جنسی نشوونما کا آغاز ایک ہی وقت سے ہوتا ہے ان دونوں کے لیے عمر کا کوئی خاص دور مخصوص نہیں۔ جنسی نشوونما لبیڈو سے متاثر ہوتی ہے اور جواب میں اسے متاثر کرتی ہے۔ اور یوں عمل اور ردعمل کا یہ چکر سدا جاری رہتا ہے۔

فرائیڈ کے بقول ابتدا میں لڑکی کا لبیڈو اتنا نسائی نہیں ہوتا جتنا مردانہ، کیونکہ اس کی خود شہوانیت کارکردگی کا انحصار بظر پر ہوتا ہے۔ بظر عورتوں میں مردانہ عضو تناسل کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے، لیکن عنفوان شباب پر اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ جنسی لذت کا مرکز تو دراصل مہبل ہے لیکن ایک عضو سے دوسرے کی طرف مراجعت اتنی سہل نہیں ثابت ہوتی اس لیے بعض اوقات عورتیں جنسی ارتقاء کے لحاظ سے ابتدائی منزل پر ہی رہتی ہیں۔

لبیڈو کے ارتقاء کی پہلی منزل تو یہی خود شہوانیت ہے، اس کے بعد جو دور آتا ہے اسے نرگسیت کہتے ہیں

نرگسیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ فرد کا لبیڈو اپنی انا پر مرکوز ہو کر اپنی

ہی ذات میں گم ہو جاتا ہے۔ یہ خود پرستی اسے اپنی ذات کا عاشق بنا دیتی ہے۔ دیوانہ وار اپنا ہی عاشق بن کر اور اپنے نفس کو آئینہ بنا کر اس میں اپنے جلوے سے محظوظ ہوتا رہتا ہے اپنی اعلیٰ اور ارتفاع یافتہ صورت میں اس کے زیر اثر فن و ادب کے لازوال شاہکار تخلیق کئے جاتے ہیں۔

فرائیڈ کے نزدیک ہم جنسیت کی تشکیل میں اس کا بھی اہم کردار ہے۔

اگر اس دور میں لبیڈو کا ارتقا رک جائے تو اس صورت میں جنسی کمزوریوں کے علاوہ جس قسم کی شخصیت معرض وجود میں آتی ہے وہ خود پرست اور انانیت کی حامل ہوتی ہے۔ یہ لوگ خود کو ایک دیوتا کی مانند کسی بلند شہ نشین پر متمکن محسوس کرتے ہیں اور دوسروں سے اپنی "عظمت" کا خراج وصول کرتے ہوئے جواب میں کچھ بھی دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ اپنی ہی ذات میں مست رہتے ہوئے زیادہ ملنسار نہیں ہوتے اشیاء کی امید کے ساتھ ہی انتہائی شہوانیت بھی پیدا ہو جاتی ہے اس صورت میں بچہ ان اشیاء کی طرف راغب ہوتا ہے جو اس کی جنسی فانتزیوں کی تعبیر ثابت ہو سکیں۔ یہی وہ دور ہے جس میں بچوں کو کھلونوں سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ خصوصاً لڑکیاں تو گڑیوں پر جان دیتی ہیں، وہ ان کو بالکل اپنی اولاد کی طرح رکھتی ہیں اور بعض تو ماں کی نقل میں نہ صرف گڑیا کو نہلاتی اور ساتھ سلاتی ہیں بلکہ اسے دودھ بھی پلاتی ہیں۔ اس دور میں بچوں کی تمام متاع ان کے کھلونے ہوتے ہیں جن کو پیار کرکے اور جن کی دیکھ بھال میں ان کے لیے ایک حد تک جنسی مسرت کا بھی پہلو نکلتا ہے۔

دباؤ سے ارتفاع تک

غالباً یہ انسانی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ اس میں قوت اور اثر کے لحاظ سے جنسی جبلت کے تقاضے سب سے زیادہ شدید اور اس کے ہیجانات کا مقابلہ کرنا سب سے زیادہ مشکل ہے اور اسی جبلت کے مطالبات پر ہی زمانے بھر کے پہرے لگائے گئے ہیں۔ مذہب۔ اخلاق۔ معاشرہ۔ قانون غرضیکہ سب نے "نفس امارہ" کی مذمت کرتے ہوئے ایک سانپ کی مانند اس کے پھن کو کچلنے کی تلقین کی ہے۔ چنانچہ ان پابندیوں میں گھرے ہوئے لبیڈو کو اپنے اظہار کے لیے بہت زیادہ جدوجہد کرنا ہوتی ہے اور پھر لاشعوری نظام میں ایانا اور فوق الانا بھی موجود ہیں جو ذرا اسی بات پر آنکھیں دکھانے کو تیار۔ ادھر خارجی ماحول میں طرح طرح کی رکاوٹیں ملتی ہیں اور گوہر مقصود حاصل کرنے کے لیے لبیڈو کو بھی کسی رستم کی طرح "ہفت خواں" طے کرنے ہوتے ہیں۔ اس کے اثرات کئی طرح کے ہوتے ہیں۔

۱۔ دباؤ

اس کا تفصیلی ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ ویسے اس کی دو صورتیں ملتی ہیں۔

ا۔ ابتدائی دباؤ خارجی نوعیت کا ہوتا ہے کسی کٹ ملا کے لیے بچوں کو جو ماحول ملے گا وہ اس کی بڑی اچھی طرح سے وضاحت کرتا ہے، اس صورت میں بچہ حتی الامکان جنسی ہیجان سے بچا رہتا ہے، اس صورت میں دباؤ کا عمل بڑا واضح اور سہل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ سب ماحول کے زیر اثر ہوتا جاتا ہے۔

ب۔ قانونی دباؤ میں وہ دباؤ ہے جس کی تحلیل نفسی میں بے حد اہمیت ہے اس دباؤ کی صورت ہی میں وہ تمام لاشعوری الجھاؤ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں، جو بعد میں فرد کے لیے مصیبت کا باعث ثابت ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں فرائیڈ کے ایک بہت مشہور کیس کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ننھا ہنس ۱۲ برس کا لڑکا تھا اور وہ گھر سے باہر نکلنے کے بارے میں نفسیاتی خوف کا شکار تھا۔ تحلیل نفسی سے پتہ چلا کہ اسے یہ ڈر تھا کہ کہیں کوئی گھوڑا اس کے عضو تناسل کو نہ چبا ڈالے۔ مزید تحقیق سے معلوم ہوا کہ ایڈی پس الجھاؤ کے تحت وہ باپ سے حسد کرتا تھا۔ اور خوف کی الجھاؤ کی بنا پر اسے یقین تھا کہ اس کا باپ رقابت کی بنا پر اس کے عضو کو کاٹ لے گا۔ یہاں روپے کا لاشعور اس کے آڑے آیا۔ اور اس نے باپ سے خوف اور نفرت کو گھوڑے پر منتقل کر کے لڑکے کو اس الجھاؤ کی پیدا کردہ کشمکش سے نجات دلادی۔

۲۔ مراجعت

یہ وہ کیفیت ہے جس میں لبیڈو طفلانہ جنسیت کے دور کی یاد تازہ کرتا ہے۔ بعض اوقات کوئی واقعہ ذہن پر اس برے انداز سے اثر ڈالتا ہے کہ فرد کو اس سارے سلسلے سے ہی نفرت ہو جاتی ہے اور یوں دوبارہ وہ بچپن کی وادیوں میں آ جاتا ہے۔ مثلاً کسی لڑکی کی بے وفائی بعض اوقات تمام عورتوں سے متنفر کرا دیتی ہے۔ اور یوں فرد ذہنی لحاظ سے خود کو غیر جنسیت کے لیے تیار نہیں پاتا۔ اس صورت میں وہ طفلانہ جنسیت کی ان کیفیات کو اپنا لیتا ہے جو خود جنسیت اور ہم جنسیت سے وابستہ ہیں۔ اس صورت میں وہ عورتوں سے متنفر ہوگا اور جنسی آسودگی کے لیے جلق یا عملی ہم جنس پرستی سے کام چل جاتا ہے۔

دراصل ہوتا یہ ہے کہ بعض دفعہ طفلانہ جنسیت سے وابستہ کیفیات پوری طرح سے لاشعور میں نہیں دبائی جا سکتیں اور کیونکہ دباؤ نامکمل اور ناکافی ہوتا ہے اس لیے وہ شعور میں آنے کے لیے موقعہ کی منتظر ہوتی ہیں۔ جوں ہی کوئی خاص واقعہ ہوا تو یہ فوراً اس واقعہ سے پیدا شدہ تاثرات کی آڑ لے کر شعور پر قابض ہو جاتی ہیں اور فرد کو اپنے رنگ میں رنگ کر بالکل پھر بچپن کی طرف لوٹا دیتی ہیں۔

۳۔ انتقال

یہ وہ صورت ہے جس میں جنسی جذبہ اپنے اظہار کے لیے ایسے بے ضرر ذرائع اختیار کرتا ہے کہ جنس ان چیزوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جن کا بظاہر ان سے کوئی تعلق ہی نہیں معلوم ہوتا، اور یوں شعور مطمئن رہتا ہے کہ اس نے جنسی جذبات کو دبا رکھا ہے لیکن اسے علم نہیں ہوتا کہ بدل کر فقیروں کا بھیس ان جذبات نے انتقال کے ذریعہ اسے کس خوبی سے دھوکہ دیا ہے۔ ایک عورت جسم کی نمائش نہیں کر سکتی کیونکہ جنسی اعضا کی نمائش کو مذموم گردانا جاتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے لب گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک سے رنگ لیتی ہے۔ یا وہ استاد جو اپنی بیوی کو جنسی تسکین نہیں دے سکتا اور اس ناکامی کی شرم اور اپنے اعصابی تناؤ کو دور کرنے کے لیے بے چارے شاگردوں پر ڈنڈے برساتا ہے (ڈنڈے اور عضو تناسل کی مشابہت قابل غور ہے) یا افسر گھر کی ناخوشگواریوں کا ماتحتوں سے بدلہ لیتے ہیں۔

انتقال کی ایک اور قسم بھی ہے جسے اشیاء پرستی کہتے ہیں، جب فرد کے لیے کوئی مخصوص شے یا محبوب کا کوئی مخصوص عضو قطع نظر اس سے کہ وہ جنسی اہمیت کا حامل ہے یا نہیں، جنسی ہیجان کا باعث بن کر باعث آسودگی ہو تو اسے اشیاء پرستی کہیں گے۔ بالوں کی لٹ، رومال، جوتی، انگیا، زیر جامے اور اسی نوع کی دیگر چیزیں جنسی تسکین کا باعث بنتی ہیں۔ انتہا پسندانہ صورت میں فرد کی آسودگی کا انحصار ہی اس مخصوص شے پر رہ جاتا ہے اور یوں وہ جنسی تسکین کے لیے فریق مخالف کے وجود سے بے نیاز ہو کر صرف شے سے ہی تسکین یاب ہو جاتا ہے۔ تب یہ بھی کجروی کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اب جنس کا تصور صرف اس شے تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور اس شے کا اس کے محبوب کی ملکیت ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۴۔ کجروی

اس کی سیدھی سادی تعریف یہ ہے کہ جب فرد نارمل جنسی زندگی سے ہٹ کر غیر جنسی مقاصد کو اولیت دے کر کے آسودگی حاصل کرے تو یہ کجروی ہوگی۔

جب فرد کسی وجہ سے اس امر سے قطع نظر کہ یہ وجہ داخلی، جسمانی یا خارجی ماحول کی پیدا کردہ ہے ۔ غیر جنسیت سے وابستہ کارکردگی کی انجام دہی کے بیے ...

پاتا ہے تو وہ جنسی آسودگی کے لیے دیگر ذرائع اپنا لیتا ہے۔ جب جلق اور عملی ہم جنس پرستی کی وجہ سے فرد خود کو مخالف جنس سے بے نیاز محسوس کرے تو یہ بھی کجروی کے ضمن میں آجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ عُانثیت (صنفِ مخالف کے سامنے جنسی اعضا کی نمائش اور اس سے جنسی لذت) جنسی نظارہ پرستی (دوسروں کو جنسی فعل کرتے دیکھ لینے سے جنسی لحاظ سے آسودہ ہو جانا) سرقہ جنسیت (چوری سے وابستہ جنسی لذت) زلف تراشی (صنفِ مخالف کے بالوں کو تراشنے سے جنسی لذت کا اخذ کرنا بعض صورتوں میں ان بالوں کے ساتھ جلق بھی لگائی جاتی ہے) اختلاطی حیوان پرستی (جانوروں کے لمس سے جنسی لذت ہی نہیں حاصل کی جاتی بلکہ ان کے ساتھ جنسی فعل بھی کیا جاتا ہے) یہ صرف چند نمایاں قسم کی مثالیں ہیں، ورنہ کجروی کی بے انتہا قسمیں ہیں۔

یہ اور اس سے ملتی جلتی دیگر صورتوں میں فرد عام جنسی فعل سے آسودگی نہیں حاصل کر سکتا، اس لیے وہ تسکین کے دوسرے انداز وضع کرتا ہے لیکن یہاں بھی لاشعوری محرکات اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور ہر کجروفعل کے پس منظر میں طفلانہ جنسیت کے دور کا کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ یا حادثہ ضرور ہوتا ہے جس کی وجہ سے لیبیڈو کی اس سے وابستگی ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ جو فرد عُانثیت کا دلدادہ ہے اسے بچپن میں باپ نے عضوِ تناسل دکھانے پر ڈانٹا ہو۔ یا اسے کاٹنے کی دھمکی دی ہو۔ یا باپ کا مکمل نشوونما یافتہ عضو دیکھ کر اس کے ذہن میں اپنی کم مائگی کا احساس پیدا ہو گیا ہو۔ اور اب وہ اپنے عضو کی نمائش سے دنیا کو بتا دینا چاہتا ہو کہ دیکھو۔ اسے بھی دیکھو۔ کیا میں اپنے باپ سے کم ہوں۔ اس نے مجھے یہ دکھانے پر ڈانٹا تھا۔ اب دیکھتا ہوں وہ مجھے کیسے روکتا ہے۔ اس نے اسے کاٹنے کی دھمکی دی تھی۔ لو دیکھ لو میں نے اپنی متاع کو بچا لیا ہے۔ کیا ہوا اگر میرے باپ کا زیادہ نشوونما یافتہ تھا۔ اب میں بھی اس سے کسی طرح سے پیچھے نہیں رہا!

یہی حال باقی افعال کا ہے۔

نوٹ بعض ماہرین۔ جن میں ہیولاک ایلس سب سے نمایاں ہے، کسی جنسی کجروی کے قائل نہیں۔ ہیولاک ایلس نے کجرو جنسی رجحان کی وضاحت کے لیے ایک نئی اصطلاح "انحراف" وضع کی تھی۔ یعنی سیدھی شاہراہ کو چھوڑ کر ادھر ادھر پگ ڈنڈیوں پر چلنا اس کے نزدیک اگر کوئی فعل فرد کے جسم اور دماغ پر خراب اثرات نہیں ڈالتا اور اس سے معاشرہ کو نقصان نہیں پہنچتا تو وہ کجروی نہیں، بلکہ انحراف ہے۔

۵۔ ارتفاع

فرائیڈ نے اس پر بے حد زور دیا ہے۔ یہ وہ صورت ہے جس میں لیبیڈو جنسی تسکین کے لیے جنسی اشیاء کی بجائے ان چیزوں پر اپنی قوت مرکوز کر دیتا ہے جن کا جنس سے بظاہر کوئی تعلق نہیں ہوتا اور جس کے نتائج تعمیری ہوتے ہیں، جنسی تسکین کا یہ سب سے زیادہ بالواسطہ طریقہ ہے۔

جنہیں عام زندگی میں خاطر خواہ جنسی آسودگی نہ ملی۔ انہوں نے رینوار (RENOIR) اور دیگاس (DEGAS) بن کر عریاں اجسام کی مصوری میں کمال پیدا کیا مائیکل انجلو ہم جنس پرست تھا اس نے مصوری اور مجسمہ سازی میں ایک نئے دبستان کی بنیاد رکھی۔ دوستوفسکی شادی کی پہلی رات میں عارضی نامردی کا شکار ہوا اور اس کے بعد سے اس کی جنسی زندگی کجرویوں کی دلدل میں پھنسی رہی مگر اس کے ناول عالمی ادب میں لازوال مرتبہ رکھتے ہیں۔ ثناء اللہ نے بنگالی حسینہ میرا جیسی کے ناکام عشق کے ہاتھوں میراجی کا روپ دھار کر اور جلق کو اپنا شعار بنا کر ترقی پسند ادب کو آزاد نظم بخشی۔ مرزا غالب نے مغلیہ بیگم سے جذباتی وابستگی کے دوران جو فارسی غزلیں لکھیں ان میں اپنے جذبات کی گرمی اور احساسات کی تندی کو سمو دیا ہے۔ میر تقی میر نے ناکام محبت اور عارضی جنون (انہیں چاند میں محبوب کی شکل دکھائی دیتی تھی) کے بعد اردو غزل کو جو سوز و گداز دیا آج تک کوئی غزل گو شاعر وہاں تک نہ پہنچ سکا۔

یہ صرف چند مثالیں ہیں، ورنہ تقریباً ہر بڑے آدمی کی عظمت کی بنیاد کسی نہ کسی جنسی جذبہ پر استوار ملے گی۔ ویسے بھی ادیب اور فن کار جنسی لحاظ سے عموماً کمزور ہوتے ہیں اس لیے اس کمی کے پیدا کردہ ردعمل سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے وہ لوگ اپنے آپ میں ایسی خصوصیات پیدا کر لیتے ہیں کہ دوسرے ان سے متاثر ہو کر ان کی مجروح انا اور ناآسودہ جنسی جذبہ کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے رہیں۔

فرائیڈ کا خیال ہے کہ اگر ہر انسان ہی اپنی جنسی جبلت کی بہیمانہ طریقے سے تسکین شروع کر دے تو تمام معاشرہ میں انارکی پھیل جائے گی اور کوئی انسان بھی خود کو محفوظ نہ سمجھے گا۔ اس لیے معاشرہ کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے ہر فرد اپنی جنسی تسکین کے بارے میں عمومی فائدہ اور سماجی بہبود کی خاطر۔ کچھ نہ کچھ قربانی دیتا ہے جس سے کسی حد تک سماجی استحکام حاصل ہوتا ہے۔ یہ بھی ارتفاع کا عمل ہے (ویسے فرائیڈ اس قسم کے سماجی استحکام کا کوئی اتنا زیادہ قائل نہیں)

ارتفاع کا عمل بچپن ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ جب بچہ جنسی تجسس کے جذبہ کو عام معلومات کے حصول کے لیے بنیاد بنا لیتا ہے، بچے کے ذہن میں ابتدائی سوالات جنسی زندگی کے بارے میں ابھرتے ہیں۔ ہم کہاں سے آئے؟ نوزائیدہ کہاں سے ٹپک پڑا۔ گھر میں پالتو جانوروں کے جنسی فعل اور بعض اوقات ماں باپ کے جنسی فعل کے مشاہدہ سے اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کا جواب اسے جس غیر تشفی آمیز طریقے سے ملتا ہے اس سے اس کی بے چینی اور بڑھتی ہے۔ بعض دفعہ اسے ڈانٹ دیا جاتا ہے اور یوں ان سوالات کے ساتھ گناہ اور جرم کا احساس بھی جنم لے لیتا ہے اب وہ انہیں بُرا سمجھتے ہوئے لاشعور میں دبا دیتا ہے، اور ان کی بجائے عام زندگی کے بارے میں حصول معلومات کا جذبہ لے لیتا ہے۔ یہ ارتفاع کی ابتدائی صورت ہے۔

۳۔ نظریۂ خواب

فرائیڈ سے قبل

خواب ہماری زندگی کا ایسا واقعہ ہے کہ انسان کے لیے یہ قطعی طور سے ناممکن تھا کہ وہ خواب دیکھتے ہوئے بھی ان کے بارے میں کچھ نہ سوچے۔ جب ایک شخص اپنی محبوبہ سے کہتا ہے۔

"تم خواب ایسی حسین ہو"

تو اس نے گویا خوابوں کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے انسانی زندگی کے لیے ان کی اہمیت کو تسلیم کیا۔

خواب ایک ایسا واقعہ ہے جس سے مجذوب، کاہن، پیغمبر، شاعر، فلاسفر اور عاشق سبھی روشناس ہیں اور سبھی نے بقدرِ ظرف اس کی تعبیر و تشریح کرنے کی سعی کی، اور خواب جوانی کی مانند خوابی عمل کی بھی کئی طریقہ سے تشریح کی گئی ہے۔ یونانی فلاسفروں نے حیات و ممات کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی تھی، اس لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ خوابوں کے بارے میں کچھ نہ کہتے، اس کی اہمیت قدیم دور سے ہی مسلم چلی آتی ہے۔ یونانیوں اور بعض مشرقی اقوام کے لیے یہ ناممکن تھا کہ انہوں نے کسی اہم کام میں ہاتھ ڈالا ہو اور وہ بطور شگون خواب کی تعبیر نہ کرائیں۔ سکندرِ اعظم، جب

دنیا فتح کرنے کے لیے نکلا تو اس نے اپنے عہد کے ایسے تمام مشہور لوگوں کو جمع کیا جو خوابوں کی تعبیریں نکالنے میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اس طرح بائبل میں بابل کے شہنشاہ ... بخت نصر کے خواب کی جو تعبیر پیغمبر دانیال نے کی تھی وہ کئی صدیوں کے سیاسی تغیر و تبدل کے لیے پیش گوئی کا کام کر گئی۔

خدا نے حضرت یوسف کو خوابوں کی تعبیر کا خاص ملکہ عطا کیا تھا۔ چنانچہ قید خانہ میں انہوں نے اپنے دو ساتھیوں اور بعد میں فرعون کے خواب کی جس انداز سے تشریح کی وہ داستان سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔

یونان میں کاہنوں اور بعد میں اکثر مذہبی پیشواؤں نے خواب کو آسمانی طاقتوں سے وابستہ کر کے اسے مستقبل کی طرف ایک اشارہ قرار دیا۔ اگر کسی نے اسے آسمانی طاقتوں سے منسوب نہ کیا تو اس نے اسے ارواح خبیثہ اور شیطانی طاقتوں کا کارنامہ قرار دیا بہر حال زمانہ قدیم ہی میں نہیں بلکہ آج میزائل کے دور میں بھی خوابوں کا کسی نہ کسی حد تک مافوق الفطرت طاقتوں سے رشتہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

بیپوقریطس (HIPPU CRATES) نے غالباً سب سے پہلے خوابوں اور انسان کی بعض بیماریوں کے تعلق پر بحث کی، اس کا خیال ہے کہ جب انسانی جسم خوابیدہ ہوتا ہے تو روح بیدار ہوتی ہے اور ہر اس جگہ جاتی ہے جہاں جسم جا سکتا تھا وہ ہر اس چیز کو دیکھتی، چھوتی اور پہچانتی ہے، جسے عالم بیداری میں جسم چھو، دیکھ اور پہچان سکتا تھا۔ بالفاظ دیگر خواب میں روح وہ سب کچھ کر سکتی ہے جو عالم بیداری میں جسم کر سکتا تھا۔

افلاطون نے اپنی REPUBLICK میں خوابوں پر جو تفصیلی بحث کی ہے اس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اور فرائیڈ کے نظریات میں ایک گونہ مماثلت ملتی ہے۔ بقول افلاطون:

"جب روح کا وہ حصہ سو جاتا ہے جو عقلیت کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ طاقت بھی رکھتا ہے اور جو غیر اخلاقی روح کا آقا ہوتا ہے، ادھر روح کا وہ حصہ جو بہیمیت اور وحشت سے عبارت ہے کیونکہ کھا پی کر اور تشنگی بجھا کر آسودہ ہو چکا ہوتا ہے، اس لیے وہ شاداں و فرحاں ہو کر نیند کو تو بھگا دیتا ہے اور اب وہ باہر آ کر کھل کھیلتا ہے اس حالت میں اس سے جو کچھ بھی ہو جائے وہ بعید نہ ہوگا۔ کیونکہ اب اس پر شرم و حیاء کا پہرہ نہیں اس لیے وہ بے باک اور [illegible] انتشار پسند ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں یہ بہ آخر عقل سے — خواہ وہ اپنی ماں سے ہی کیوں نہ ہو — پرہیز نہ کرے گا، نہ ہی اسے کسی اور کا، دیوتا، انسان یا جانور کی تخصیص نہیں — لحاظ نہیں رہتا۔ یہ قتل کر دینے سے بھی نہ جھجکے گا نہ ہی اور کسی طرح کی بُرائی سے احتراز کرے گا — قصہ مختصر — اس حالت میں اس سے حماقت اور بے شرمی پر مبنی تمام افعال و حرکات سرزد ہو سکتی ہیں"

اس کے علاوہ افلاطون کے مکمل نظریۂ خواب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی دبائی گئی خواہشات کے فتور اور ان کی آسودگی، ہیجانہ تمنیات اور محتسب کے وجود پر یقین رکھتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا انداز فکر بالکل فرائیڈ ایسا تھا۔

ارسطو نے اپنی تحریروں میں جس انداز سے خوابوں پر بحث کی اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے نزدیک یہ کوئی مابعد الطبیعاتی مسئلہ نہیں بلکہ ایک نفسیاتی وقوعہ ہے اس نے اس نظریہ کو مسترد کر دیا تھا کہ خواب دیوتاؤں کی پیغام رسانی کا ذریعہ ہیں۔ اس کے نزدیک مافوق الفطرت عناصر کے ساتھ خوابوں کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ قوانین فطرت انسانی کے تابع ہیں، اس نے خواب کو خوابیدہ شخص کی نفسی کارکردگی قرار دیا ہے اس لیے اس کے خیال میں ان سے ایک حد تک بعض بیماریوں کی تشخیص کی جا سکتی ہے۔

فلاطینس (PLOTINUS) کے خیال میں خوابوں کی تشکیل کا باعث انسانی خواہشات ہیں، وہ کہتا ہے:

"جب خواہشات حرکت میں آتی ہیں تب وہمی شبیہ (فانتسزی) پیدا ہوتی ہے اور اس صورت سے ہمارے سامنے مقصود و تمنا کو پیش کرتی ہے۔"

واضح رہے کہ فلاطینس وہ فلاسفر ہے جس نے بعد میں افلاطون کی تعلیمات پر مبنی ایک نئے دبستان فکر "نو فلاطونیت" کی بنیاد ڈالی تھی۔ اسلامی تصوف میں وحدت الوجود کے عناصر اسی کی تعلیمات کے مرہون منت ہیں۔

ان کے بعد (ARTEMIDOR OF DALOIS) دالولیس کا آرتی میڈورس — خوابوں اور ان کی تعبیر پر سب سے عظیم ترین اتھارٹی سمجھا جاتا رہا ہے ... یہ شہنشاہ ہادریان (HADRIAN) کے عہد میں تھا۔ اور غالباً دوسری صدی عیسوی کے آغاز میں اس کی ولادت ہوئی تھی۔ تعبیر خواب کے سلسلہ میں اس نے عام مشاہدہ اور تجربہ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اس عہد کے دیگر تعبیر کنندگان سے اختلاف کرتے ہوئے ایک لحاظ سے اپنے ایک علیحدہ دبستان فکر کی بنیاد ڈالی۔

فرائیڈ سے قبل ہنری برگساں کا نظریۂ خواب بے حد اہمیت رکھتا ہے برگساں ایک حد تک ہربرٹ سے متاثر تھا۔ گو برگساں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ہر خواب کسی نہ کسی (غیر واضح اور مبہم) [illegible] پیاسا ستوار ہوتا ہے لیکن اس نے زیادہ اہمیت انسان کی یادداشت کو دی۔ اس کے بقول انسان کی یادداشت ختم یا ضائع نہیں ہوتی۔ اور یوں انسان کا تمام ماضی اس کی ناقابل تقلیل یادداشت کی صورت میں محفوظ رہ جاتا ہے۔ بیداری کے عالم میں تو انہیں دبا کر رکھا جاتا ہے لیکن جوں ہی شعور خوابیدہ ہوتا ہے تو یادداشت پر مبنی خیالات و تصورات جیل کے قیدیوں کی مانند (لاشعوری) زنداں سے نکل بھاگتے ہیں اور ذہن میں اودھم مچانا شروع کر دیتے ہیں — یہی خواب ہے۔

فرائیڈ کا نظریہ

فرائیڈ کی کتاب Intrepretation of dreams نہ صرف اس کی زندگی کے عظیم ترین کارناموں میں سے سمجھی جاتی ہے بلکہ "خوابی علم" میں اسے ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ فرائیڈ کے بیٹے مارٹن فرائیڈ کا بیان ہے کہ فرائیڈ نے اپنی علمی سرگرمیوں کے بارے میں کبھی گھر میں بات چیت نہ کی تھی، لیکن جس زمانہ میں وہ اس کتاب پر کام کر رہا تھا تو اس نے سب گھر والوں سے کہہ رکھا تھا کہ وہ اسے روزانہ اپنے خواب سناتے رہا کریں۔ اس نے اس میں اپنے بھی کئی خوابوں کا تجزیہ کیا ہے۔

اس کتاب کے علاوہ اس نے تحلیل نفسی پر اپنے لیکچروں میں بھی خواب کے مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے۔

فرائیڈ نے اس نظریہ کو مسترد کر دیا کہ خواب ایک جسمانی عمل ہے اس نے اسے ایک ذہنی وقوعہ قرار دیتے ہوئے خالص نفسیاتی اصولوں پر اس کی تشریح کی۔ اس نے خواب کو "شاہراہ نفس" قرار دیا تھا۔

فرائیڈ کے نزدیک نیند فرد کی اس حالت (اور ساتھ ہی تمنا) کی غماز ہے جب وہ ماں کے رحم میں تھا اور سوتے ہوئے فرد خود کو وہ بچہ سمجھتا ہے جو اس تاریک اور نرم گرم جگہ میں دنیا کے غموں سے آزاد اس مملکت کا واحد مالک تھا۔

فرائیڈ کے نظریۂ خواب کو سمجھنے کے لیے شعور و لاشعور کی کشمکش اور دبائی گئی خواہشات کو ذہن میں رکھنا چاہیے، کیونکہ اس کا تعلیلی نظریہ انہی سے مشتق ہے۔

فرائیڈ نے ناآسودہ خواہشات کی آسودگی پر سب سے زیادہ زور دیا ہے جنگی

میں ایک مثل ہے سوئر کو شاہ بلوط کے پھل اور بطخ کو مکئی کا خواب آتا ہے اسی طرح ہمارے ان بلی کے خواب میں چھیچھڑے — خوابوں کے اس پہلو کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اس سے پہلے اس امر کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ کس طرح دباؤ کے تحت ان خواہشات کو دبا دیا جاتا ہے، جنہیں فرد "گندی" "ناموزوں" اور "گناہ" خیال کرتا ہے اس موقع پر محتسب کا ذکر ضروری ہے۔

محتسب

ناآسودہ خواہشات شعور میں آنے کے لیے جو جو جتن کرتی ہیں اور جو جو نت نئے سوانگ رچاتی اور نئے نئے روپ دھارتی ہیں، ان کا سلسلہ صرف عالم بیداری تک محدود نہیں بلکہ عالم بے داری میں تو انہیں کم ہی مواقع میسر آتے ہیں لیکن جب نیند میں جسم کے ساتھ ساتھ دن بھر کی تگ و دو کے بعد شعور بھی تھک کر حالت استراحت میں ہوتا ہے، تو ان خواہشات کے در آنے کے لیے اب گویا میدان صاف ہے — لیکن ایسا ہوتا نہیں میدان صاف ہونے کے باوجود بھی انہیں ایک دروازہ سے گزرنا ہوتا ہے، جس کے پاسبان کا نام ہے — محتسب! یہ محتسب کچھ وہی کام کرتا ہے جو ہمارے غزل گو شاعروں کے ساتھ محتسب کرتا آیا ہے۔ یعنی انہیں ہنگامہ آرائی نہیں کرنے دیتا شاعروں کا محتسب بہت سخت اور جابر قسم کا ہے اور وہ شاعروں کو پی کر عالم بدمستی میں غیر اخلاقی اور غیر مذہبی باتوں سے منع کرتا ہے۔ اس طرح یہ محتسب بھی ان خواہشات کے ابھرنے پر کڑی نظر رکھنے کے لیے شعور اور لاشعور کے درمیان کھڑا ہوتا ہے۔

فرائیڈ نے شروع شروع میں اسے خواہشات دبانے کے لاشعوری عمل کے مترادف قرار دیا تھا، مگر بعد میں یہ فوق الانا کی کارکردگی کا مظہر ٹھہرا۔ گویا فوق الانا جس خواہش کو ناپسند کرتی ہے وہ سوتے میں بھی آسانی سے شعور میں نہیں آ سکتی لیکن خواہشات بھی کچھ کم قوی نہیں ہوتیں کیونکہ اخلاقی اور مذہبی وجوہات کی بناء پر فرد ان کو دبا تو دیتا ہے لیکن بہر حال اس کے نفس کا ایک حصہ تو ان کے لیے بے تاب ہوتا ہی ہے یہاں محتسب کی اصل کارکردگی کا مظاہرہ ہوتا ہے وہ ان خواہشات کو موڑ توڑ کر ان کی صورت ایسی سیدھی سادی سی بنا دیتا ہے کہ وہ بظاہر بالکل بے ضرر اور معصوم نظر آتی ہیں محتسب کے اس عمل کو خوابی کارکردگی کہتے ہیں۔ یہ" . . . . . دراصل کیونکہ مختلف النوع ذہنی گروہ بندیوں کے باہمی ردعمل کا نام ہے اس لیے یہ نفسی انتشار کے باعث پیدا ہوتا ہے"

خوابی کارکردگی کے باعث خواہشات ایسی صورت اختیار کر لیتی ہیں کہ فرد کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ جس تمنا کو اس نے "بہیمانہ" اور "غیر اخلاقی" قرار دیتے ہوئے شعور بدر کیا تھا اس نے آسودگی کا اب ایسا ذریعہ ڈھونڈا ہے کہ جس سے اس کا نفس مطمئن رہتا ہے اور یوں ایک حد تک خواہشات کی آسودگی کے باوجود بھی فرد کے ضمیر کو اعتراض کا موقع نہیں ملتا۔

یہ ناآسودہ خواہشات عموماً جنسی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ بقول فرائیڈ:

"ایام طفلی سے ہی جنسی جبلت کو جتنا دبا کر اس کی مختلف صورتوں پر جتنی زیادہ کڑی پابندیاں عاید کی جاتی ہیں شاید ہی کسی اور جبلت کے ساتھ یہ برتاؤ روا رکھا جاتا ہو۔ ویسے کسی اور جبلت میں اتنے قوی اور شدید نوعیت کی لاشعوری خواہشات کے آثار بھی باقی نہیں رہ جاتے۔ یہی حالت نیند میں خوابوں کی تشکیل کا باعث بنتے ہیں۔ اس لیے خوابوں کی تشریح کرتے وقت ان لاشعوری الجھاؤں کو کبھی بھی نہ بھولنا چاہیے البتہ انہیں دیگر عناصر پر مبالغہ آمیز فوقیت دینے کی بھی ضرورت نہیں۔" گذشتہ صفحات میں فرائیڈ ہی کا ایک خواب درج کیا جا چکا ہے جو بظاہر اس کی ماں کی موت کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے تجزیہ سے ماں کے ساتھ جنسی فعل کی تمنا کا اظہار ملتا ہے۔

ایک اور مثال دیکھئے:

"دو عظیم الشان محلات کے درمیان ایک چھوٹا سا مکان ہے جو پیچھے کی طرف بتدریج ڈھلوان میں ہے۔ مکان کے دروازے بند ہیں۔ میری بیوی مکان کے سامنے والی گلی میں تھوڑے سے راستے تک میری رہنمائی کرتی ہوئی مجھے چھوٹے مکان کی طرف لے جاتی ہے۔ اور دروازہ کو اندر کی طرف دھکا دے کر کھولتی ہے اس کے بعد میں بڑی آسانی سے اور خاموشی سے ایک دالان کے اندر جا پہنچتا ہوں جو غیر عمودی صورت میں اوپر کی طرف ڈھلوان میں ہے۔"

فرائیڈ کی تشریح کے مطابق یہ خواب پشت سے جنسی فعل کی تمنا کا مظہر ہے دو عظیم الشان محلات سرین اور "گلی" مہبل ہے۔ "چھوٹا سا مکان" واقعی ایک مکان تھا جسے خواب دیکھنے والے نے پریگ میں دیکھا تھا۔ دراصل اس مکان کا تعلق پریگ کی ایک لڑکی سے تھا جس سے وہ خواب دیکھنے والی رات سے ایک رات قبل ملا تھا اس لڑکی نے اس میں پشت سے جنسی فعل کی تمنا بیدار کی تھی۔

دیکھئے محتسب کا کارنامہ!

ایک شادی شدہ آدمی ایک لڑکی سے ملتا ہے جو اس میں اسی نوعیت کی جنسی خواہش بیدار کرتی ہے جسے وہ برا سمجھتے ہوئے دبا دیتا ہے لیکن کیونکہ یہ خواہش قوی تھی، اس لیے جب محتسب اسے اظہار سے باز نہ رکھ سکا تو اس کی صورت اس طرح سے بدل دی کہ وہ بالکل معصوم سا خواب بن گیا۔

ایک اور مثال درج ہے:

ایک مرد اور عورت میں جنسی تعلقات تھے۔ ایک مرتبہ وہ اکٹھے ہوئے، جنسی فعل کے وقت مرد نے "عزل" کے ذریعے سے خود کو اندر منزل ہونے دیا اس رات عورت نے خواب میں سرخ ٹوپی والے ایک افسر کو اپنے تعاقب میں دیکھا۔ وہ اس کے آگے آگے بھاگی جا رہی ہے اور پھر وہ سیڑھیاں چڑھ جاتی ہے مگر افسر بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے، عورت کی سانس پھول جاتی ہے اور وہ اپنے کمرہ میں گھس کر دروازہ بند کر لیتی ہے، جب وہ دروازہ کے سوراخ میں سے باہر جھانکتی ہے تو مرد اسے بڑا اداس، غمگین اور روتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس میں سرخ ٹوپی والا افسر عضو تناسل ہے، بھاگنا، سیڑھیاں چڑھنا اور دم پھولنا یہ سبھی جنسی فعل کے مختلف مراحل ہیں، افسر کا رونا اس کا منزل ہونا ہے۔ دراصل عورت چاہتی تھی کہ منزل نہ ہو اور وہ عضو تناسل کو باہر نکال کر منزل نہ ہو لیکن قیام حمل کے خوف کی وجہ سے اس نے مرد کے ساتھ تعاون کیا، لیکن اس کی اداسی خواب میں مرد پر منتقل ہو گئی اور یوں وہ اسے ملول اور دلگیر نظر آتا ہے۔

جنسی خواہشات کے ان پہلوؤں کی جنہیں فرد بہیمانہ اور اپنے اخلاقی معیار کے منافی سمجھتا ہے — کر ختگی کو ختم کرنے کے لیے انہیں ایسی صورت دینا جو فرد کے لیے قابل قبول ہو، محتسب کا سب سے اہم فریضہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ دونوں صورتوں میں کوئی نہ کوئی ایسا تعلق بھی چھوڑ جاتا ہے کہ تحلیل پر اس کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔

خواب کا بھولنا بھی ایک حد تک محتسب ہی کی بناء پر ہے بعض افراد اپنے اخلاقی معاملات کے ضمن میں بے حد کٹر اور رجعت پسند ہوتے ہیں اس لیے ان کی محتسب اور فوق الانا بھی ہر قسم کی لچک سے عاری ہوتے ہیں۔ اس لیے بقول فرائیڈ "جب کبھی بھی خواب میں (بھولنے کی وجہ سے) رخنے محسوس ہوں تو ہم سمجھ جاتے ہیں کہ اس کا ذمہ دار محتسب ہے" کیونکہ اسے علم ہے کہ خواب دیکھنے والا کتنے پانی میں ہے اور خواہشات کے اظہار کے لحاظ سے وہ کتنے ظرف کا مالک ہے اس لیے اسے بچا

پریشانی، ندامت اور الجھن سے بچانے کے لیے وہ "معترض حصے" حذف کر جاتا ہے چنانچہ بعض اوقات تو سارا خواب ہی "بھول" جاتا ہے۔

یوں تو محتسب کی کئی لحاظ سے اہمیت ہے لیکن اس کا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ نیند خراب نہیں ہوتی ورنہ اگر یہ خواہش اپنی اصل عریاں اور کرخت حالت میں خوابوں میں چلی آتی تو لوگوں کی اکثریت ایسی ہوتی، جو راتوں کو سونے سے گھبراتی۔ اور شاید اسی لیے فرائیڈ نے خوابوں کو نیند کا نگہبان اور شبینہ چوکیدار سے تشبیہ دی تھی

خوابوں کی اقسام

جہاں تک تمام خوابوں کا تعلق ہے تو اس نے تجزیاتی لحاظ سے ان سب کی دو قسمیں بتائی ہیں۔

پہلی قسم میں وہ خواب آتے ہیں جنہیں وہ "عیاں مافیہ" کہتا ہے۔ ایسے خوابوں میں واقعات ٹھیک طرح سے دکھائی دیتے ہیں۔ محتسب کا ہاتھ بہت کم ہوتا ہے اور اس لیے دیکھنے والا انہیں بعد میں دہرا سکتا ہے۔

دوسری قسم کو اس نے "پنہاں مافیہ" کا نام دیا ہے۔ یہ وہ خواب ہیں جو دباؤ کی وجہ سے محتسب کے ہاتھوں نت نئے سوانگ رچا کر آتے ہیں اور ان ہی کی تشریح میں دقت پیش آتی ہے۔

جہاں تک ان خوابوں کی تشریح کا تعلق ہے، تو فرائیڈ کا کہنا ہے کہ "خواب دیکھنے والا ان کے معنی جانتا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ وہ یہ نہیں جانتا کہ وہ جانتا ہے۔ اس لیے وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ نہیں جانتا" اس لیے اگر انسان ذہنی کشادگی سے کام لیتے ہوئے اور تلخ حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اپنے خوابوں کا تجزیہ کرے تو وہ بھی ان کی تہہ میں پوشیدہ معانی سے آشنا ہو سکتا ہے۔

فرائیڈ نے خوابوں کی تین اقسام بیان کی ہیں۔

۱۔ تمنائی خواب۔
۲۔ تشویشی خواب۔
۳۔ تعزیراتی خواب۔

ان تینوں اقسام پر نظر ڈالنے سے بظاہر یہ اس کے اس نظریے کے متضاد معلوم ہوتے ہیں کہ تمام خواب انسانی خواہشات کی آسودگی کے لیے ہوتے ہیں کیونکہ اگر یہ سچ ہے تو پھر تشویشی اور تعزیراتی خوابوں کے کیا معنی — اور کیا وجہ ہے کہ کابوس کے بعد انسان چیخیں مارتا نیند سے بیدار ہوتا ہے۔ دراصل بنیادی طور سے فرائیڈ صرف تمنائی خوابوں کا ہی قائل ہے۔ باقی دو اقسام تو ایک لحاظ سے تمنائی خوابوں ہی کی دو مختلف صورتیں ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ اگر اوّل الذکر "مثبت" نوعیت کی ہے تو موخر الذکر "منفی" حیثیت کی حامل ہیں۔

تمنائی خوابوں کے سلسلہ میں فرائیڈ لکھتا ہے، کہ آسودگی کے لیے خوابوں میں آنے والی خواہشات صرف وہی نہیں جو عالم بیداری میں ذہن میں آتی رہتی ہیں بلکہ ان میں وہ بھی شامل ہیں جنہیں مدتوں قبل دبا دیا گیا تھا اس لیے بعض اوقات یہ... خواہشات کئی کئی سالوں بعد خوابوں میں آنے کا موقع حاصل کر سکتی ہیں وہ خواب جن میں اپنے عزیزوں اور چہیتوں کو مردہ حالت میں دیکھا جاتا ہے اس بناء پر ہوتے ہیں کہ کسی نے بچپن میں بھائی کی موت چاہی لیکن اس خواہش کو جو اتنی ہی خواب میں آنے کا موقع ملا۔ ایسے خوابوں سے پریشان ہو جانے والا دراصل اپنی پرانی خواہش کو "بھول" چکا ہوتا ہے۔ تمنائی خوابوں میں اڈیپس الجھاؤ اور ممنوعہ محرمات کے پیدا کردہ خواب کافی سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ایسے خوابوں کی اکثریت ڈھکے چھپے انداز کی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے فرد کے لیے خواب میں اپنی ماں، بہن یا چچی اور خالہ وغیرہ سے جنسی فعل شدید ہیجانی دھچکے کا موجب بن سکتا ہے۔

فرائیڈ نے ایک ایسے خواب کی مثال دی ہے:

ایک آدمی نے خواب میں دیکھا کہ اس کے ایک عورت کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں لیکن ایک اور آدمی بھی اس کے ساتھ شادی کا خواہاں ہے۔ وہ اسی وجہ سے پریشان ہوتا ہے کہ مبادا اس شخص کو اس کے تعلقات کا علم ہو جائے اور وہ اس عورت سے شادی کا ارادہ ترک کر دے، اس لیے وہ اس آدمی کے ساتھ بڑا مشفقانہ سلوک کرتا ہے۔ اس آدمی کے ساتھ بغل گیر ہو کر اس کا بوسہ لیتا ہے۔

تحلیل پر یہ خواب باپ کے ساتھ "تعارض" قابت کے جذبات کی غمازی کرتا ہے لیکن محتسب نے اس خواہش کو ایسے انداز سے پیش کیا کہ خواب دیکھنے والا اس شکر کی وجہ سے گولی کی کڑواہٹ کو فراموش کر جاتا ہے۔

بعض اوقات تمنائی خواب ایسے ہوتے ہیں کہ ایک لحاظ سے وہ مستقبل کے لیے اشاریہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ کمسن نورما جین بیکر (NORMA JEAN BAKER) جس گھر میں رہتی تھی وہ سخت اور کٹر قسم کے مذہبی لوگ تھے، اسے گرجا میں ان کے ساتھ باقاعدگی سے جانا پڑتا اور دن رات گناہ کے عذابوں اور جہنموں کا ذکر سنایا جاتا تھا۔ اس کمسن لڑکی نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ وہ گرجا میں اس حالت میں کھڑی ہے کہ اس کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں ہے، تمام لوگ اس کے قدموں میں لیٹے ہوئے تھے۔ وہاں منقلوب اجسام پر سے گزرتی جاتی ہے لیکن اتنی احتیاط ضرور ملحوظ رکھتی ہے کہ اس کے پاؤں کسی کے اوپر نہ پڑیں۔

اور ۳۵ سالہ مارلین منرو آج بھی اس خواب کو نہیں بھول سکی۔ گو ان لوگوں نے اس سے یہ عہد کروا لیا تھا کہ وہ تمام عمر نہ تو کبھی قسم کھائے گی اور نہ ہی سگریٹ اور شراب کو ہاتھ لگائے گی، لیکن وہ ہر وہ چیز کرنا چاہتی تھی جس کا مشاہدہ وہ گرد و پیش میں کرتی تھی۔ گرجا میں عریاں حالت میں جانے سے اس نفرت کا بھی اظہار ہوتا ہے جو وہ شعوری طور سے ظاہر نہ کر سکتی ہو گی اور اس نے عریاں حالت میں جا کر گرجا کو ناپاک کر کے اس کا اظہار کیا۔

آج مارلین منرو کو World's most electrifying woman اور امریکہ کا Sex Symbol قرار دیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں یہ ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ ایک مرتبہ فاقہ کشی سے مجبور ہو کر اس نے ۵۰ ڈالر کے لیے دو عریاں تصاویر اتروائیں۔ فوٹو گرافر نے سینکڑوں ڈالر کے نفع پر وہ تصویریں ایک کیلنڈر کمپنی کو فروخت کیں جس نے ان کے کیلنڈروں سے لاکھوں ڈالر کمائے

تشویشی خوابوں میں فرد خود کو بلندی پر سے گرتا ہوا، اڑتا ہوا، تیرتا اور پھرتا ہوا محسوس کرتا ہے بعض اوقات اجنبی رکاوٹوں سے دوچار ہوتا ہے کبھی کبھی وہ خود کو دوسروں کے سامنے عریاں حالت میں دیکھتا ہے بعض اوقات موت کے خواب بھی اسی زمرہ میں شامل کئے جاتے ہیں۔ فرائیڈ کے عریانی کے خوابوں کو "نمائشی خواب" قرار دیا ہے تشویشی خوابوں کے سلسلے میں یہ اساسی نکتہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ گو لاشعور میں دبائی گئی خواہشات کی اکثریت جنسی نوعیت کی ہوتی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی بعض ناخوشگوار اور تلخ یادیں لاشعور میں دبائی جاتی ہیں محتسب کا کام ہے کہ وہ کسی طریقہ سے شعور کو ان سے محفوظ رکھے لیکن بعض اوقات یہ واقعات اثرات کے اعتبار سے اتنے شدید ہوتے ہیں کہ محتسب بے چارہ منہ دیکھتا رہ جاتا ہے اور یہ واقعات اسی تندی اور خوفناک صورت میں خوابوں میں آ دھمکتے ہیں۔

خوابی کارکردگی کا مقصد بھی ناخوشگوار واقعات کو خوابوں میں ایسی صورت سے پیش کرنا ہوتا ہے کہ وہ اپنی شدید نوعیت سے عاری ہو کر اظہار بھی پا لیں اور اس سے شعور کو تکلیف بھی نہ ہو۔ جب واقعات بہت زیادہ شدید ہوں تو پھر خوابی کارکردگی بے بس ہو کر اپنے وظائف کی حسب دلخواہ ادائیگی نہیں کر سکتی اور یوں نتیجہ میں پریشان کن اور ڈراؤنے واقعات خوابوں میں آتے ہیں۔ فرائیڈ کا کہنا ہے کہ ایسے واقعات دراصل اپنی اصل صورت میں بہت

زیادہ اذیت دہ ہوتے ہیں اور یوں خوابوں میں کم اذیت دہ صورت میں اگر یہ ایک حد تک اس لاشعوری تناؤ کو کم کرنے کا موجب بنتے ہیں جو عدم اظہار کی صورت میں ان واقعات کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔

تشویشی خوابوں کا اگر ژرف نگاہی سے جائزہ لیا جائے تو ان سے بھی ایک حد تک آسودگی کا پہلو نکلتا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ اس کی حیثیت منفی ہوتی ہے یہ تو ظاہر ہے کہ خواب دیکھنے والے نے جو خواہشات دبا رکھی ہیں وہ اس کے نزدیک بہیمانہ اور غیر اخلاقی ہوتی ہیں اگر وہ ان کی آسودگی چاہتا تو ان کے دبانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ ان خواہشات کی ناآسودگی میں ہی اس کی بہبود مضمر ہے۔ اور یوں وہ کام جو محتسب نے کرنا تھا اس کی جگہ اب تشویش لے لیتی ہے۔ تشویش کا مطلب بھی یہ ہے یہ خواہش اتنی قوی تھی کہ محتسب اسے اپنی گرفت میں نہ لے سکا اس لیے جنسی تشویش کا مظاہرہ ہمارے خوابوں میں ہوتا ہے۔۔۔ یہ وہ تشویش ہے جو اپنی خواہشات کی تندہی اور قوت کی بنا پر محسوس کی جاتی ہے۔"

تشویشی خوابوں میں کیونکہ عام طور پر محتسب اور خوابی کارکردگی کا عمل دخل نہیں ہوتا اس لیے فرد نے جن بہیمانہ خواہشات کو دبایا تھا وہ اسی بہیمانہ صورت سے خوابوں میں بلا واسطہ طور سے آدھمکتی ہیں اور یوں فرد پریشان ہو جاتا ہے۔

فرائیڈ نے ایک اور جگہ ان کے بارے میں یوں لکھا ہے:

"جب دبائی گئی خواہشات کا بوجھ بہت زیادہ بن جاتا ہے تو تشویش ان ذریعوں میں سے ایک ہے جن سے انا خود کو اس بوجھ سے نجات دلاتی ہے، جب خواب میں ناآسودہ خواہشات اپنی آسودگی میں انتہا سے زیادہ بڑھ جاتی ہیں تو انا کو یہ کام کرنا پڑتا ہے اس لیے ان کی تشریح آسان ہے۔"

تعزیراتی خوابوں کو بھی تشویشی خوابوں کے سلسلہ کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے۔ اس صورت میں لاشعوری خواہشات کی آسودگی نہیں ہوتی بلکہ ان گندی اور ناپاک خواہشات کی بنا پر فوق الانا فرد کو سزا دیتی ہے بقول فرائیڈ:

"یہ امر ذہن نشین رہے کہ ذہنی زندگی میں اذیت پرستانہ رجحانات موجود ہوتے ہیں اور یہ ان ہی کی بدولت ہوتا ہے اس لیے مجھے ایسے خوابوں کو تعزیراتی خواب قرار دینے میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا۔ انہیں تمنائی خوابوں سے ممیز کرنا چاہیئے۔"

اس کے بعد اگلے صفحہ پر اس نے حاشیہ میں یہ لکھا ہے:

"جب سے تحلیل نفسی نے انا اور فوق الانا کی صورت میں شخصیت کا تجزیہ کیا ہے۔۔۔۔ تو اب آسانی سے تعزیراتی خوابوں کو فوق الانا کی آسودگی قرار دیا جا سکتا ہے۔"

عام تمنائی خوابوں کا مواد ان لاشعوری خواہشات سے عبارت ہوتا ہے جو فرد نے دبا دی تھیں۔ تعزیراتی خوابوں میں بھی لاشعور کا ہاتھ ہوتا ہے لیکن اس کا مواد دبائی گئی خواہشات کی بجائے انا مہیا کرتی ہے۔ اس صورت میں فرد گویا ان بہیمانہ اور غیر اخلاقی خواہشات کا کفارہ ادا کرتا ہے، ہر مذہب اور نظام اخلاق میں گناہ کے لیے تعزیر اور کفارہ کا تصور موجود ہے۔ تعزیراتی خواب بھی اسی اخلاقی پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں۔ فوق الانا سزا دہی کے بعد مطمئن ہو جاتی ہے اور یوں ذہنی سکون درہم برہم نہیں ہوتا اور فرد کی شخصیت انتشار پذیری سے بچ جاتی ہے۔

خوابوں کی تشریح و تحلیل

خوابوں کی تشریح کے ضمن میں یہ حقیقت نہ فراموش کی جانی چاہیئے کہ خواب کو جس طرح سے یاد کیا جاتا ہے وہ قطعی طور سے حقیقت نہیں ہوتی بلکہ اصل حقیقت کے لیے بگاڑی اور مسخ شدہ متبادل چیز ہوتی ہے۔۔۔۔ اگر ہماری یادداشت صحیح نہیں تو اس کا مطلب ہے وہ بگاڑی اور مسخ شدہ متبادل چیز اور بھی زیادہ الجھ گئی ہے ۔۔ اور یہ بگاڑ اپنی جگہ کسی مقصد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔"

اس لیے خوابوں کی تحلیل و تشریح کا عمل بے حد ادق اور پیچیدہ ہے۔ مریض خواب سناتا ہے اس کے بعد ایک ایک جملے اور لفظ سے وابستہ خیالات و تصورات کی تحصیل کی جاتی ہے عمل تحلیل میں مریض کا تعاون از حد ضروری ہے اسی لیے بعض اوقات چند سطروں کے خواب کی تحلیل و تشریح پر گھنٹوں صرف ہو جاتے ہیں۔ فرائیڈ نے او رینک (O. RANK) کی مثال دی ہے جس نے ۷۰ صفحات پر دو خوابوں کی تحلیل کی جبکہ یہ خواب صرف دو صفحوں پر مشتمل تھے۔

فرائیڈ نے خوابوں کی تحلیل و تشریح کے لیے مندرجہ ذیل تین قوانین وضع کئے ہیں۔

۱۔ "خواب کے ظاہری مفہوم سے کبھی نہ دھوکا کھانا چاہیئے خواہ وہ خواب کتنا ہی کیوں با معقول اور شائستہ کیوں نہ ہو۔ بعض خواب بڑے منطقی اور "معصوم" قسم کے معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ بھی لاشعور کی ایک چال ہوتی ہے۔

۲۔ تحلیل کرنے والے کو خواب کے ہر ٹکڑے کے لیے متبادل تصورات بیدار کرنے چاہئیں اسے ان پر اس لحاظ سے غور نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ کسی نظریہ پر منطبق ہوتے ہیں کہ نہیں کیونکہ بعض عمومی خصوصیات کے اشتراک کے باوجود بھی ہر فرد کا خواب اس کی انفرادیت اور شخصیت کی اتھاہ گہرائیوں کا ترجمان ہوتا ہے، اس لیے اس بات سے پریشان نہ ہونا چاہیئے کہ خواب کے مختلف ٹکڑوں سے وابستہ متبادل تصورات خواب کے ظاہری مفہوم سے دور لے کر جا رہے ہیں۔

۳۔ لاشعور میں خفتہ یادوں کو بیدار کرنے کے لیے ہر ممکن احتیاط اور صبر و تحمل سے کام لینا چاہیئے۔

اشاریت

خوابوں کی تشریح کے ضمن میں فرائیڈ نے خوابوں کی اشاریت پر بے حد زور دیا ہے، خوابوں میں بعض اشیاء ایسی ہیں جو اشاراتی انداز کی حامل ہیں۔ اس لیے اگر تحلیل کرنے والا ان کے مفہوم سے آشنا ہو تو خواب دیکھنے والے سے کسی قسم کے سوالات کئے بغیر ہی خواب کی تشریح کی جا سکتی ہے۔"

فرائیڈ نے خود تسلیم کیا ہے کہ خوابوں میں اشاریت کو دریافت کرنے والا وہ خود نہیں بلکہ کے۔ اے۔ شرینر (K.A. SCHERNER) ہے۔ گو فرائیڈ نے اس کے بعض پہلوؤں سے اختلاف کرتے ہوئے اس میں کچھ ترامیم کیں لیکن اساسی لحاظ سے اشاریت کا نظریہ شرینر کا مرہون منت ہے۔

خوابوں میں جن چیزوں اور اشیاء کا اظہار اشاراتی انداز سے ہوتا ہے۔ ان کی تعداد کچھ ایسی زیادہ نہیں بحیثیت مجموعی انسانی جسم، والدین، بچے، بھائی، بہن، پیدائش، موت، عریانی وغیرہ ہی نمایاں نمایاں رہتے ہیں۔ شرینر کے نزدیک انسانی جسم ایک گھر کے روپ میں آتا ہے۔ جب اس گھر کی دیواریں ہموار ہوں تو یہ مرد کا جسم ہے لیکن اگر اس میں چھجے اور بالکنیاں یا ایسی چیزیں ہوں جن کو پکڑا جا سکے ــ تو یہ عورت کا جسم ہے والدین بادشاہ اور ملکہ کے روپ میں آتے ہیں۔ امریکہ میں یہ صدر یا گورنر بھی بن جاتے ہیں علاوہ ازیں یہ دیگر اعلیٰ عہدہ داروں کا روپ بھی دھار سکتے ہیں۔ بچے اور بھائی بہن، کیڑے مکوڑوں اور بعض چھوٹے چھوٹے جانوروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، پیدائش کو لازمی طور سے پانی کے ذریعہ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ سفر اور مواصلات کے دیگر ذرائع موت کے مظہر ہیں جبکہ کپڑے اور وردیاں عریانی کے لیے آتے ہیں۔

یہ وہ اشارات ہیں جو عمومی نوعیت کے ہیں اور ہمیشہ ایک مخصوص تصور کے لیے ہی آتے ہیں، انہیں فرائیڈ نے محفوظ اشارات کہا تھا۔

اس کے علاوہ اشارات کا جنسی پہلو بھی ہے، بلکہ درحقیقت محتسب کو یہ اشارات محض اس لیے وضع کرنا پڑتے ہیں کہ فرد جنسی اعضاء کے تصور کو برا سمجھتا ہے اسی لیے ہر اشارہ کی تہ میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی جنسی خواہش نکلتی ہے۔

مردانہ عضوِ تناسل کے لیے بہت سے اشارات ہیں — تین کا عدد مکمل عضو کی نمائندگی کرتا ہے، جبکہ صرف ذکر کے لیے وہ تمام چیزیں اشارات کا کام دے سکتی ہیں جو سیدھی اور ایستادہ حالت میں ہوں۔ مثلاً چھڑی، کھمبا، چھتری، درخت وغیرہ۔ جب اس عضو کی جنسی کارکردگی مراد ہو تو ہر وہ چیز جو جسم میں داخل ہو کر اسے مجروح کر سکے اس کی نمائندگی کر سکتی ہے جیسے چاقو، چھری، خنجر، نیزہ وغیرہ۔ اسی طرح آتشیں اسلحہ مثلاً بندوق پستول وغیرہ یا پھر جن چیزوں سے پانی دھار کی صورت میں نکلتا ہو وہ بھی مردانہ عضوِ تناسل کی نمائندگی کر سکتی ہیں۔ حیوانات میں سے سانپ اور مچھلی بھی اس کا اشاراتی انداز ہے

زنانہ عضوِ تناسل کے لیے وہ تمام اشیاء آ سکتی ہے جن کو یا تو بند کیا جا سکے یا ان میں کسی دوسری شئے کا دخول یا سمائی ممکن ہو۔ مثلاً گڑھے، غار، کھائی، خندق، مرتبان، بوتل ٹوکری، صندوق، جہاز۔ بعض اشارات، جیسے کمرہ، سٹوو، کپ بورڈ صرف رحم کے لیے مخصوص ہیں۔ دروازہ، کھڑکی اور منہ، جسم کے دہانہ کے لیے آتے ہیں۔ گھونگھا، سیپ گرجا وغیرہ، عورت کے لیے اور سیب، شفتالو اور دیگر پھل چھاتیوں کے لیے آتے ہیں مرد اور عورت دونوں کے موئے زہار جنگل، جھاڑیوں اور گھاس کا روپ دھار لیتے ہیں اس طرح پھول، غنچے اور کلیاں بھی عورت (خصوصیت سے دوشیزہ) کے اعضائے تناسل کی نمائندگی کرتے ہیں۔

جنسی فعل کے لیے چال ایک مخصوص قسم کی علامت ہے۔ علاوہ ازیں چھرا گھونپنا، سرکش گھوڑے پر سواری، سیڑھیاں چڑھنا، کشتی چلانا، مکان پر چڑھنا، لہروں کے تھپیڑوں سے کشتی کا ڈولنا، چھوڑوں کی آواز اور حرکات وغیرہ سبھی جنسی فعل کے لیے اشارات ہیں۔

بعض اوقات عضوِ تناسل چھوٹے بچے کی شکل اختیار کر لیتا ہے اس صورت میں اس کے ساتھ کھیلنا یا اسے پیٹنا جلق کا اشارہ ہے۔

گنجاپن، بال ترشوانا یا ان کا گرنا، دانت ٹوٹنا یا گردن زدنی — یہ سب عضوِ تناسل کھونے کے خوف کی نشان دہی کرتے ہیں۔

بعض اوقات تیرنا، موجوں سے کھیلنا وغیرہ۔ پیشاب سے جنسی دلچسپی کا مظہر ہوتا ہے چنانچہ وہ لوگ جو بچپن میں سوتے میں پیشاب کر دیا کرتے تھے انہیں ایسے خواب بکثرت آتے ہیں۔

آئیے اب ان اشارات کی روشنی میں بعض خوابوں کا جائزہ لیں۔

۱۔ ایک ۳۵ سالہ شخص نے فرائیڈ کو وہ خواب سنایا جو اس نے ۴ برس کی عمر میں دیکھا تھا۔ وہ تین برس کی عمر میں یتیم ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جس وکیل کے پاس اس کے باپ کی وصیت تھی وہ دو بڑی بڑی ناشپاتیاں لے کر آتا ہے۔ ان میں سے ایک تو اسے دے دی گئی لیکن دوسری کو کمرہ کی کھڑکی پر رکھ دیا گیا — اس کی تحلیل یوں ہوں گی:

دو بڑی بڑی ناشپاتیاں اس کی ماں کی چھاتیاں تھیں۔ کھڑکی چھاتیوں کے ابھار کو ظاہر کرتی ہے۔ واضح رہے کہ اس نے ماں کا دودھ کافی سے زیادہ مدت تک پیا تھا۔ اس خواب میں اس نے دوبارہ دودھ پینے کی تمنا کا اظہار کیا ہے۔

۲۔ یہ ایک لڑکی کا خواب ہے:

وہ اپنے مکان کے ہال میں سے گزر رہی تھی کہ اس کا سر ایک نیچے لٹکتے جھاڑ کے ساتھ اس زور سے ٹکرایا کہ وہاں سے خون نکل آیا۔ جب اس سے اس کے بارے میں سوالات کئے گئے تو وہ اس پر کوئی خاص روشنی نہ ڈال سکی، لیکن اس کی ایک بات نے تمام عقدہ کھول دیا "میرے بال بہت تیزی سے جھڑ رہے ہیں۔ اس پر میری ماں نے کہا، اگر بال یونہی گرتے رہے تو جلد ہی تمہارا سر تمہارے چوتڑوں ایسا صاف ہو جائے گا۔" اس سے خواب کا مطلب بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ لڑکی کا سر اس کے جسم کے نچلے حصّہ کی نمائندگی کرتا ہے جبکہ جھاڑ مردانہ عضوِ تناسل ہے۔ سر سے خون کا بہنا جنسی فعل کا غماز ہے، مزید استفسار پر پتہ چلا کہ اس لڑکی کے خیال میں مرد سے جنسی فعل کے بعد سے حیض کا خون جاری ہوتا ہے، مجموعی لحاظ سے یہ خواب جنسی فعل کی تمنا کا اظہار ہے۔

۳۔ ایک مرد نے خواب میں دیکھا کہ اس کی بہن کے ساتھ اس کی دو سہیلیاں ہیں اس نے ان دونوں کے ساتھ تو ہاتھ ملایا مگر اپنی بہن کے ساتھ مصافحہ نہ کیا۔ اسے اس خواب کے ضمن میں کوئی واقعہ نہ یاد آ رہا تھا، پھر اچانک اسے یاد آیا کہ اس نے ایک مرتبہ یہ سوچا تھا کہ لڑکیوں کی چھاتیوں میں اتنی دیر بعد ابھار کیوں آتا ہے اس سے مفہوم واضح ہو گیا۔ دو سہیلیاں اس کی بہن کی چھاتیاں ہیں وہ انہیں اپنے ہاتھوں میں لینا تو ضرور چاہتا ہے لیکن وہ کیونکہ اس کی بہن کی چھاتیاں ہیں اس لیے وہ اپنی بہن سے خواب میں ہاتھ نہیں ملاتا۔

۴۔ تحلیل نفسی

نائجیل واکر کے بقول فرائیڈ سے پہلے مسمر، شارکو اور برنہیم (BERNHEIM) کے طریق ہائے علاج سے ایک حد تک یہ واضح ہو چکا تھا کہ اگر مریض معالج سے کھل کر باتیں کرے تو بعض صورتوں میں اعصابی خلل میں تدریسے اضافہ ہو سکتا تھا۔

دل ڈوراں کے بقول افلاطون نے خوابوں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے (اوّلیں افلاطون کے متذکرہ اقتباس کا حوالہ دیا جا چکا ہے) وہ تحلیل نفسی پر اوّلیں قرار دیئے جا سکتے ہیں سلہ لیکن ان سب کی حیثیت محض تبرک ایسی ہے۔ اگر تحلیلِ نفس میں کسی کو فرائیڈ کا پیشرو کہا جا سکتا ہے تو وہ جوزف بریئر ہے، بلکہ بقول ہے جوزف جاسٹرو:

"سگمنڈ فرائیڈ نے جس عمارت کی تعمیر کی اس کا سنگ اساس جوزف بریئر نے ہی رکھا تھا"

فرائیڈ نے خود بھی بریئر کے اثرات کو تسلیم کیا ہے جب ۱۹۱۰ء میں اس نے اپنے دورۂ امریکہ کے دوران کلارک یونیورسٹی میں تحلیل نفسی پر ۵ لیکچر دیئے تو اس نے اس کے آغاز پر روشنی ڈالتے ہوئے بریئر کے اثرات کا اعتراف کیا۔

۸۲ — ۱۸۸۰ء کے دوران بریئر کے پاس ۲۱ سالہ اینا او (ANNA.O) کو لایا گیا، یہ لڑکی بے حد ذہین تھی۔ اور دو سالہ بیماری کے دوران میں وہ کئی ذہنی اور جسمانی عوارض کی شکار بن چکی تھی۔ وہ بیک وقت بعض اعضاء کے فالج اور بے حسی کا شکار تھی۔ آنکھوں کی حرکت اس کے لیے مشکل تھی، نظر میں کافی خرابی پیدا ہو گئی تھی وہ سر کو سیدھا نہ رکھ سکتی تھی، خوراک کھاتے وقت اسے کراہت سی محسوس ہوتی تھی۔ اور ایک دفعہ تو کئی ہفتوں تک وہ شدید پیاس کے باوجود بھی پانی نہ پی سکتی۔ اس کی قوت گویائی میں بھی ایک حد تک کمی آگئی تھی اور بعد میں تو یہ حالت ہو گئی کہ اس کے لیے اپنی مادری زبان کا سمجھنا اور بولنا ناممکن ہو گیا تھا۔ بعض اوقات اس کی تمام شخصیت کا محور جیسے بدل کر رہ جاتا اور وہ کچھ اور ہی بن جاتی۔

یہ ہسٹریا کی مریض تھی:

مرض کے آثار اس وقت سے ظاہر ہو چکے تھے جب وہ اپنے باپ کی طویل بیماری میں تذبذب اور تشویش کے عالم میں اس کے سرہانے بیٹھی تیمارداری کرتی رہتی۔

بریئر نے تنویم وغیرہ کے ذریعہ سے اس کے علاج کی کوشش کی لیکن بات جتنی

نظر نہ آئی۔ البتہ اس نے یہ محسوس کیا کہ جب مریضہ اس سے اپنی بیماری کے موضوع پر گفتگو کرتی تو وہ قدرے افاقہ محسوس کرتی۔ وہ مذاق سے اسے "چمنی کی صفائی" کہا کرتی تھی اور اس قسم کے علاج کو اینا نے "گویائی شفا" کا نام دیا۔

لیکن اینا نے جو "اصطلاح" مذاقاً وضع کی، ایک لحاظ سے تحلیل نفسی کی بنیاد اسی پر استوار ہے۔

فرائڈ اور بریئر نے اس نکتہ کو مرکز تحقیق بنا کر مریضوں پر اس کی آزمائش شروع کر دی اور دونوں نے اپنے نتائج کو ۱۸۹۴ء میں On the mechanism of hysterical symptoms کے نام شائع کیا گویائی شفا کے لیے انہوں نے "تزکیہ" کی اصطلاح وضع کی، اسے "ذہنی کھر پیچ" بھی کہتے ہیں۔

فرائڈ کو تنویم کا طریقہ اتنا پسند نہ تھا اور اس نے محسوس کیا تھا کہ بعض مریضوں کے حق میں تو یہ طریقہ بالکل ناکام رہتا تھا اس لیے اس نے بریئر کے تزکیاتی طریقہ کو اپنا کر اپنے مریضوں پر اس کے تجربات کرنے شروع کر دیئے اور جلد ہی اطمینان بخش نتائج نے اسے اس کی افادیت کا احساس کرا دیا۔

مجموعی لحاظ سے تحلیل نفسی کے طریق کار کی دو اقسام —

طریق کار

تلازمی اور خوابی — قرار دی جا سکتی ہیں۔

۱۔ تلازم خیالات: اس صورت میں مریض کو ایک آرام دہ بستر کوچ یا آرام کرسی پر لٹا دیا جاتا ہے۔ معالج اس کے قریب بیٹھ جاتا ہے اور اسے آغاز کے لیے کوئی لفظ دے کر کہا جاتا ہے کہ اس سے وابستہ جو جو خیالات اور تصورات اس کے ذہن میں وارد ہوتے جائیں وہ انہیں — ان کے غیر اخلاقی اور بیہودہ پہلوؤں سے قطع نظر — ایمان داری سے بیان کرتا جائے اس طریقہ کی بنیاد شعور و لاشعور کی کش مکش کے نظریہ پر استوار ہے، ظاہر ہے کہ شعور لاشعور سے ان خیالات اور تصورات کا اخراج پسند نہیں کرتا جسے اس نے ناپسندیدہ اور ناخوشگوار سمجھ کر بارہ پتھر نکال باہر کیا ہے۔ اندرونی کش مکش کی بناء پر خیالات کی رکاوٹ کے عمل کو "مزاحمت" کا نام دیا جاتا ہے۔

مزاحمت کی صورت میں معالج مریض کو مزید اکساتا ہے اس کی ہمت افزائی کر کے اس میں اعتماد پیدا کرتا ہے اور یوں وہ معالج کی امداد سے اندرونی مزاحمت پر قابو پا لیتا ہے اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے، حتیٰ کہ تمام لاشعوری الجھاؤ شعور میں آجاتے ہیں۔ اور جب مریض کو وجہ کا علم ہو جاتا ہے تو بیماری کے آثار رفع ہو جاتے ہیں۔

فرائڈ نے ایک نوجوان لڑکی کی مثال دی ہے، اسے اپنے بہنوئی کے ساتھ محبت تھی جلد ہی اس کی بہن بیمار ہو کر مر گئی، اس وقت وہ لڑکی دوسرے شہر میں تھی اور اطلاعی خط میں اس کی بہن کی موت کا ذکر نہ کرتے ہوئے اسے جلد از جلد واپس آنے کے لیے کہا گیا تھا۔ جب اس نے اپنی بہن کو مردہ حالت میں دیکھا تو ایک لمحہ کو بجلی کے کوندے کی طرح یہ خیال اس کے ذہن میں آیا — "اب وہ مجھ سے شادی کرنے کے لیے آزاد ہے" لیکن فوراً ہی اسے دبا دیا گیا، بعد میں وہ اسے بالکل بھول گئی۔ لیکن جلد ہی وہ ہسٹریا کی مریضہ بن گئی اسے فرائڈ کے پاس لایا گیا جو لاشعور میں دبی ہوئی اس خواہش کو شعور میں لانے میں کامیاب ہو گیا اور ساتھ ہی اسے اپنی بہن کی نعش دیکھ کر بہنوئی کو حاصل کرنے کی تمنا بھی یاد آگئی — اور یوں جب اپنی بیماری کی وجہ سے آشنا ہو گئی، تو وہ صحت یاب ہو گئی۔

فرائڈ نے اس طریقہ کو پہلے "مسلسل تلازم" اور بعد میں "آزاد تلازم" کا نام دیا۔

نوٹ: ژنگ نے اس طریقہ کو بے حد وسعت دے کر اسے ایک باقاعدہ سائنس کا درجہ دے دیا ہے۔

۲۔ تشریح و تحلیل خواب: خوابوں پر تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے۔ اور اب یہ سمجھنے میں دقت نہیں ہو سکتی کہ خوابوں کا انسان کے لاشعور اور اس کے نفس کی الجھنوں سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ خوابوں کی نفسیاتی اہمیت اس لطیفہ سے بھی آشکار ہے:

تحلیل نفسی کا ماہر ایک ادق اور پیچیدہ مریض کی تحلیل کر رہا تھا۔ ہر نئی ملاقات پر جب وہ اس سے اس کے خوابوں کے بارے میں دریافت کرتا تو مریض یہ جواب دیتا کہ اس نے تو کوئی خواب نہیں دیکھا، آخر ایک دن وہ معالج چڑ گیا اور کہنے لگا: "دیکھو میاں! اگر گھر کا کام نہ کر کے لاؤ گے تو علاج کیسے چلے گا؟"

تحلیل نفسی کے عمل میں ان کی اہمیت خود فرائڈ کے اس بیان سے بھی واضح ہو جاتی ہے:

"خوابوں کی تحلیل و تشریح دراصل لاشعور کی تشریح کے مترادف ہے یہ تحلیل نفسی کا سب سے کار آمد ذریعہ ہے اور یہ ایک ایسی چیز ہے جس کے بارے میں ہر کارکن کو تعلیم حاصل کرنی چاہیئے: اگر مجھ سے کوئی یہ پوچھے کہ تحلیل نفسی کیسے کی جا سکتی ہے تو میں اسے اس کے خوابوں کے مطالعہ کا مشورہ دوں گا۔"

لیکن خوابوں کی تشریح کا عمل آزاد تلازم سے کہیں زیادہ مشکل اور پیچیدہ ہے۔ کیونکہ اگر مریض کو یہ احساس ہو جائے کہ سارا دارو مدار اس کے خوابوں پر ہے تو واقعی مزاحمت کی بناء پر خوابوں کا آنا بند ہو جاتا ہے، بعض اوقات لاشعور تحلیل کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے عمداً "گمراہ کن" خوابوں سے کام لے کر تحلیل کے کام کو غلط راہوں پر ڈالنے کی سعی کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں ان خوابوں کی نسبت زیادہ اہمیت ہوتی ہے جو یا تو مریض بچپن سے ہی مسلسل دیکھتا آ رہا ہو اور یا بچپن کے وہ خواب جو اسے کبھی نہ بھول سکے۔

خوابوں کی تحلیل میں اشارات کے تجزیے کے علاوہ مریض سے سوالات بھی کیے جاتے ہیں اور بعض اوقات خواب کے واقعات کو ہی آزاد تلازم کا ذریعہ بنا لیا جاتا ہے۔

منقولیت

تحلیل نفسی کے دوران ایک "خطرناک" موڑ آتا ہے، جسے اصطلاح میں منقولیت کہا جاتا ہے، یہ انتقال ہی کی ایک مخصوص قسم کی صورت ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس میں مریض، معالج کو اپنی محبت، جس میں معاندانہ احساسات بھی شامل ہوتے ہیں۔ کا مرکز بنا لیتا ہے عورتیں اس کی زیادہ شکار ہوتی ہیں (لیکن مرد بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہوتے)

فرائڈ کا خیال ہے، معالج سے ان نرم و نازک جذبات و احساسات کی وابستگی طفلانہ جنسیت کے دور کی ان خواہشات کی بناء پر ہوتی ہے جو اب لاشعور میں دبی ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر ایک عصبی مریضہ اپنے خاوند سے نفرت کرتی ہے تو تحلیل نفسی کے عمل کے دوران معالج بھی اس کی نفرت کا مرکز بن جائے گا۔ اس کی ایک بڑی سیدھی سادی سی وجہ تو یہ ہے کہ معالج ہی اس کی نفرت کو شعور میں لانے والا ہوتا ہے اور یوں لاشعور اپنے بچاؤ کے لیے اس نفرت کو معالج کی ذات سے وابستہ کرنے کی سعی کرتا ہے۔

تحلیل نفسی کا عمل ایک لحاظ سے گڑے مردے اکھاڑنے کے مترادف ہے، اس لیے مریض کے تمام لاشعوری نظام میں ایک ہلچل سی مچ جاتی ہے۔ ہر خواہش اور الجھن گویا سلطان گواہ بن کر خود کو بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کیفیت انقلاب سے مشابہ ہوتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لاشعور اس ہلچل اور گڑبڑ کا ذمہ دار معالج کو ٹھہراتے ہوئے حسب الزامات اس کے سر تھوپ کر خود مطمئن ہو جانا چاہتا ہے — دراصل یہ مزاحمت کی آخری صورت ہوتی ہے۔

ایڈی پس الجھاؤ اور ترددیج حرکات سے وابستہ خواہشات کو غیر اخلاقی اور گندہ سمجھتے ہوئے دبایا جاتا ہے لیکن معالج کے ضمن میں اس نوعیت کی کوئی اخلاقی پابندی نہیں ہوتی۔ اگر ایک مریضہ اپنے باپ سے جنسی محبت کرتی رہی ہے تو لاشعور اسے معالج میں باپ کا عکس دکھا کر ڈاکٹر کو اس محبت کا مرکز بنا دے گا۔ لیکن اسے معالج میں باپ کے نقوش نہ بھی نظر آئیں تو بھی یہ کیا کم ہے کہ وہ ان احساسات کو شعور کی روشنی میں لانے والا ہے۔

منتقولیت، تحلیل کے کسی خاص مرحلہ یا موقع کی پابند نہیں بلکہ کسی وقت بھی اس کا ظہور ہو سکتا ہے۔ اس کا اولیں اظہار خوابوں سے ہوتا ہے۔ اب خوابوں کا مرکز معالج بن جاتا ہے۔ اس مرتبہ پر معالج مریض کو منتقولیت کی ماہیت سے آگاہ کرتے ہوئے دوسری اور موزوں چیزوں کی طرف انتقال کے لیے اس کی راہنمائی کرتے ہوئے اسے اس مخمصہ سے نکال دیتا ہے۔

منتقولیت کا وقت بے حد اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اب مریض تقریباً دوبہ صحت ہوتا ہے اور وہ ایک لحاظ سے صحت اور بیماری کے دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے اس لیے اس موقع پر ذرا سی بے احتیاطی مریض کے لیے باعث نقصان ثابت ہو سکتی ہے اور اگر مریض کو اس حالت میں چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنے اور بعض اوقات معالج کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

سیاہ بالوں والی ۲۴ سالہ این کریلمن اعصابی خلل کی شکار تھی گو وہ کالج کی مقبول ترین لڑکیوں میں سے تھی، لیکن بعض اوقات اس کی مسلسل سگریٹ نوشی سے اس کے ساتھی کچھ گھبرا سے جاتے تھے، ویسے وہ ہر لحاظ سے صحت مند تھی۔ شادی اور اس کے بعد تین بچوں کی پیدائش اور بڑھتی عمر کے تجربات نے اس میں کچھ نفسیاتی خرابیاں پیدا کر دیں۔ چنانچہ اس نے نفسیاتی معالج ڈاکٹر ایلبرٹ لاورن ALBERT LAVERNE سے کچھ دیر تک اپنا علاج بھی کرایا جس نے اسے سینی ٹوریم میں داخل ہونے کا مشورہ دیا۔ لیکن ہوا یہ کہ این کے ذہن میں کسی طرح سے یہ خیال پڑ گیا تھا کہ ڈاکٹر نے لوگوں کو اس کی تمام کمزوریاں بتا دی ہیں، اسی وجہ سے لوگ اب پیٹھ پیچھے اس کا مذاق اڑاتے ہیں، وہ موٹی اور بھدی ہو چکی ہے۔ اور یہ تو ڈاکٹر کے علاوہ اور کوئی بتا ہی نہ سکتا تھا۔ کہ وہ ہر وقت اپنے چہرے کو کھجاتی رہتا ہے اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی خیال آیا کہ ڈاکٹر کی بیوی (جو خود بھی ایک ڈاکٹر تھی) اس کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلا رہی ہے چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے ڈاکٹر کی بیوی سے ملاقات کی جس کے نتیجہ میں اس نے پستول سے اسے ہلاک کر دیا

منتقولیت لاشعور کا آخری وار ہوتا ہے اور جب یہ بھی خالی جاتا ہے تو وہ ہتھیار ڈال دیتا ہے — اور مریض تندرست ہو جاتا ہے۔

آج کے دور میں تحلیلِ نفسی

ڈاکٹر وان وزاکر (VIKTOR VON WEIZAECKER) نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

میں نے اس (فرائیڈ) سے پوچھا۔

"کیا تحلیلِ نفسی کی مقبولیت کے امکانات غیر محدود اور بے پایاں ہیں یا نہیں؟"

فرائیڈ نے ایک لمحہ کے توقف کے بعد قدرے ہچکچاہٹ سے دھیمی آواز میں کہا "میرا خیال ہے — بے پایاں!"

مگر آج کوئی انسان بھی تحلیلِ نفسی کی مقبولیت کو غیر محدود قرار دینے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرے گا۔

فرائیڈ کی تعلیمات کی بنیادوں پر استوار کئی نئے دبستان فکر پنپ رہے ہیں گو سبھی پوری طرح سے فرائیڈ کے مقلد نہیں قرار دیئے جا سکتے لیکن جہاں تک تحلیل نفسی اور اس کے طریق کار کا تعلق ہے تو بعض امور میں اختلافات سے قطع نظر فرائیڈ کو سبھی اپنا راہنما اور ہادی تسلیم کرتے ہیں۔

آج متمدن ممالک میں ماہر تحلیل نفسی طبی زندگی کا ایک ناگزیر حصہ بن چکا ہے ذہنی امراض کا کوئی شفاخانہ اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جا سکتا جب تک اس میں ماہر تحلیل نفسی نہ ہو۔

امریکہ اور بعض دوسرے ممالک میں تحلیل نفسی میں پیشہ ورانہ مہارت کے لیے بنیادی قابلیت ڈاکٹر آف میڈیسن کی ڈگری سمجھی جاتی ہے اس کے بعد خصوصی تربیت حاصل کرنے کے علاوہ تحلیل نفسی سے وابستہ بعض خصوصی امتحانات بھی پاس کرنے ہوتے ہیں اور مریضوں کی تحلیل نفسی سے قبل تقریباً ہر ماہر کو اپنی تحلیل نفسی بھی کرانی ہوتی ہے۔

آج ماہر تحلیل نفسی مہذب زندگی کا ایک جزو لاینفک بن چکا ہے۔ امریکہ کا ایک ممتاز ماہر ڈاکٹر سیموئیل میئر (DR. SAMUEL MAYER) نے نیوز ویک کے نمائندہ کو ایک ملاقات کے دوران بتایا کہ اس کے پاس سال میں کم از کم ۲۰۰ مریض آتے ہیں اور اس کی سالانہ آمدنی ۴۰ ہزار ڈالر ہے وہ ۴۵ منٹ کے لیے ایک مریض سے ۲۵ سے ۵۰ ڈالر تک وصول کرتا ہے (۱۹۴۸ء) میں ایک مریض سے ایک گھنٹہ کے لیے ۱۰ سے ۱۵ ڈالر تک وصول کیے جاتے تھے۔ صرف مخصوص حالات میں ۵۰ ڈالر لیے جاتے تھے۔

تحلیلِ نفسی پر جو سب سے بڑا اعتراض کیا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ یہ کیونکہ بہت مہنگا علاج ہے اور اس کا طریق کار طویل مدت کا طالب ہے اس لیے اس سے صرف امیر اور صاحب حیثیت ہی استفادہ کر سکتے ہیں، اور یہ ہے بھی حقیقت — ایک عام قسم کا مریض بھی سال ڈیڑھ سال تک کا عرصہ لے لیتا ہے۔

ڈاکٹر سیموئیل کے پاس ایک بہت خوبصورت اور نوجوان لڑکی کو لایا گیا جو بہت خوف زدہ رہتی تھی، وہ خلوت پسند تھی اور لوگوں سے بات کرتے وقت اسے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔ امریکہ ایسے ملک میں رہتے ہوئے کسی لڑکے نے اس کا بوسہ تک نہ لیا تھا۔ تحلیل نفسی پر پتہ چلا کہ اس کا باپ بہت سخت گیر تھا۔ جس کی بناء پر اسے عام مردوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس کے علاج پر دو سال لگے اور ۸ ہزار ڈالر کا بل بنا، مگر وہ تندرست ہو کر شادی اور بچے پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

مئی ۱۹۶۱ء میں American Psycho-analytic Association نے اپنے پانچویں سالانہ اجلاس میں اس مسئلہ پر خصوصی توجہ دی اور اب وہ فرائیڈ کے طریق کار کی اندھا دھند پیروی نہیں کر رہے کیونکہ اس سے ایک مریض کو اوسطاً ۵۰۰۰ ڈالر خرچ کرنا پڑتے ہیں

ویسے یہ تو ان ماہرین کی بات ہے جو پرائیویٹ پریکٹس کرتے ہیں لیکن ذہنی امراض کے شفاخانوں کے ساتھ بھی تحلیل نفسی کے ماہرین منسلک ہوتے ہیں، اور یوں عام مریض بھی ان کی پیشہ ورانہ مہارت سے استفادہ کر سکتے ہیں، حساب لگایا گیا ہے کہ امریکہ میں بڑے بڑے شہروں میں ہسپتال کے ۲۰۰ مریضوں کے لیے ایک ماہر تحلیل نفسی ہے سالہ ایک حالیہ جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ میں ماہرین نفسیات سے علاج کرانے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ امریکہ کی نیشنل ہیلتھ انسٹی ٹیوٹ نے اس سلسلہ میں جو اعداد و شمار جمع کئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ میں ۱۲،۸۶۳ ڈاکٹر نفسیات کے طریقوں سے علاج کرتے ہیں اس طرح امریکہ میں ہر ایک ہزار ڈاکٹروں میں سے ۴۳ ماہرین نفسیات بھی ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ نے توقع ظاہر کی ہے کہ امریکہ میں نفسیات کے اصولوں سے علاج کرانے

والے ڈاکٹروں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو گا۔ کیونکہ میڈیکل کالجوں اور سکولوں میں زیرِ تعلیم طلبہ میں اس طریقۂ علاج کی مقبولیت بڑھ رہی ہے، اس سلسلہ میں اعداد و شمار کے مطابق ہر ایک ہزار طلبہ میں ۹۶ طلبہ نے خیال ظاہر کیا کہ وہ نفسیات کے طریقہ سے علاج کرنا پسند کریں گے۔"

(مشرق ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۴ء)

آج ساری دنیا تحلیلِ نفسی کی اہمیت کو تسلیم کر چکی ہے، مگر روس میں اس کا نام و نشان نہیں۔ کیمونسٹ طرزِ فکر میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں کیونکہ یہ اجتماعیت کو نظر انداز کر کے فرد پر خصوصی توجہ دیتی ہے۔ کیمونزم فلسفۂ مادیت ہے، اس لیے لاشعور ان کے لیے محض ایک مفروضہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے آج بھی ان کی تمام نفسیاتی کاوشیں ایوان پیٹروچ پاولف Ivan Petrovich Pavlov کے رجعی حرکت کے نظریہ سے آگے نہیں بڑھ سکیں۔

جون ۱۹۶۱ء میں مانٹریل (MONTREAL) کے مقام پر 3rd World Congress of Psychiatry میں ۶۰ قوموں کے ۲۸۰۰ ڈاکٹروں کے اجتماع میں روسی وفد کے قائد اینڈری ولاڈی میروچ سینہ بزیکی ANDREI VLADIMIROVICH SNEZHNEVSKY نے یہ اعلان کیا: "ہمارے طریقِ کار میں کوئی تبدیلی رونما پذیر نہیں ہوئی ہے۔ ابھی تک پاولف کے نظریہ اور اس کی تطبیق کو روس میں پھیلایا جا رہا ہے۔ ہم تحلیلِ نفسی کے طریقے کو اس کے غیر علمی ہونے کی بناء پر مسترد کرتے ہیں۔ کیونکہ تحلیلِ نفسی میں نفسیاتی زندگی کی مادی بنیادوں کو تسلیم نہیں کیا جاتا، ہم اس کی بجائے معقولیت پر مبنی نفسی معالجہ کو فروغ دے رہے ہیں۔ ہم شعور پر کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ ہمارے خیال میں ذہنی امراض کی جڑیں شعور میں پیوست ہوتی ہیں"

لیکن جہاں تک ذہنی مریضوں کے لیے سہولتوں کا تعلق ہے تو روس امریکہ سے کہیں آگے بڑھا ہوا ہے۔ اگر امریکہ میں ہسپتال کے ۲۰۰ مریضوں کے لیے ایک ماہر تحلیلِ نفسی ہے تو روس میں ۲۵ مریضوں کے لیے ایک ماہر ہے۔ اور گو وہ فرائیڈ کے نظریات کو تسلیم نہیں کرتے لیکن پھر بھی انہوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں اس سے فائدہ اٹھایا ہے اور ہر ایک ملازمت سے پہلے امیدوار کو بعض "نفسیاتی امتحانات" کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے، اور فرد کی استعداد اور صلاحیت جانچنے کے لیے ہمیشہ اسی پر بھروسہ کیا جاتا ہے — نفسی معالجہ تو ان کے ہاں بہت سستا اور عام ہے جیسے ہمارے ہاں گلی گلی کی نجربہ معالجوں کی دوکانیں ملتی ہیں، یہی حال وہاں نفسی معالجین کا ہے — اور اسی لیے وہاں ذہنی مریضوں کا تناسب امریکہ اور دیگر یورپی ممالک کے مقابلہ میں بہت کم ہے

ڈاکٹر ژنگ
حیات و نظریات

کارل گستاژنگ ـــــ ایک خاکہ

نظریات

(۱) نظریۂ لاشعور

ذاتی لاشعور ـــ اجتماعی لاشعور ـــ اساسی نقش ـــ اشاریت ـــ تلازمی امتحان ـــ الجھاؤ ـــ

(۲) خواب

خوابی مطالعہ ـــ خوابی اشاریت ـــ مطالعہ کا طریق کار ـــ خوابوں کی اقسام

(۳) نفس

ماہیت اور خصائص ـــ شخصیت کے نقش و نگار ـــ (رُوپ، پرچھائیں، انیما اور انیمس، ذات) نفسیاتی اقسام ـــ (باطن بین، ظاہر بین)

حیات و نظریات

کارل گستاو ژنگ ــــ ایک خاکہ!

جھیل زیورچ کے کنارہ پر ایک وسیع اور خوشنما مکان کی چھت سرخ رنگ کی ہے۔ مکان کی کھڑکیوں سے جھیل کے نیلگوں پانی سے بادلوں کے عکس کی آنکھ مچولی کا منظر دل پر ایک عجیب اور خوشگوار تاثر پیدا کرتا ہے۔ وہ سڑک جو پل کھاتی ہوئی مکان تک آتی ہے، اس کے دونوں طرف بید کے درخت اُگے ہیں۔ اس مکان کے صدر دروازہ پر قدیم یونانی داتفی کے ہاتف کے یہ الفاظ تحریر کئے گئے ہیں۔

Called and not called, the God will be there

(پکارو یا نہ پکارو! خدا موجود ہوگا)

. . . . یہ مکان پروفیسر ژنگ کا تھا!

کارل گستاو ژنگ ۲۶ جولائی ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوا۔ سوئٹزرلینڈ میں CANTON THURGAU میں ایک چھوٹا سا قصبہ KESSWIL ہے۔ یہیں ژنگ نے ایک عام قسم کے مکان میں متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے مذہبی والدین کے ہاں جنم لیا۔

ننھا ژنگ بہت خوبصورت اور پیارا بچہ تھا۔ گول مٹول چہرہ پر صحت کی سرخی جھلکتی تھی۔ اس کے مضبوط ہاتھ پاؤں تھے اور اپنی ذہین آنکھوں سے یہ سب کی طرف بڑی دلچسپی اور تجسس سے دیکھتا تھا۔ ویسے یہ بھی سب کے لیے کھلونا بنا رہتا تھا۔

باپ کا نام پال ژنگ تھا۔ جب ژنگ ۴ برس کا تھا، تو اس کا باپ باسل BASEL کے گرجا میں پادری بنا دیا گیا۔ چنانچہ یہ لوگ باسل میں مقیم ہو گئے۔

ژنگ کی نفسیات کا مرکزی نکتہ مذہب اور اس کے پیدا کردہ جذبات و احساسات ہیں۔ اس کی تعلیمات پر مذہبی اثرات کا سراغ لگانا مشکل نہیں، بچپن سے ہی اسے دینی ماحول میسر آیا۔ ادھر اس کا نانا نہ صرف دینیات کا ایک ممتاز عالم تھا بلکہ عبرانی زبان کے محقق کی حیثیت سے اس کا نام خاص عزت سے لیا جاتا تھا علاوہ ازیں مجوسیت کا اسے ایک اتھارٹی مانا جاتا تھا اس کا دادا بھی ایک پروفیسر تھا گویا اسے ورثہ ہی میں ذہانت اور دماغی قابلیت ملی تھی۔ ایک غیر مصدقہ خاندانی روایت کی رو سے اس کا دادا گوئٹے کا ناجائز بیٹا تھا۔

جہاں تک ژنگ کا تعلق ہے تو یہ اپنی ماں کی نسبت اپنے باپ سے زیادہ مانوس تھا اور اسے یہ ماں سے زیادہ پسند کرتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ خود بھی کہا تھا۔ "میری والدہ تو بعض اوقات میرے لیے ایک مسئلہ بن جاتی تھیں . . . . میں اپنی والدہ سے ڈرا بھی کرتا تھا مگر دن کے وقت نہیں۔ دن کے وقت تو مجھے ان پر بھروسہ رہتا لیکن رات کے وقت ان سے ڈرنے لگتا کہ نہ جانے اب وہ کیا روپ اختیار کر لیں۔" گو یہ عجیب سی بات ہے لیکن؟ اس کا جواب ژنگ کے پاس یہ ہے کہ تمام بچے یہ تصور کرتے ہیں کہ بعض اوقات ان کی مائیں ڈرانے والی چیز بن جاتی ہیں، انہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی حقیقت سے بھی بہت بڑی چیز ہوتی ہیں یا پھر اگر وہ اپنی ماں سے یہ احساسات وابستہ نہ کریں تو پھر وہ کسی دوسری عورت سے یہ اجنبی سے کار گر دینے لگتے ہیں۔ مثلاً بے رحم سوتیلی ماں سے یا پریوں والی کہانی کی جادوگرنی سے۔"

ژنگ کی وفات کے بعد شائع ہونے والی "خود نوشت" سوانح عمری میں بھی ژنگ نے ماں کی پُراسراریت کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔ "میرے والدین علیحدہ سوتے تھے۔ میں اپنے والد کے کمرہ میں سوتا تھا، میری ماں کے دروازہ سے رات کو خوف زدہ کرنے والے تاثرات ظہور پذیر ہوتے تھے ــ رات کو میری ماں پُراسرار اور عجیب سی معلوم ہوتی تھی۔ ایک رات میں نے اس کے کمرہ میں سے ایک نامانوس اور قدرے تاباں شبیہ کو نکلتے دیکھا جس کا سر اس کے دھڑ سے جدا ہو کر اس کے آگے آگے ہوا۔ میں چھوٹے سے چاند کی مانند اڑ رہا تھا۔ اس کے فوراً بعد ہی ایک اور سر نمودار ہوا جس نے علیحدگی کے بعد پرواز شروع کر دی۔ ایسا چھ سات مرتبہ ہوا"

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی ماں کوئی ساحرہ یا مافوق الفطرت قوتوں کی مالک تھی بلکہ یہ تو ایک بے حد حساس ذہن کے تصورات کی کارفرمائیاں تھیں کیونکہ ایک اور موقعہ پر ژنگ ہمیں بتاتا ہے کہ جب ۱۸۷۸ء میں والدین میں ناچاقی کی بنا پر عارضی جدائی ہو گئی تو یہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا اور شدید بیمار ہو گیا۔ وہ لکھتا ہے "اپنی ماں سے دوری نے مجھ پر شدید رد عمل کیا۔ اس کے بعد سے میں ہمیشہ "محبت" کا لفظ سن کر اس پر کبھی ایمان نہ لاتا۔ ایک طویل مدت تک میں نے اپنے ذہن میں عورت اور بے اعتباری کو لازم و ملزوم بنائے رکھا، جبکہ "باپ" اعتبار اور قوت کا مظہر تھا۔"

کافی مدت کے بعد تجرباتِ زیست نے اسے یہ اندازِ نظر بدلنے پر مجبور کیا۔

اس کی ماں کا نام ایملی فرسورک ژنگ تھا۔

ژنگ کے بقول اس کی ماں بہت اچھی ماں تھی۔ اس میں ایک خاص طرح کی گرم جوشی پائی جاتی تھی، اپنی خوش مزاجی اور گفتگو کے دل خوش کن انداز کی بنا پر وہ بہت اچھی ساتھی بن سکتی تھی۔ بچپن کی "پُراسراریت" کا احساس ختم ہو جانے پر ان دونوں میں باہمی اعتماد کے ایک گہرے رشتہ نے جنم لے لیا۔ کیونکہ وہ اپنے بیٹے کو عمر کے لحاظ سے زیادہ سمجھ دار سمجھتے ہوئے اس سے ہر طرح کی بات کر لیا کرتی تھی۔

ژنگ کا بچپن بالکل عام بچوں ایسا ہی تھا۔ وہ بے فکری سے دن گذارتا اور کھیل کود میں مگن رہتا، اس نے اپنے بچپن کے ایک "کھیل" کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ جب یہ سرحد کے قریب ہی رہتے تھے یہ اور اس کے ہم جولی سرحد پر جا کر دوسرے ملک کے فوجیوں کے خلاف نعرے لگا کر بھاگ آتے۔ ژنگ نے بچپن میں خود میں شدید جارحیت کے جذبہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک حادثہ کی بنا پر اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنا ایک ظالم استاد کو قتل کر دے، اور اسی جذبہ کے تحت اس نے اپنے گاؤں کے دوسرے لڑکوں سے ایک مرتبہ خوب ڈٹ کر لڑائی بھی کی تھی۔ اور بقول ژنگ "مجھے اس شخص سے نفرت تھی اور وہی ایک ایسا شخص تھا جسے میں قتل کر سکتا تھا اگر وہ مجھے رات کی تاریکی میں کسی ویران جگہ مل جاتا تو میں اسے بتا دیتا کہ میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔ میں خاصا طاقتور تھا میں ان دنوں دیہاتی لڑکوں کے ساتھ گھوما پھرا کرتا تھا اور خاص سخت زندگی بسر کرتا۔ میں مرنے مارنے کے قابل بھی تھا لیکن میں تشدد سے قدرے گھبراتا تھا۔ اس لیے میں نازک قسم کی صورتِ حال سے گریز کر جاتا کیونکہ مجھے اپنے آپ پر اعتبار نہ ہوتا تھا، مجھے خوف رہتا تھا

رکھیں میں کچھ کر نہ بیٹھوں۔ ایک دفعہ مجھ پر سات لڑکے پل پڑے۔ میں نے ان میں سے ایک کو ٹانگ سے پکڑ کر خوب گھمایا اور چار کو اچھی طرح پیٹا باقی دو بھاگ گئے۔"

اپنے کھیلوں کے بارے میں وہ یوں رقم طراز ہے:

"میں اکیلا کھیلا کرتا تھا اور اپنے کھیلوں کا خود ہی خالق تھا۔ گو مجھے اب ان کھیلوں کے بارے میں کوئی تفصیل یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ میں کسی قسم کی مداخلت بے جا پسند نہ کرتا تھا۔ میں اپنے کھیلوں میں ہمہ تن معروف رہتا اور کسی کا دیکھنا یا رائے زنی کرنا مجھے سخت ناگوار تھا۔"

یہ اینٹوں سے قلعہ بنا کر "زلزلہ" سے انہیں ڈھایا کرتا تھا، یہ ساتویں یا آٹھویں سال تک تھا۔ اس کے بعد سے گیارھویں سال تک اسے تصویر کشی کا شوق رہا۔ یہ تمام تصاویر جنگی مناظر کی تھیں گویا ژنگ اپنی فطرت کے جارحانہ رجحانات کی تصویروں کے ذریعے تسکین کر رہا تھا۔ ایک زمانہ میں (ساتویں سے نویں سال تک) اسے آگ سے کھیلنے کا بھی شوق تھا۔

یہ نو سال کا تھا جب اس کی بہن پیدا ہوئی، گھر والوں کے بقول اسے رات کے وقت ایک بگلا چھوڑ گیا تھا لیکن وہ سمجھ گیا کہ سکے کی 'یہ کہانی بھی جھوٹ کے اس طومار سے تعلق رکھتی ہے جو اس پر ہمیشہ مسلط کئے جاتے رہے ہیں اور مجھے یہ یقین تھا کہ ایک مرتبہ پھر میری ماں نے کوئی ایسی حرکت کی ہے جس کے بارے میں مجھ سے لاعلمی کی توقع رکھی جا رہی تھی، ادھر بہن کے یوں اچانک نمودار ہونے سے مجھ میں بے اعتباری کا ایک مبہم سا احساس پیدا ہوا، جس نے میرے تجسس اور مشاہدہ کو مزید جلا بخشی!" یہی اس کا رد عمل تھا!

ژنگ کو گھر پر ہی ابتدائی تعلیم دی گئی اور اس کی ذہانت و فطانت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ چھ سال کی عمر میں یہ لاطینی بڑی روانی سے بول اور پڑھ سکتا تھا، جہاں تک زبانوں کا تعلق ہے تو ژنگ کی جسارت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کیونکہ اسے نہ صرف یورپ کی چار زبانوں انگریزی، جرمنی، فرانسیسی اور لاطینی پر تحریر و تقریر کے لحاظ سے مکمل عبور حاصل تھا بلکہ سنسکرت اور یونانی کے بارے میں بھی اس نے کافی سے زیادہ استعداد بہم پہنچا رکھی تھی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی تحریروں میں ان زبانوں کے الفاظ، محاورات، ضرب الامثال اور مقامی روایات و اساطیر اس طرح سے گھل مل گئے تھے کہ بعض اوقات عام قابلیت کے قاری کے لیے ان کی تہ تک پہنچنا مشکل ہو جاتا تھا۔

ذہنی لحاظ سے اسے فلسفہ سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ شوپنہار، نطشے اور کانٹ سے بہت متاثر تھا۔ اور پیشہ کے لحاظ سے یہ آثار قدیمہ کا ماہر بننا چاہتا تھا، اس مقصد کے پیش نظر اس نے قدیم تہذیبوں اور مردہ تمدنوں کے بارے میں کافی مطالعہ بھی کیا — گو یہ آثار قدیمہ کو بطور پیشہ تو نہ اپنا سکا لیکن اس کے پاس جو وسیع ذخیرۂ معلومات جمع ہو گیا تھا اس سے اس نے اپنی کتابوں میں جابجا استفادہ کیا — اس کی دلچسپیوں کا خاتمہ یہیں پر نہیں ہو جاتا بلکہ الہیات، طبعی علوم، حیوانیات، کیمیاگری اور اساطیر سے بھی یکساں قسم کی دلچسپی تھی۔ اس سے اس کی ذہنی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ژنگ کے نقادوں نے اس پر یہ الزام بھی لگایا ہے کہ وہ بعض اوقات حقیقت سے ماورا مابعد الطبیعاتی موشگافیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے اس کی وجہ بھی حد سے زیادہ وسیع معلومات کا دائرہ ہے کیونکہ اس نے ہر مضمون سے اثرات اخذ کر کے انہیں اپنے نظام فکر میں سمونا چاہا۔ اس سے بعض اوقات گنجلک کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جسے جدید انسان کا ذہن قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اپنے مذہبی مشاغل کے علاوہ اس کے باپ کے فرائض میں "باصل کے پاگل خانہ کے مریضوں کا علاج بھی شامل تھا۔ اس کے باپ کی خواہش اسے ڈاکٹر بنانے کی تھی۔ چنانچہ اس کے لایا پھر ابتدائی تعلیم کے بعد اس نے ڈاکٹر بننے کے لیے باصل یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ جہاں اپنی جماعت میں اسے ہمیشہ ایک ممتاز مقام حاصل رہا اور اس کی قابلیت اور شوق کی وجہ سے تمام اساتذہ اس کی عزت کرتے تھے۔

لیکن سکول میں ایسا نہ تھا اور بقول اس کے "اساتذہ کی اکثریت مجھے احمق اور فتنہ تصور کرتی تھی۔ سکول میں جب کبھی بھی کوئی گڑبڑ ہوتی تو سب سے پہلے مجھ ہی پر شک کیا جاتا۔ کہیں کوئی سر پھٹول ہوتی تو اس کا باعث مجھے گردانا جاتا۔"

سکول میں ریاضی کی جماعت اس کے لیے دہشت اور اذیت کا باعث ہوتی تھی اور نا اہلی کی بنا پر اسے ڈرائنگ سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ کچھ ایسا ہی حال ورزش اور جسمانی مشقت کی جماعتوں کا تھا۔

دوران تعلیم میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس کے باعث اس کی ذہنی دلچسپیوں کا رُخ بدل کر رہ گیا۔ اس سے پہلے نفسیات سے اس کی دلچسپی واجبی سی تھی اس وقت طبی تعلیم میں نفسیات کا کوئی عمل دخل نہ تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے نزدیک ذہنی بیماریاں اعصابی خلل کے باعث ہوتی تھیں اس لیے نفسیات نصاب کا حصہ نہ ہوتی تھی بات یہ ہوئی کہ اسے ایک پارٹی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ پارٹی بڑی پُر رونق اور دلچسپ تھی یہ سب لوگ خوب کھا پی رہے تھے، ٹیبل ٹینس کھیلی جا رہی تھی اور بے فکری سے قہقہے لگائے جا رہے تھے۔ وہاں ایک پندرہ سالہ لڑکی بھی تھی وہ بظاہر بالکل عام لڑکیوں ایسی تھی۔ لیکن جب اس نے سوئٹزر لینڈ میں عام مروج جرمنی زبان کی بجائے قدیم کلاسیکی زبان بولنی شروع کی تو سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ جب کھیلوں کا آغاز ہوا تو اس لڑکی کی مہارت سے سب انگشت بدنداں رہ گئے، اسے جس قسم کا کام بھی سونپا گیا اس نے نہ صرف اسے خوش اسلوبی سے نبھایا بلکہ اس میں جان بھی ڈال دی۔ سب لوگوں نے دل کھول کر اس کی تعریف کی — مگر نوجوان ژنگ کے لیے یہ واقعہ زیادہ گہرے اثرات کا حامل ثابت ہوا، اس کی حیرت اور تعریف وقتی نہ ثابت ہوئی بلکہ وہ اس کی تہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ آخر یہ لڑکی باقی لوگوں سے کیوں، کیونکر مختلف تھی — کیوں بھ کیوں؟؟ — کیوں؟؟؟

اس نے کتابوں سے مدد چاہی اور اس لڑکی کی وجہ سے اس کے ذہن میں جو جو سوالات ابھرے تھے ان کے جوابات حاصل کرنے کے لیے اس نے فلسفہ کی کتابوں کو چھان مارا مگر تسلی نہ ہوئی — تب کرافٹ ایبنگ کی ایک کتاب اس کے ہاتھ لگی۔ یہ کتاب ذہنی انتشار کے بارے میں تھی اور گویا اس کے ذہن سے ایک پردہ ہٹ گیا اور یوں اسے پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ انسانی ذہن تو ایک پُراسرار جزیرہ کی مانند ہے — ایک ایسا جزیرہ جس کے بھیدوں اور رموز سے خود انسان بھی ناواقف ہے — اس نے اس پُراسرار جزیرہ کا کھوج لگانے کا تہیہ کر کے نفسی معالج بننے کا عزم کر لیا۔

ایک مرتبہ انٹرویو کے دوران اس نے کہا تھا "بھلا انسانی ذہن کی کارگردگی کے طریق کی دریافت سے زیادہ دلچسپ مطالعہ اور کیا ہو سکتا ہے؟"

اور تمام عمر اس "دلچسپ مطالعہ" میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور ژنگ کے لیے علم کے ہر نئے شعبے سے دلچسپی صرف ذہنی مطالعہ کی پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے کی غرض سے تھی۔

۱۹۰۰ء میں باصل یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف میڈیسن کی ڈگری بڑے اعزاز سے حاصل کی۔

اس ڈگری کے لیے اس نے اپنے تحقیقی مقالہ کے لیے ایک سولہ سالہ عورت کے کیس کا انتخاب کیا جو روحانی قوتیں رکھنے کی مدعی تھی اور اپنے حلقہ میں اچھی خاصی "پیر" مانی جاتی تھی۔ لیکن ژنگ نے اس کے تجزیاتی مطالعہ سے معلوم کیا کہ وہ خود دراصل انتقال نومی کی مریضہ تھی۔

۱۰ دسمبر ۱۹۰۰ء میں ژنگ زیورچ میں برغوضلی (BURGHOLZLI) کے ذہنی امراض کے ہسپتال اور زیورچ یونیورسٹی کے نفسی معالجاتی شفاخانہ میں بطور "اسسٹنٹ" ملازم ہو گیا۔ اس کے دو سال بعد یہ کچھ عرصہ کے لیے پیرس گیا، جہاں اس نے ژینے (JANET) سے اعصابی خلل اور نفسی پیچیدگیوں کے بارے میں مزید تربیت حاصل کی۔ واپسی پر اس نے اپنی ملازمت کو جاری رکھا اس جگہ اسے اس دور کے مشہور نفسیات دان یوجین بلولر (EUGEN BLEULER) کے ماتحت کام کرنے کا موقعہ ملا، لیکن جیسے جیسے بلولر کو اس کی صلاحیتوں کا احساس ہوتا گیا ویسے ویسے ہی ان کے تعلقات میں سے افسری ماتحتی کا عنصر غائب ہوتا گیا۔ اور جب کچھ عرصہ بعد ژنگ نے عہدہ کے لحاظ سے بھی ترقی کر لی تو ماتحتی کا رسمی سا رشتہ بھی نہ رہا اس جگہ بلولر کے ایما پر اس نے "قبل از وقت تفریط عقل" کے بارے میں تحقیقات کا آغاز کیا۔ یہ ذہنی خلل کی وہ حالت ہے جو قبل از وقت قوت عقلی میں تفریط کے باعث معرض وجود میں آتی ہے۔ اس نے اپنی تحقیقات میں نفسیات اور عضویات دونوں ہی سے کام لیا۔ جب ۱۹۰۴ء میں اس کی کتاب The Psychology of Dementia Praecox شائع ہوئی تو پہلی مرتبہ علمی حلقوں میں اس کا نام معروف ہوا۔ گو اس سے قبل بھی یہ مقالات لکھتا رہتا تھا مگر اس کتاب سے لوگوں کو احساس ہوا کہ نفسی معالجہ کی دنیا میں ایک ایسی شخصیت کی آمد آمد ہے جس سے بہت سی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

اگلے سال بلولر کے ساتھ مل کر اس نے سوئٹزرلینڈ میں نفسی معالجہ کے ماہرین کی تنظیم کی سعی کرتے ہوئے ۱۹۰۸ء میں سالزبرگ (SALZBURG) کے مقام پر پہلا بین الاقوامی اجتماع کرایا ۱۹۱۱ء میں اس نے سوئٹزرلینڈ کے سرکردہ ماہرین نفسیات کو اکٹھا کر کے ملک میں ایک باضابطہ اور منظم جماعت کی اہمیت پر زور دیا چنانچہ International Psycho-Analytic Society کی تشکیل عمل میں لائی گئی۔ ژنگ اس کا اولیں صدر تھا۔

اس دوران میں اس کی شہرت اپنے ملک سے نکل کر یورپ اور امریکہ میں پھیل چکی تھی، ادھر فرائڈ کے خیالات اور جنسی نظریات ابھی نئے نئے تھے اور ان پر خوب لے دے مچ ہوئی تھی۔ ژنگ نے بھی فرائڈ کا ژرف نگاہی سے مطالعہ کیا تھا۔ اس نے عام لوگوں کی مانند اس کے جنسی نظریات سے بھڑک کر ان کی اندھا دھند مخالفت نہ کی بلکہ فرائڈ کی حمایت میں کئی مضامین لکھے اور اس کے بعض الجھے پہلوؤں کی تشریح کی اس سے فرائڈ بہت خوش ہوا اور ۱۹۰۷ء میں اس نے ژنگ کو وی آنا آنے کے لیے دعوت دی جسے اس نے بخوشی قبول کر لیا چنانچہ اگلے سال فروری میں ان کی ملاقات ہوئی۔ یہ دونوں ہی ایک دوسرے سے بے حد متاثر ہوئے۔ یہ گھنٹوں طویل بحثوں میں الجھے رہتے اور دونوں اپنے اپنے تجربات اور ان سے اخذ شدہ نتائج پر روشنی ڈالتے اس کے بعد یہ سلسلہ خط و کتابت سے بھی جاری رہا۔ یہ وہ دور تھا جب فرائڈ کے معتمد دوستوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی اور فرائڈ ان سب میں سے ژنگ کی سب سے زیادہ عزت کرتا تھا۔ وہ اس کی ذہانت اور نفسیات کے لگاؤ سے اتنا متاثر ہوا کہ اسے یہ توقع بندھ گئی تھی کہ اس کے بعد تحلیل نفسی کی تحریک کو ژنگ نہ صرف چلا ہی سکے گا بلکہ وہ اسے انتہائی بلندیوں سے روشناس بھی کرا دے گا۔ فرائڈ نے بعض خطوط میں پدرانہ انداز اپناتے ہوئے اسے فرزند لکھا ہے

اس دوران میں ژنگ کو تلازمہ خیال سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ تلازم خیال کی تکنیک سے ناواقف تو نہ تھا کیونکہ اس دور میں لاشعوری محرکات کو منظر عام پر لانے کے لیے تلازم خیال کا طریقہ بہت مقبول تھا۔ خصوصیت سے گالٹن (GALTON) نے تو بعض ٹسٹ بھی وضع کر رکھے تھے ژنگ نے اس طریقہ کو ذہنی مریضوں پر کافی کامیابی سے آزمایا تھا چنانچہ اس نے اس پر باضابطہ تحقیقات کا آغاز کر دیا اور ایسے تجربات و مشاہدات کو جب اس نے (۱۹۰۳ء) Studies in Word Association کے نام سے شائع کیا تو علمی حلقوں میں اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ تلازم خیال جو ابھی تک محض ایک "طریقہ" ہی سمجھا جاتا تھا اب اس نے ایک باقاعدہ علم کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس نے جو ٹسٹ وضع کئے اور ہیجی لفظ اور اس کے جواب میں لیے جانے والے وقفہ کی پیمائش اور اس سے وابستہ ردِ عمل کی توضیح وغیرہ پر اس نے جس انداز سے روشنی ڈالی وہ اب نفسی معالجہ میں ایک مستقل روایت کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ ژنگ نے اس امر کی تشریح تو کی ہی تھی کہ پوشیدہ ہیجانی کیفیات اور ناآسودہ جذباتی کارکردگی کو اس کے ذریعہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ان کیفیات کی بنا پر معرض وجود میں آنے والے نفسی تموج کی وجہ سے نظام تنفس اور دورانِ خون میں تغیرات کی اہمیت سے بھی روشناس کرایا۔ اب تک تلازم خیال محض نفسیاتی حدود میں مقید تھا، مگر ژنگ نے پہلی مرتبہ اس کے عضویاتی پہلوؤں پر روشنی ڈال کر شخصیت کے صحت مندار تقاء کے لیے ان کی اہمیت متعین کی۔

۱۹۰۹ء میں اس کے علمی مشاغل، نفسی تحقیقات اور مریضوں کے معالجہ کا کام اتنا بڑھ گیا کہ اس نے برغوضلی کے ذہنی امراض کے شفاخانہ سے استعفیٰ دے دیا، البتہ زیورچ یونیورسٹی میں نفسی معالجہ پر اس نے لیکچر رشپ جاری رکھی اسی سال امریکہ کی کلارک یونیورسٹی نے فرائڈ اور ژنگ کو اپنے ہاں آ کر اپنے نظریات سے امریکی دانش وروں کو متعارف کرانے کی دعوت دی۔ فرائڈ کے ساتھ ساتھ اسے بھی اعزازی ڈگری دی گئی۔ امریکہ میں اس نے تلازمہ خیال پر تقاریر کیں۔ وہاں بھی فرائڈ اور یہ دونوں ساتھ ساتھ رہے۔ امریکہ میں قیام کے دوران فرائڈ اور ژنگ نے باہم تحلیل نفسی شروع کی لیکن بعد میں فرائڈ نے یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس نامکمل تحلیل نفسی کے بارے میں اب کسی قسم کی معلومات دستیاب نہیں ہو سکیں ورنہ اس سے ان دونوں سے (خصوصیت سے ژنگ) کی شخصیت کے بعض پنہاں خانوں پر روشنی پڑ سکتی۔

ژنگ کے علمی کردار کا یہ ایک خاص پہلو ہے کہ وہ کسی نظریہ کو محض اس وجہ سے تسلیم کرنے کو تیار نہ ہو جاتا کہ اس پر کسی عظیم یا مشہور الشان کے نام کی چھاپ لگی ہے۔ وہ فرائڈ کے نظریات سے متاثر تھا، وہ اس کی عزت کرتا تھا، اور اس کے نظریات کی جزوی صداقت کو تسلیم بھی کرتا تھا۔ لیکن یہ سب ایک حد تک تھا۔ اس نے جب برغوضلی کے مریضوں کی تحلیل کی تو اسے جنس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ (مثلاً مذہبی جذبات) ملا۔ اس طرح اپنے آزادانہ مشاہدات کی بنا پر یہ اس نظریہ پر پہنچا کہ لاشعور کی تشکیل صرف ناآسودہ جنسی جذبات اور تلخ یادوں ہی کی مرہون منت نہیں بلکہ اس میں نسلی خصائص، قومی کردار، ملکی روایات اور اساطیر بھی حصہ لیتی ہیں۔ اگر ایک انسان خواب میں سانپ دیکھتا ہے تو فرائڈ کے نزدیک وہ عضو تناسل کی نمائندگی کرتا ہے، لیکن ژنگ کے بقول یہ ابدیت کا مظہر قرار پائے گا جس زمانہ میں ژنگ برغوضلی میں تھا تو ایک دن ایک ۳۰ سالہ پرانا مریض اس کے پاس آیا اور اسے کوٹ سے پکڑ کر کھلی کھڑکی کی طرف لے گیا اور کہنے لگا "ڈاکٹر! اب آپ خود دیکھ لیں گے ذرا سورج کی طرف نظر کریں، دیکھیں یہ کس طرح حرکت کر رہا ہے، آپ بھی اپنے سر کو اس طرح حرکت دیں تو آپ کو سورج کا عضو تناسل نظر آ جائے گا، اسی نے ہوا کو جنم دیا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ آپ کے سر کی جنبش کے ساتھ ساتھ سورج کی طرح ادھر ادھر حرکت کرتا ہے۔" اگر اس وقت تو اس نے دیوانہ سمجھ کر اس کی بات پر غور نہ کیا لیکن چار برس بعد اس کی نظروں سے جرمن مورخ ڈیٹرچ کا ایک مضمون

گزرا جس میں دینیات کلاسیک کا یہ اقتباس بھی تھا:

"دوسری نماز کے بعد تم کو سورج کی تھالی مکمل ہوتی نظر آئے گی، اور اس میں سے تمہیں ایک ٹیوب لٹکتی ہوئی دکھائی دے گی جو ہوا کا مخزن ہے اور جب تم اپنا سر مشرق کی طرف جھکاؤ گے تو یہ بھی مشرق کی طرف حرکت کر جائے گی اور جب تم اپنا سر مغرب کی سمت لے جاؤ گے تو یہ بھی مغرب کی طرف جنبش کرنے لگے گی!"

واضح رہے کہ یہ کتاب مریض کی گفتگو کے چار سال بعد شائع ہوئی یہ واقعہ گویا اجتماعی لاشعور کے نظریہ کا نکتۂ آغاز تھا۔ جب اس کے ان ہی نظریات پر مبنی کتاب، مطبوعہ (۱۹۱۲ء) The Psychology of Unconscious شائع ہوئی تو اس نے اس میں فرائیڈ کے بعض نظریات پر تنقید کی۔ اس سے ان دونوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی اور ۱۹۱۳ء میں یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے لاتعلق ہو گئے۔

ژونگ کو فرائیڈ سے ایسے شدید ردعمل کی توقع نہ تھی، ویسے بھی اس نے ایڈلر اور فرائیڈ کی طبائع کے ایک خاص فرق کو محسوس کیا تھا، مسئلہ ایک سا ہوتا لیکن ہر دو کی تشریح میں اساسی نوعیت کا اختلاف ہوتا۔ یہ اختلاف ان کی طبائع کے زیر اثر تھا فرائیڈ اشیاء و مسایل کے خارجی پہلوؤں کو لیتا جبکہ ایڈلر ان کی داخلی ساخت سے زیادہ دلچسپی لیتا، اسی سے اس نے اپنے مشہورِ عالم نظریہ نفسیاتی ساخت کی تشکیل کی۔ اس نے انسانوں کو دو بڑے درجات — ظاہر بین اور باطن بین — میں تقسیم کیا۔ اس کے خیال میں فرائیڈ ظاہر بین تھا جبکہ ایڈلر اور وہ خود باطن بین تھے، اس نے ایک مرتبہ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے خود کو سینٹ آگسٹین (ST. AUGUSTIONE) کے اس مقولہ پہ کاربند بتایا تھا:

"تم باہر نہ جاؤ — بلکہ اپنے نفس کی گہرائی میں جھانکو۔ کیونکہ اس نہاں خانہ میں ہی صداقت ملے گی!"

چنانچہ اس نے اپنی خود نوشت سوانح عمری کے ابتدائیہ کا اختتام ان فقرات پر کیا:

"جوانی اور اس کے بعد خارجی موقرعات اور حادثات سبھی پرواردات قلبی نے اپنی مہر ثبت کی۔ میں جلد ہی اس نظریہ پر پہنچ گیا کہ اگر زندگی کی الجھنوں اور مسایل کا جواب اور حل، روح کے نہاں خانہ سے نہ ملے تو یہ الجھنیں اور مسایل بے کار اور غیر اہم ہیں ایسے خارجی حالات تبھی واردات کی کسی صورت سے بھی قائم مقامی نہیں کر سکتے، اسی لیے خارجی وقوعات کے ضمن میں میری زندگی ہتی رہی ہے۔ میں ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا کیونکہ میرے خیال میں یہ سطحی اور غیر اہم ہیں۔ میں تو خود کو صرف داخلی واردات کی روشنی ہی میں سمجھ سکتا ہوں۔ میری زندگی کی انفرادیت اور سرگزشت ان ہی سے عبارت ہے"

ایک اور جگہ بھی اس نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا:

"نہ تو میری یہ خواہش ہے اور نہ ہی مجھ میں اتنی استعداد کہ میں اپنی زندگی کا غیر جانبدارانہ طور سے جائزہ لے سکوں۔ ایسا کرنا اس غلطی کا اعادہ ہو گا جو اپنے حالات زندگی قلم بند کرنے والے تمام لوگ کرتے ہیں۔ جو لوگ زندگی کو اپنے پسندیدہ سانچہ میں پیش کرنے کی سعی نہیں کرتے وہ انہیں ایک معذرت نامہ کی صورت دے دیتے ہیں درحقیقت انسان ایک ایسا وقوعہ ہے جو اپنا محاسبہ خود نہیں کر سکتا بلکہ اپنے حسن و قبح کے لیے دوسروں کے فیصلہ کا محتاج ہے"

نفسیاتی ساخت کے نظریہ کی تشریح (۱۹۲۱ء) Psychological Types نامی کتاب میں کی گئی ہے۔

فرائیڈ اور تحلیل نفسی کے دبستان سے علیحدگی کے بعد سے اس کی اور اس کے نظریات کی انفرادی اہمیت اور بھی اجاگر ہو گئی۔ اب اس کے دبستان فکر کو تجزیاتی نفسیات یا بعض اوقات الجھاؤ نفسیات کے نام سے تعبیر کیا جانے لگا۔

اس کی علمی مصروفیات اس قدر بڑھ چکی تھیں کہ ۱۹۱۳ء میں اس نے زیورچ یونیورسٹی کی ملازمت سے بھی استعفیٰ دے دیا۔

اب یہ خود کو مستقل طور سے لاشعور اور دیگر ذہنی عوامل کی تحقیق کے لیے وقف کر دینا چاہتا تھا۔ ادھر اپنے مشاہدات اور قدیم تمدنوں کے مطالعہ سے اس نے تشکیلِ لاشعور کے بارے میں جو نظریہ وضع کیا تھا اسے مزید تقویت دینے کی غرض سے اس نے ۱۹۲۱ء میں شمالی افریقہ کا سفر اختیار کیا اور وہاں کے وحشی قبائل کے رہن سہن۔ اخلاق و عادات، تحریکات اور مذہبی و جنسی رسومات کا بغور جائزہ لیا۔ اس کے بعد اریزونا (ARIZONA) اور نیو میکسیکو میں PUEBLO INDIANS کا مطالعہ کیا ۱۹۲۶ء میں کینیا میں واقع ماؤنٹ ایلگن (MOUNT ELGON) کے نشیب پر بسنے والے قبائل کے مطالعہ اور بعد ازاں اس غرض سے امریکہ، ہندوستان، انگلینڈ اور بعض دیگر یورپی ممالک کا دورہ بھی کیا۔ جن علاقوں میں یہ خود نہ جا سکا وہاں کے ممتاز افراد سے اس بارے میں خط و کتابت سے معلومات فراہم کرتا رہتا۔ یہ خود موقعہ پر چشم دید مشاہدات کا قایل تھا بلکہ ماؤنٹ ایلگن کے قبایل میں تو یہ کافی عرصہ تک اسی غرض سے سکونت پذیر بھی رہا۔

بعد ازاں اسے قدیم چینی تہذیب و تمدن سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور اس دلچسپی کے پیش نظر اس نے فرینکفورٹ میں China Institute کے ڈائریکٹر رچرڈ ولہلم (RICHARD WILHELM) کے ساتھ رابطہ قائم کیا۔ رچرڈ ولہلم نے چینی فلسفہ اور شاعری کے قدیم نمونوں اور کلاسیکی تراجم اور ان کی تشریح کے سلسلہ میں خاص شہرت حاصل کی تھی چنانچہ دونوں کی مشترکہ مساعی کا نتیجہ The Secret of Golden Flower, تھی۔ یہ کتاب ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔

جس تیزی سے ژونگ کی شہرت دوسرے ممالک میں پھیلی ارباب وطن نے اس کی قدر و منزلت میں وہ تیزی نہ دکھائی۔ اسے زیورچ یونیورسٹی میں اس لیے لیکچرار سے ترقی نہ دی گئی کہ اس کے پاس وہاں کے سازشی ماحول میں جوڑ توڑ اور دھڑے بندیوں کے لیے وقت نہ تھا۔ اس کا خود بیان ہے کہ وہاں ہر وقت ایک دوسرے کے خلاف سازشیں ہوتی تھیں، میرے طلبہ کی تعداد دسترخی اور ان کے خیال میں یہ اتنی دھی کہ مجھے باقاعدہ پروفیسر بنایا جاتا یہ تو ۱۹۳۳ء تھا — جبکہ یہ اپنی شہرت کے نقطۂ انتہا پر تھا — جب اسے ٹیکنیکل یونیورسٹی میں پروفیسر کا عہدہ پیش کیا گیا یہاں یہ سات سال تک رہا اس کے بعد ۱۹۴۳ء میں باسل یونیورسٹی نے خاص اس کی خاطر طبی نفسیات کے شعبہ کا اجراء کرتے ہوئے اسے اس کا ناظم مقرر کیا مگر اس نے ایک سال بعد ہی استعفیٰ دے کر خود کو کلی طور سے تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر دیا۔

بیرونی ممالک میں سایا اور اس کے لیکچر بہت مقبول تھے چنانچہ ۱۹۰۹ء میں کلارک یونیورسٹی کی دعوت کے بعد ۱۹۱۲ء میں فورڈم (FORDHAM) ۱۹۳۴ء میں ہارورڈ (HARVARD) اور ۱۹۳۷ء میں ییل (YALE) کی یونیورسٹیوں نے اسے اپنے ہاں لیکچر کے لیے مدعو کیا۔ ۱۹۲۰ء میں اسے دوبارہ انگلینڈ آنے کی دعوت دی گئی یہاں اس نے کئی طبی اور نفسیاتی انجمنوں کے جلسوں میں لیکچر دیئے اسی طرح ۱۹۳۸ء میں جب آکسفورڈ میں "انٹرنیشنل کانگرس آف سائیکو تھراپی" کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو یہ اس کا صدر تھا اس کے خطبۂ صدارت کو علمی دنیا میں اس بناء پر ایک ممتاز مقام حاصل ہے کہ اس میں طبی نفسیات کے ضمن میں جو مختلف دبستان فکر قائم ہیں ان سب کے اشتراک کے امکانات کا جائزہ لیا گیا تھا۔

اس کے علاوہ اسے دنیا کی آٹھ یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈگریاں دی تھیں اور اسے علمی دنیا کے اعلیٰ ترین اعزازات سے نوازا گیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں ہارورڈ یونیورسٹی نے دنیا کی جن ممتاز ترین شخصیات کو اعزازی ڈگریاں دیں ان میں ژنگ بھی شامل تھا۔ ۱۹۳۸ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے اسے ڈی۔ ایس۔ سی کی ڈگری دی۔ واضح رہے کہ ژنگ پہلا . . . نفسیات دان ہے جسے انگلینڈ کی کسی یونیورسٹی نے یہ ڈگری دی۔ اسی طرح ۱۹۴۵ء میں جنیوا یونیورسٹی نے بھی اسے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ ان کے علاوہ ۱۹۳۸ء میں ہندوستان میں کلکتہ، بنارس اور الہ آباد کی یونیورسٹیوں نے بھی اسے ڈگریاں دیں۔

۱۹۳۰ء میں اسے جرمنی کی DEUTSCHE ARZTLICHE GESELLSCHAFT FUR PHYCHO—— THERAPIE کی اعزازی صدارت اور ۱۹۳۳ء میں International General Medical Society for Psycho-therapy کی صدارت تفویض کی گئی۔ ۱۹۳۲ء میں اسے زیورچ کا ادبی انعام ملا اور ۱۹۴۳ء میں Swiss Academy of Medical Science کی اعزازی رکنیت عطا کی گئی۔ ۱۹۵۵ء میں Swiss Federal Polytechnic نے اس کے اعزاز میں ایک خاص عشائیہ کا اہتمام کرتے ہوئے اسے ڈی۔ ایس۔ سی کی اعزازی ڈگری دی۔ علاوہ ازیں اسے لندن کی Royal Society of Medicine اور Royal Medico-Psychological Association کی اعزازی فیلوشپ بھی حاصل تھی۔

۲۶ جولائی ۱۹۵۵ء کو اس کی اسّیویں سالگرہ کے موقع پر اس کے شاگردوں نے (جن میں سے بعض خود بہت نامور ہوئے ہیں) اظہارِ سپاس کے لیے اس کی خدمت میں ان مضامین پر مشتمل کتاب پیش کی جو انہوں نے اس پر لکھے تھے۔ اس مقصد کے لیے ایک خصوصی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں شرکت کے لیے سوئٹزرلینڈ کے علاوہ بیرونی ممالک سے بھی بعض مندوبین نے شرکت کی تھی۔

دورانِ جنگ نازیوں نے اپنے مقاصد کے پرچار کے لیے اس کے نظریات کا خوب استحصال کیا، بلکہ انہوں نے ایک جرنل بھی نکالا جس کی ادارت اسے سونپی گئی۔ بعض لوگوں نے اس ادارت کی بنا پر ژنگ پر کافی تنقید کی اور اسے نازیوں کا آلۂ کار بننے کا طعنہ دیا گیا۔ لیکن اصل حقیقت کا خود ژنگ نے بھی ۱۹۴۷ء میں انکشاف کیا یہ صرف مجبوری کی وجہ سے نازی پرچے سے وابستہ تھا۔ اس کے باوجود بھی نازی اس سے خوش نہ تھے بلکہ اسے خطرناک سمجھتے تھے اور ان کی "بلیک لسٹ" میں اس کا نام بھی شامل تھا۔ اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ جب جرمن فرانس میں داخل ہوئے تو انہوں نے اس کی تصانیف کے تمام فرانسیسی تراجم تلف کر دیئے تھے۔

ژنگ کی تمام زندگی مسلسل کام اور محنت کی زندگی ہے۔ اس نے نہ صرف بہت ہی لکھا بلکہ اس نے ان موضوعات پر بھی لکھا — ایسے موضوعات جن کا بظاہر نفسیات سے کوئی تعلق ہی نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً کیمیا گری — کیمیا گری ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ اور مشرقی ممالک کی ایک خاص چیز ہے اسے پیتل کو سونا بنانے سے دلچسپی نہ تھی بلکہ اجتماعی لاشعور کے نظریہ کی تشکیل کے سلسلہ میں اس نے اس کا مطالعہ کیا۔

اس نے تقریباً تیس ضخیم جلدیں اور مختلف جرائد میں سو کے لگ بھگ مقالات تحریر کئے۔ تقاریر اور صدارتی خطبے ان کے علاوہ ہیں۔ اس سے کسی نے پوچھا کہ آپ اتنا کام کیسے کر لیتے ہیں، تو اس نے جواب دیا ہمارے ملک کے بزرگوں میں ایک بڑا عام مرض یہ ہے کہ یہ لوگ کھیل تماشوں اور دل بہلاؤں کے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی شائق ہیں اس طرح یہ لوگ ایک دوسرے کے گھر آنے جانے اور دعوتوں کے چکر میں ہی تمام وقت ضائع کر دیتے ہیں لیکن میں ایسا نہیں کرتا مجھے اپنے وقت کی قیمت اور اپنے کام کی اہمیت کا احساس ہے اس لیے میں اسے ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔

اپنی ذہنی مصروفیتوں کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ "میری تمام تحریروں کو داخلی حرکات کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ کام مجھ پر داخلی طور سے مسلط کیا گیا تھا میں نے جو کچھ بھی لکھا اس نے اندر سے خود بخود اظہار کی صورت پائی۔ میں نے اپنی روح کو الفاظ کی صورت میں گویائی عطا کی ہے!"

ایک اور جگہ اس نے لکھا:

"میری زندگی کیا ہے — ؟

میرے علمی کارنامے۔ ایک کو دوسرے سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا"

اس کی تحریروں میں رچی ہوئی گہری علمیت کی وجہ سے بعض اوقات عوام کے لیے اسے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے ژنگ کو ایک لحاظ سے عوام میں وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جس کا یہ مستحق تھا۔ حالانکہ اس کی بعض اصطلاحات — مثلاً "الجھاؤ" — ہر پڑھا لکھا شخص استعمال کرتا ہے لیکن اکثر لوگ اسے ژنگ کی نہیں بلکہ فرائیڈ کی وضع کردہ سمجھتے ہیں۔ ایک بات اور بھی ہے۔ فرائیڈ کے مطالعہ میں فرد کو اپنی دلچسپی کا کافی سامان مل جاتا ہے اور مطالعہ کے دوران اسے اپنی کئی الجھنوں، پریشانیوں اور نفسیاتی مسائل کے بارے میں واقفیت ہوتی جاتی ہے لیکن ژنگ کے ہاں عموماً ایسا نہیں ہے، مثلاً ایک عام انسان کے لیے بھلا Psychology and Alchemy (1944) میں دلچسپی کے لیے کیا رکھا ہے۔

اس کا خود ژنگ کو بھی احساس تھا چنانچہ اس نے ایک مرتبہ ایک انٹرویو میں کہا تھا "میری کتابیں کوئی بھی نہیں پڑھتا" اسی طرح ایک مرتبہ اس نے ہنستے ہوئے بتایا "شاید ہی کوئی ایسا برا خطاب بچا ہو جس سے مجھے نہ نوازا گیا ہو — بلکہ پہلے تو مجھے ایک دیوانہ سمجھ کر مجھ پر نکتہ چینی کی جاتی تھی۔"

اپنے نظامِ فکر کی مشکل پسندی کی بنا پر ژنگ زیورچ کی Swiss Federal Institute of Technology میں اپنی تعلیمات پر انگریزی داں لوگوں کے لیے سیمینار منعقد کرتا رہا، اور دور دور سے لوگ اس کے نظریات کو سمجھنے کے لیے آتے تھے بعد میں جب یہ سیمینار کے لیے وقت نہ نکال سکتا تھا تو C. G. Jung Institute کے نام سے ایک ایسے مستقل ادارہ کی تشکیل کی گئی جہاں نہ صرف ایک بہترین لائبریری کی سہولتیں مہیا کی گئی تھیں بلکہ ماہرین اس کے نظریات کی تفہیم کے لیے لیکچر دیا کرتے ہیں۔ اس کی تعلیمات سے بڑھتی ہوئی دلچسپی کے پیشِ نظر لندن میں The Society of Analytical Psychology کے نام سے ایک اور ادارہ کا قیام عمل میں لایا گیا جو گو زیورچ کے ادارہ جتنا بڑا تو نہیں لیکن اس کا طریقِ کار ان ہی خطوط پر استوار ہے۔ علاوہ ازیں سوئٹزرلینڈ، انگلینڈ اور امریکہ کے بعض اہم مقامات پر اس کے نظریات کے فروغ اور اس کی تعلیمات سے واقفیت پیدا کرانے کے لیے Analytical Psychology Clubs بھی قائم کئے گئے ہیں۔

یہ شادی شدہ تھا۔ ۱۹۰۳ء میں اس نے ایما روشن بش EMMA RAUSCHENBUSH کے ساتھ شادی کی۔ نیلی آنکھوں والی ایما اس کی صرف بیوی ہی نہ تھی بلکہ بیک وقت دوست، محبوبہ اور سیکرٹری بھی تھی، اسے خود

بھی نفسیات سے دلچسپی تھی اور ۱۹۴۸ء میں ژونگ انسٹی ٹیوٹ میں وہ نفسیات کی لیکچرر بھی رہی تھی۔ کسی عظیم شخصیت کی بیوی بننا آسان نہیں کیونکہ اس صورت میں عموماً عورت کی اپنی انفرادیت دب کر رہ جاتی ہے۔ لیکن ایما کی مسکراہٹ، اس کا خلوص اور ژونگ سے اس کی محبت ـــ یہ سب ملنے والے پرانمٹ تاثرات چھوڑتے، اس کی گھریلو زندگی بڑی پرسکون تھی اولاد چار بیٹیوں اور ایک بیٹے کی شادی کے بعد اس کے پوتوں اور دوھتوں کی تعداد انیس بنتی ہے۔ اور پھر ان میں سے بھی دو صاحب اولاد ہیں کیونکہ ژونگ کے نزدیک صحت مند اولاد کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے یہ بیان بے موقع نہ ہوگا کہ یہ سبھی ذہنی لحاظ سے صحت مند اور خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کی بیوی کا انتقال ۱۹۵۵ء میں ہوا۔

ژونگ سے ملنے والا سب سے پہلے اس بنا پر متاثر ہوتا کہ یہ اپنی تحریروں کے پیدا کردہ تاثر سے قطعی مختلف تھا۔ لمبا قد، عقابی ناک، چوڑے شانے، فراخ سفید اور گوشت سے بھرا ہوا سینہ، چوڑے چوڑے ہاتھ پاؤں، بھاری آواز اور بات چیت کا بے تکلف لہجہ۔ اس "صوفی" اور "کیمیاگر" سے بالکل مختلف تھا، جو اس کی تحریروں میں جا بجا جھلکتا ہے۔ اس کے شوق اور فارغ اوقات بسر کرنے کے طریقے بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ کوہ پیمائی، تیراکی، کشتی رانی وغیرہ سے اسے بہت دلچسپی تھی یہ میلوں لمبی سیر کیا کرتا تھا اور جب تک بڑھاپے نے اس کی صحت کو خراب نہ کیا اس کے ان مشاغل میں فرق نہ آیا۔ مجموعی لحاظ سے یہ ایک فلاسفر اور ماہر نفسیات نہ نظر آتا تھا بلکہ ایک دہقان معلوم ہوتا تھا۔ صحت مند جسم، صحت مند گفتگو اور صحت مند قہقہہ!

اسے ظاہر داری اور دوسروں پر اپنی علمیت کا رعب جھاڑنے سے سخت نفرت تھی ـــ گو بعد میں یہ عوامی زندگی سے تقریباً منقطع سا ہو گیا تھا لیکن پھر بھی اس کے پاس آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور اکثر لوگ اس کی شہرت اور علمیت کی وجہ سے مرعوب سے آتے تھے لیکن یہ ان کے ساتھ اس بے تکلفی سے گھل مل کر بیٹھتا، کہ ملاقاتی جلد ہی اس سے بے تکلف ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی اور اپنی مہربان نظروں سے ـــ پائپ کا دھواں اڑاتے ہوئے ـــ دوسرے کا جائزہ لیتا تو ملاقاتی کو یہ احساس ہوتا کہ وہ کسی عظیم شخصیت کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے ایسے ہی انسان کے ساتھ محو گفتگو ہے۔ تمام دنیا اسے خراج عقیدت پیش کر چکی تھی مگر اس نے اپنی سادگی اور منکسر المزاجی کو نہ چھوڑا۔ جس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جب یہ اپنے گھر کی تعمیر کرا رہا تھا تو یہ کام میں مزدوروں کی امداد کرتا رہا۔ گو اس کے کمرہ میں کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں چھت کو چھوتی تھیں مگر اس نے کبھی بھی اپنی گفتگو کو ان کتابوں کے اوراق کا خلاصہ نہ بنایا۔

ویسے تو اس کی صحت ہمیشہ سے ہی اچھی رہی تھی لیکن ـــ PHLE BITIS میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس کی صحت کافی خراب ہو گئی، بعد میں اس کا دل اور دوران خون بھی متاثر ہو گئے۔

اس سے ایک مرتبہ خدا کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا: "میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں اس پر اعتقاد رکھتا ہوں ـــ لیکن میں اسے جانتا ہوں۔" اسی طرح ایک اور انٹرویو میں اس نے بتایا تھا کہ "خدا کی ذات پر ایمان کی انہیں اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ انہیں اجتماعی لاشعور کے گہرے اور دیرپا مطالعہ اور نفسی تجربہ کی حقیقت پر ایمان ہے۔" خدا کو سائنٹیفک طور پر سمجھنے کی کوشش کرنا ممکن ہے بعض لوگوں کے نزدیک کفر ہو لیکن ژونگ کا رویہ تخریبی نہ تھا۔ وہ تو دور جدید کی سائنسی روح اور روایتی انداز نظر کا سمجھوتہ کرانے کی کوشش کرتے ہیں ـــ اسی طرح موت کے بارے میں بھی اس نے بڑی حقیقت افروز بات کہی تھی۔

"نفسیاتی لحاظ سے موت بھی زندگی اتنی اہمیت کی حامل ہے، جس طرح ایک تیر نشانہ کی طرف محو پرواز ہوتا ہے۔ یوں ہی زندگی موت میں ختم ہو جاتی ہے جو ہم سب کا نشانہ ہے۔ اس سے ڈرنا غیر صحت مندانہ اور مریضانہ رجحان کا غماز ہے جس کی بنا پر زندگی کا بقیہ نصف حصہ اپنے مقصد سے محروم رہ جاتا ہے۔" اسی طرح ایک اور موقعہ پر اس نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا:

"موت ایک انتہا تو ہے لیکن ہم اس انتہا کے متعلق پر یقین نہیں ہیں سچی بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی اس کے متعلق پر یقین ہو نہیں سکتا۔ چونکہ نفس کی کچھ خاص صلاحیتیں ہیں جن کے سبب اسے زمان و مکان کا پابند نہیں کیا جا سکتا . . . اور جب نفس زمان و مکان کے اصولوں کا پابند نہ ہو اور جیسا کہ ہے بھی نہیں تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ زندگی مسلسل طور پر جاری رہتی ہے ـــ زمان و مکان سے ماورا ایک نفسی زندگی!"

اسی لیے یہ خود بھی موت سے خوف زدہ نہ تھا۔ یہ کچھ عرصہ سے بیمار چلا آ رہا تھا اور جون کے ابتدائی ایام میں تو اس کی حالت اتنی خراب تھی کہ اس کی انگریز بائیو گرافر مس مردقہ بیل کے بقول اس کی موت ایک یقینی امر بن چکی تھی۔ مگر یہ بڑے سکون سے تھا اور کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ موت کے منڈلاتے سایہ نے اسے خوف زدہ کر رکھا ہے اور آخر کار گستاو ژونگ کی زیست جو پچھلے ۸۵ سالوں سے ایک تیر کی مانند محو پرواز تھی ۶ جون ۱۹۶۱ء کو اپنے نشانہ تک جا پہنچی۔

نظریات

جہاں تک ژونگ کے نفسیاتی نظریات کا تعلق ہے تو اس میں اور فرائیڈ میں اساسی نوعیت کا سب سے بڑا اختلاف یہ ہے کہ فرائیڈ کے ہاں تحلیل نفسی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور باقی نظریات اس سے پھوٹنے والی کرنوں کی مانند ہیں، لیکن ژونگ کے ہاں کسی ایسے مرکزہ کا فقدان ہے نہ ہی اس نے ـــ فرائیڈ کے برعکس ـــ ایک باضابطہ دبستان قائم کرنے کی غرض سے اپنے نظریات کو منظم صورت میں پیش کیا۔ ژونگ کو خود بھی اس کا احساس تھا ۱۹۵۲ء میں فریڈا فورڈھم کی کتاب کے پیش لفظ میں اس نے خود ہی لکھا!

"جہاں تک نفسی الجھنوں کا تعلق ہے تو میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے کوئی ایسا باضابطہ قسم کا نظریہ وضع کر لیا ہے جس کے ذریعہ سے تمام ـــ یا ان الجھنوں کے اہم حصوں کی بھی تشریح کی جا سکتی ہو۔ میرے نظریات کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ کا ایک سلسلہ قرار دیا جا سکتا ہے ـــ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انجان حقائق کا احاطہ کرنے کی سعی کی گئی ہے اور اسی لیے میرے خیالات کو (عوام کے لیے) سیدھے سادے اور واضح انداز سے پیش کرنا قدرے مشکل کام ہے۔"

ژونگ کے مطالعہ کے سلسلہ میں قاری کو جو دوسری مشکل پیش آتی ہے، اور جس کی وجہ سے اس کے نظریات کو بعض اوقات پوری طرح سے سمجھا بھی نہیں جا سکتا وہ یہ ہے کہ اس نے عموماً قدیم اصطلاحات کو جدید مفہوم کے ساتھ استعمال کیا پھر جیسے جیسے اس کے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی گئی اس نے ان قدیم اصطلاحات کے جدید معانی کو اور بھی جدید تر کر دیا ہے۔ اس سے بعض اوقات بڑی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اس نے ذہن اور ذہنی کارکردگی کے لیے عام "روح" جیتے ہوئے "نفس" اور نفسی کی اصطلاحات استعمال کی ہیں اب جیسے ان سے وابستہ کئے گئے اس مفہوم سے

آشنائی نہ ہو اس کے لیے تو ژنگ کی تمام نفسیات اچھی خاصی مابعد الطبیعات بن کر رہ جائے گی۔

ژنگ کی تعلیمات کو — فرائڈ کے برعکس — ایک مربوط سلسلہ میں پیش کرنے کی بجائے اس کے اہم ترین نظریات کو جداگانہ عنوانات دے کر ان کی وضاحت اس انداز سے کی گئی ہے کہ قاری ان کی گہرائی سے واقف ہو جائے۔

۱۔ نظریۂ لاشعور

یہ ژنگ کے مشہور ترین نظریات میں سے ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ فرائڈ نے لاشعور کو جس مقام پر چھوڑا تھا ژنگ نے اپنی تحقیقات کا آغاز ہی اس مقام سے کیا ہے۔

اس کے بقول صرف ذاتی لاشعور اور اجتماعی لاشعور کا وجود ہے۔ وہ قبل شعور کو تسلیم نہیں کرتا۔ "اجتماعی" کا لفظ ایسا ہے جس سے کئی طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہے لیکن اس کا سیدھا سادا مفہوم یہ ہے کہ اسے "ذاتی" کا الٹ سمجھنا چاہیے۔

ژنگ نے ۱۹۱۷ء میں اجتماعی لاشعور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

ذاتی لاشعور

ژنگ کے نزدیک لاشعور — شعور کی کوکھ ہے کیونکہ یہیں سے حیات کے امکانات نو جنم لیتے ہیں یا اسے یوں سمجھئے کہ سمندر میں ایک جزیرہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم اس کے صرف ان ہی حصوں کو دیکھ سکیں گے جو سطح سمندر سے بلند ہیں لیکن اس کی نچلی تہوں سے ہم ناواقف رہتے ہیں یہی شعور اور لاشعور کا حال ہے جبکہ اس جزیرہ کو انا سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے یہ شعور کا مرکزی نقطہ ہے کیونکہ انسان کی "میں" اس سے عبارت ہے۔ انا کی حالت کافی نازک ہوتی ہے، اس کے ایک طرف "اجتماعی شعور" (معاشرتی اور سماجی اقدار) ہے تو دوسری طرف اجتماعی لاشعور، دونوں میں ہی بلا کی کشش اور قوت ہوتی ہے اور انا کو اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے کافی سے زیادہ جدوجہد اور سعی سے کام لینا ہوتا ہے۔ اگر وہ اول الذکر میں خود کو مدغم کر دیتی ہے تو اس صورت میں وہ فرد تشکیل پاتا ہے جسے ہم "سماجی آدمی" کہہ سکتے ہیں۔ اگر وہ موخر الذکر کے آگے ہتھیار ڈالتی ہے تو یوں وہ سب جہاں سے الگ تھلگ ہو کر خاموش، خلوت پسند، مذہبی دیوانوں اور عام جنونیوں کو جنم دیتی ہے۔

ژنگ دباؤ کے عمل کو تسلیم کرتا ہے اسی طرح بعض ناخوشگوار یادیں اور حادثات بھی بھلائے جاتے ہیں لیکن یہ سب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شعور سے خارج نہیں ہو جاتے بلکہ انا اور لاشعور کے درمیان اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ یہ کیفیت ایک ایسی سرزمین سے مشابہ ہے جو روشنی اور تاریکی کے درمیان واقع ہو اور جسے ہم "سایوں کی بستی" قرار دے سکتے ہیں۔ اصولی طور سے تو سایوں کی یہ بستی انا ہی کا ایک حصہ ہے۔ یا جزیرہ کی مثال کے لحاظ سے یہ جزیرہ کا وہ حصہ ہے جو ہمیشہ زیر آب نہیں رہتا — اسی کو ژنگ نے ذاتی لاشعور کا نام دیا ہے!

اگر ذرا بھی ژرف نگاہی سے کام لیا جائے تو ژنگ کا ذاتی لاشعور اور فرائڈ کا لاشعور دونوں ایک ہی ہیں۔ کیونکہ دونوں کی تشکیل میں دباؤ، ناخوشگوار حادثات کی پیدا کردہ تلخ یادوں اور فراموش شدہ ناکام آرزوؤں کا ہاتھ ہے اسی طرح یہ ان خواہشات اور تمناؤں کا بھی مسکن ہے جو ابھی شعور میں نہیں آئیں مگر جنہوں نے بالآخر شعور میں آنا ہے اسی طرح خواب اور فانتزیاں بھی اسی کی بنا پر ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

یہ ذاتی اس لحاظ سے ہے کہ بعض مشترک خصائص کے باوجود بھی ہر فرد کے لاشعور کا یہ حصہ اس کے ذاتی اور نجی تجربات کا مرہون منت ہوتا ہے۔ اجتماعی لاشعور کے برعکس یہ وہبی نہیں بلکہ اکتسابی ہے۔ اور اس بنا پر ژنگ کے خیال میں ہر فرد کے لیے ذاتی لاشعور جداگانہ نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔

اجتماعی لاشعور

مگر اجتماعی لاشعور (ژنگ نے بعض اوقات اسے معروضی بھی کہا ہے)، کی بات اور ہے، یہ انفرادی تجربات سے ماوراء، نسل، قوم اور ملت کے ان مخصوص رجحانات کا آئینہ دار ہے جن کی تشکیل میں صدیاں حصہ لیتی ہیں اس لیے اسے "ذاتی" کا الٹ بتایا گیا تھا، اجتماعی لاشعور سب میں مشترک ہوتا ہے۔

ایک بچہ جب کسی نسل میں جنم لیتا ہے تو حیاتیاتی اور تاریخی لحاظ سے بعض خصائص اور اوصاف اسے اس بنا پر ورثہ میں ملتے ہیں کہ وہ اس مخصوص نسل سے تعلق رکھتا ہے اور جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جائے گا تو اس کے ذاتی تجربات کے ساتھ ساتھ اجتماعی لاشعور کے بعض خصائص شعور میں آتے جائیں گے۔

انسانیت نے جو تجربات ان کے حسن و قبح سے قطع نظر — کئے، اور ان تجربات کے پیچھے انسانی ارتقاء کی صدیاں پوشیدہ ہیں وہ کبھی بھی ضائع نہیں جاتے بلکہ ہر نو زائیدہ کو ورثہ میں اس کے صدیوں پرانے آباؤ اجداد کے تصورات، خواب، اچھائیاں اور برائیاں بھی ملتی ہیں۔ البتہ یہ یاد رہے کہ اجتماعی لاشعور، اپنی خصوصیت کے اعتبار سے "غیر جانبدار" ہے۔ یہ اپنے آپ کو (فرائڈ کے لاشعور کی مانند) فرد پر مسلط کرنے کی سعی نہیں کرتا بلکہ اس کے تجربات کے ساتھ ساتھ یہ بھی اپنی موجودگی کا ثبوت دیتا رہتا ہے اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے ہی ژنگ نے اس کے لیے "معروض نفسی" کی اصطلاح وضع کی تھی۔ فرد کا شعور ہمیشہ ذاتی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے داخلی لحاظ سے سوچتا ہے جبکہ اجتماعی لاشعور ایسا نہیں ہے یہ ہمیشہ خارجی نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھتا ہے۔

اجتماعی لاشعور کی تشکیل میں صدیوں قبل کا تجرباتی مواد حصہ لیتا ہے اس لیے اپنی ماہیت کے اعتبار سے یہ نہ صرف بے حد گہرائی بلکہ وسعت کا بھی حامل ہوتا ہے۔ اجتماعی لاشعور کو مزید دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ ذاتی لاشعور کے قریب واقع ہے اور اس حصہ میں ایسے ہیجانات، جذبات اور ابتدائی محرکات ملتے ہیں جن پر ایک حد تک عقل سے گرفت کی جا سکتی ہے اس کے بعد کا حصہ وہ ہے جہاں اجتماعی لاشعور کا مرکز موجود ہے۔ اور یہی وہ حصہ ہے جو انسانی فہم سے بالاتر ہے خود انا بھی اس کی ماہیت کو نہیں سمجھ سکتی اور نہ ہی شعور اس کے مرکزی نقطہ کا مکمل طور سے ادراک کر سکتا ہے۔

اس سے پہلے یہ کہا جا چکا ہے کہ اجتماعی لاشعور کو صدیوں قبل کے نسلی تجربات ورثے میں ملتے ہیں۔ یہاں ورثہ کا لفظ قدرے ابہام پیدا کر دیتا ہے۔ ورثہ سے ژنگ کی یہ مراد ہے کہ فرد کے دماغ کی ساخت کا — اس کی نسل کے قدیم تجربات پر بالخصوص اور انسانیت کے تجربات پر بالعموم — انحصار ہوتا ہے بقول ژنگ:

"گو ہمارا ورثہ نفسیاتی نوعیت کا ہوتا ہے لیکن پھر بھی یہ ہمارے قدیم آباؤ اجداد کے اعمال ذہن تھے، جنہوں نے ان کو جنم دیا جو ہمیں ورثہ میں ملتے ہیں اور اگر یہ دوبارہ فرد کے شعور میں آتے ہیں تو یہ صرف اعمال ذہن ہی کی صورت میں آتے ہیں۔ گو یہ اعمال — فرد کے ذاتی تجربات کی بنا پر — اسے ذاتی تجربات ہی معلوم ہوتے ہیں۔ حقیقت میں یہ انہی قدیم تجربات کے سانچے ہیں اور یوں فرد کے ذاتی تجربات ان سانچوں کو "بھرنے" کا کام کرتے ہیں۔"

اساسی نقش

جس عمل کے تحت فرد کو اجتماعی لاشعور ورثہ میں ملتا ہے اسے اساسی نقش کی اصطلاح سے واضح کیا جاتا ہے۔ بقول ژنگ جس طرح جبلت انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی زندگی انسانوں کی مانند بسر کرے اسی طرح اساسی نقش وجدان اور ادراک کی یوں تشکیل کرتے ہیں کہ وہ خاص انسانی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔"

— — — — — — — اساسی نقوش لاشعوری ہوتے ہیں۔ ژنگ نے اس — — — — — اصطلاح کو کافی وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے بلکہ اس کے نزدیک تو حیوانوں میں بھی بعض قسم کے اساسی نقوش پائے جاتے ہیں یہ ہمارے قدیم آباؤ اجداد کی آرزوؤں، خوف اور خوشیوں کے آئینہ دار ہیں حیات و ممات سے متعلق جذبات بھوک، پیاس، خطرہ کا احساس، جنسی رفیق کی طلب، حسد اور غم و غصہ — یہ سب ان اساسی نقوش کے توسط سے فرد کو ورثہ میں ملتے رہتے ہیں یہاں ایک مرتبہ پھر اس امر کی وضاحت کر دی جائے کہ یہاں بھی ورثہ سے مراد اس نفسی عمل کا اظہار ہے جو اس صورت میں ورثہ میں ملتا ہے کہ خود نفس کی تشکیل میں بھی یہ عناصر موجود ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اساسی نقوش نفس ہی کا ایک حصہ ہیں۔

اساسی نقوش کو باعتبارِ نوعیت دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک صورت میں تو یہ اس تمام نفسی عمل کے مظہر ہیں جو نوعِ انسانی سے وابستہ ہے اور ایسا یہ فرد میں عالمگیر رجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اپنی دوسری صورت میں اساسی نقوش اس وقت تک محض رجحانات ہی کی صورت اختیار کئے رہتے ہیں جب تک یہ عام زندگی کا ساتھ دیتے ہوئے اپنے عصر کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے اظہار کی باقاعدہ صورت نہیں اختیار کر لیتے۔

جہاں تک ان کی ماہیت کا تعلق ہے تو ان کی دو اور دو چار کی صورت میں وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک . . خاصے معمہ کی مانند ہیں، خود ژنگ کو بھی اس کا احساس تھا چنانچہ اس نے ایک مرتبہ کہا تھا۔

"اساسی نقوش سے وابستہ مواد کے اظہار کی اولیں اور ابتدائی صورت استعاراتی ہوتی ہے" ایک اور جگہ اس نے یوں لکھا:

"یہ ہماری فہم سے بالاتر ہیں کیونکہ یہ ہماری فہم کی ایجاد نہیں اسی طرح ایک ورجگہ "آپ ایک اساسی نقش کی دوسرے کے ساتھ مشابہت قرار دے کر تشریح نہیں کر سکتے۔ یعنی یہ کہنا ناممکنات میں سے ہے کہ یہ کہاں سے آتے ہیں"

انہیں ہم الجبرا کی "ل" قرار دے سکتے ہیں جو اپنے "عدم وجود" کے باوجود تمام اضافت کے لیے سنگِ اساس کا کام کرتی ہے یہی حال اساسی نقوش کا ہے ان کی تشریح تو صرف ان کے نتائج کا مطالعہ کرنے سے ہی ہو سکتی ہے۔ ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ ژنگ کے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ "بلحاظِ تعریف اساسی نقوش ان رجحانات اور مدعات سے عبارت ہیں۔ جن کی بنا پر نفسی عناصر بعض مخصوص تصورات کی صورت میں ترتیب پا جاتے ہیں۔ . . . لیکن اس ترتیب کی صورت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ ان کی شناخت صرف ان کے پیدا کردہ نتائج کے مطالعہ سے ہی کی جا سکتی ہے۔"

ان کا مسکن اجتماعی لاشعور ہے اس لیے ان کی گہرائی کو ناپا نہیں جا سکتا اور ان کی ماہیت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ لاشعور کی زبان تصویری زبان ہے یعنی لاشعوری محرکات و کیفیات کو صرف تمثیلی انداز سے ہی سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے اسی لیے اساسی نقوش بھی اشاراتی اور کشفی طریقہ سے ظاہر ہوتے ہیں اس ضمن میں ژنگ نے قدیم اساطیر عوامی کہانیوں اور وحشی قبائل کے رسوم و روایات کے مطالعہ کے بعد ثابت کیا ہے کہ ان سب میں تنوع کی جو بظاہر بوقلمونیاں نظر آتی ہیں وہ دراصل ان اساسی نقوش کی وجہ سے زمان و مکان کے بُعد کے باوجود بھی اساسی لحاظ سے بعض مشترک خصائص کی حامل ہیں۔ پیدائش کے بارے میں اساطیری اور مذہبی کہانیاں سانپ کی مذہبی اہمیت، عظیم مادر، فردوس، تثلیث اور جوگوشیہ کی تقدیس — یہ سب دراصل اساسی نقوش ہی کے اظہار کی مختلف صورتیں ہیں، اس طرح مادرانہ شفقت کے اساسی نقوش ان تمام مظاہر کے نمائندہ ہیں جن پر اس نقطہ کا اطلاق کیا جا سکتا ہے مثلاً پناہ دینے والا غار، گرجا، کہانیوں میں مددگار پری، ڈائن یا چڑیل اور دیا بھرا تھا "ماں" اسی طرح خدا، باپ اور دیگر اساسی نقوش انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔

ژنگ کے خیال میں خدا کے تصور سے وابستہ اساسی نقوش کی بے حد اہمیت ہے کیونکہ جب یہ مکمل طور سے اظہار نہیں پا سکتے تو فرد اعصابی خلل کا شکار ہو جاتا ہے۔

اشاریت

جب اساسی نقش زمان و مکان کی حدود میں اپنے اظہار کے لیے کوئی صورت تلاش کرتا ہے۔ تو اس صورت کو ہم اشاراتی کہہ سکتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر ہر اشارہ بیک وقت اساسی نقش بھی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک اساسی نقش کا اشارہ ہونا بھی لازمی ہے۔

اساسی نقش نفس کی اجتماعی توانائی ہے اور کیونکہ یہ لاشعوری ہیں اس لیے اشارات کی تشکیل کا عمل بھی لاشعوری ہوتا ہے یہ وجدانی ہیں اور صرف ان ہی کے ذریعہ سے انسان حقیقت کے ان پہلوؤں سے بھی آشنا ہو سکتا ہے جو حیاتی تجربات سے ماورا ہیں۔ ژنگ کے بقول وہ اشارہ جو لاشعور سے جنم لیتا ہے اور جو فرد کے لیے صحیح معنوں میں مفید ہے، وہی "زندہ" اشارہ ہے کیونکہ صرف اس اشارہ کی وجہ سے ہی وہ بیرونی دنیا کا ایک خاص انداز سے ادراک حاصل کرتا ہے۔ یہ اشارہ معانی کا مخزن ہوتا ہے، جب تک اس کے معانی فرد کے لیے مشعلِ راہ بنتے رہتے ہیں اس وقت تک یہ اشارہ زندہ رہتا ہے لیکن جب ایسا نہ ہو سکے تو وہ اشارہ اپنی سماجی حیثیت کھو کر "مردہ" ہو جاتا ہے۔

ایک بات اور — اشارہ کی تشکیل کا عمل عقلی یا علمی نہیں ہوتا۔ کوئی فرد اپنے یا دوسروں کے لیے اشارات وضع نہیں کر سکتا۔ گو ان سے معاشرہ اور سماج متاثر ہوتے ہیں مگر کوئی معاشرہ یا سماج شعوری طور سے ان کو وضع نہیں کر سکتا۔

ژنگ نے اشارہ اور علامت میں حدِ امتیاز کھینچ کر دونوں کی وضاحت کی ہے علامت ایک محسوس اور حقیقی چیز کی نمائندگی کرتی ہے یا اس کی متبادل ہوتی ہے جب کہ اشارہ اس سے کہیں زیادہ وسیع مفہوم کا حامل ہوتا ہے۔ یہ بعض ایسی نفسی کیفیات کا مظہر ہوتا ہے جو الفاظ کی قید میں نہیں لائی جا سکتیں۔ مثلاً صلیب ایک غیر مسیحی کے لیے محض ایک علامت کی حیثیت رکھتی ہے، جبکہ ایک عیسائی کے لیے یہ رحم، دکھ، اور گداز قلب کا اشارہ ہے۔

سانپ کسی زمانہ میں عبودیت کا اشارہ تھا۔ اس وقت یہ ایک "زندہ" اشارہ تھا کیونکہ اس سے اس مخصوص دور کے لوگوں کو حقیقت کے سمجھنے میں امداد ملتی تھی۔ اور اس کی وساطت سے وہ کئی غیر محسوس حقائق کا ادراک کر سکے مگر آج کل یہ "مردہ" اشارہ ہے۔ کیونکہ اب سانپ کو اشارہ بنا کر ہم کسی مجرد حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔

گو ایک اشارہ مجرد حقائق کی فہم کا باعث بنتا ہے۔ لیکن یہ خود کبھی بھی مجرد نہیں ہوتا۔ نفس کی یہ خاص خصوصیت ہے کہ وہ متشکل انداز کو پسند کرتا ہے چنانچہ اس نے ان اشارات کے اظہار کے لیے ہمیشہ سیدھی سادی اور عام فہم اشکال کو چنا۔ تکون، دائرہ، صلیب، مکعب اس کی خاص مثالیں ہیں۔ یہ اسی کی بدولت تھا کہ روشنی اور تاریکی کی باہمی کشمکش یا خیر و شر کی رزم کو ایک شجاع اور اژدہا کی لڑائی کی صورت میں دکھایا جاتا تھا یا موت و حیات کے معمہ کو سمجھانے کے لیے بھول بھلیاں کو اشارہ بنایا گیا۔ قدیم اساطیر اور بائبل کی بعض آیات اس سلسلہ میں بیش بہا مثالیں پیش کرتی ہیں۔

اشارات انفرادی بھی ہوتے ہیں اور اجتماعی بھی۔ انفرادی اشارات کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں، ان کی عمر کم اور اثر محدود ہوتا ہے لیکن اجتماعی اشارات، اساطیر، عوامی کہانیوں، روایات اور مذاہب کا حصہ ہیں کہ اثر انگیزی کے اعتبار سے زمان و مکان کی حدود پار کر جاتے ہیں۔ اپنا مقصد پورا کر لینے اور "مردہ" ہو جانے کے بعد بھی ان کے اثرات زائل نہیں ہوتے اور یہ آنے والی نسلوں کو متاثر کرتے رہتے ہیں

والی کہانیاں اساطیر اجتماعی اشارات کی بڑی اچھی مثالیں ہیں۔

تلازمی امتحان

فرد کے لاشعور میں پوشیدہ محرکات کا کھوج لگانے کے لیے ژنگ نے اس امتحان کو وضع کیا تھا۔ تلازمی امتحان کا اصول بھی دباؤ کے طریق کار پر مبنی ہے۔ مریض کو بعض مخصوص قسم کے الفاظ کی ایک فہرست دی جاتی ہے۔ انہیں اصطلاح میں تہیجی الفاظ کہتے ہیں۔ ژنگ نے ایسے سو الفاظ کی ایک فہرست مرتب کی ہے جو تقریباً ہر موقعہ پر ہر نوعیت کے مریض کے لیے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

مریض کو ایک ایک لفظ سنایا جاتا ہے اور اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اس لفظ سے وابستہ تصورات اور خیالات، کسی قسم کی جھجک، شرم اور ہچکچاہٹ کے بغیر بیان کر دے، اس کے ردعمل کے وقت کو شاپ واچ یا برقی پیمانہ کے ذریعے سے نوٹ کر لیا جاتا ہے بعض الفاظ کے جوابات فوراً مل جاتے ہیں لیکن جب الفاظ جو مریض کے لاشعوری الجھاؤں سے وابستہ تصورات کو چھیڑنے کا باعث بنتے ہیں تو اس صورت میں داخلی مزاحمت اپنی کارکردگی کا آغاز کرتی ہے۔ مریض کی داخلی کشمکش اس کے چہرے کے بدلتے رنگ سے عیاں ہو جاتی ہے۔ وہ خود کو جال میں پھنسے ہوئے پرندہ کی طرح سے بے بس پاتا ہے وہ جواب دینا چاہتا ہے مگر اپنے جواب کو وہ گندہ، معیوب اور غیر اخلاقی سمجھتا ہے۔ اس لیے ہر لفظ کا جواب دینے میں جو وقت لیا جاتا ہے اس کی بے حد اہمیت ہے۔ ژنگ کی تحقیقات کے مطابق ایک عام قسم کے لفظ کے لیے عمومی طور سے اکثریت کو ۳، ۴ سیکنڈ کا وقفہ درکار ہوتا ہے۔

بعض دفعہ مزاحمت اتنی شدید ہوتی ہے کہ مریض جواب نہیں دے سکتا۔ اس صورت میں کچھ وقفہ ڈال کر پھر وہی لفظ دہرایا جاتا ہے اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک مریض کی داخلی مزاحمت ختم نہیں ہو جاتی۔

اس ضمن میں یہ امر ذہن نشین رہے کہ تلازمی امتحان جن تصورات اور خیالات یا دبائی گئی خواہشات سے وابستہ کیفیات کو چھیڑنے کا باعث بنتا ہے وہ سبھی ذاتی لاشعور تک ہی محدود ہوتی ہیں۔ اس سے آگے زیادہ گہرائی تک اس کی رسائی نہیں ہوتی۔ اس لیے خوابوں کے مقابلہ میں ملحوظِ اہمیت ان کی حیثیت ثانوی رہتی ہے۔

الجھاؤ

تلازمی امتحان کی اصل اہمیت اس بنا پر ہے کہ اسی ہی کی وساطت سے ژنگ الجھاؤ کے نظریہ تک پہنچا تھا اس نے ایک جگہ لکھا ہے:

"تلازمی تجربات کے ذریعے سے الجھاؤ کی موجودگی کا بڑی آسانی سے مظاہرہ کیا جا سکتا ہے، جن لوگوں کے تلازمی امتحانات لیے گئے تھے، ان کے نتائج کے گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ردعمل کے وقفہ میں طوالت کا باعث وہ ہیجانی رکاوٹ ہوتی ہے جو یا تو تہیجی لفظ اور یا پھر اس کے جواب کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے دراصل یہ ہیجانی رکاوٹ اس امر کی غماز ہے کہ تہیجی لفظ نے الجھاؤ کو چھیڑ دیا ہے۔"

جہاں تک اس اصطلاح کا تعلق ہے تو ایڈورڈ بلولر اسے بعض نفسی کیفیات کے اظہار کے لیے استعمال کر چکا تھا۔ مگر ژنگ نے سب سے پہلے نہ صرف اس کی ایک واضح تعریف ہی کی بلکہ اسے اپنے نظامِ فکر میں ایک مستقل حیثیت دی اس لیے یہ اسی کی وضع کردہ تسلیم کی جاتی ہے۔ جس زمانہ میں وہ زیورچ یونیورسٹی کے کلینک میں تحقیقات کر رہا تھا تو اس نے احساس آمیز الجھاؤ کی اصطلاح استعمال کی، لیکن بعد میں اسے مختصر کر کے صرف الجھاؤ رہنے دیا اور وہی مقبول ہو گئی۔

ژنگ کے بقول الجھاؤ کی ساخت دو عناصر سے ترکیب پاتی ہے اول ایک عوامی عنصر ہے۔ یہ لاشعوری ہوتا ہے۔ اور شعور کے حلقۂ اقتدار سے باہر ایک آزاد عنصر ہے۔ دوم وہ تلازمات ہیں جو عوامی عنصر کے ساتھ وابستگی اختیار کر لیتے ہیں یہ تلازمات کچھ تو فرد کے طبعی اور پیدائشی رجحانات کی بنا پر ہوتے ہیں اور کچھ ان تجربات کے باعث جو وہ اپنے ماحول سے اخذ کرتا ہے۔

الجھاؤ آزاد اور خود مختار ہوتے ہیں۔ کچھ الجھاؤ تو ایسے "شریفانہ" طریقے سے رہتے ہیں کہ ان کی موجودگی کا پتہ بھی نہیں چلتا، جبکہ بعض کے اثرات ایسے شدید ہوتے ہیں کہ ان سے جذبات و ہیجانات میں ایک بحرانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور یوں فرد اعصابی خلل کا شکار ہو جاتا ہے۔ ژنگ کے خیال میں اناکا الجھاؤ مرکزی اور اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ مادرانہ الجھاؤ، پدرانہ الجھاؤ اور مذہبی الجھاؤ وغیرہ دیگر مشہور الجھاؤ ہیں۔

ژنگ نے، ان کی خود مختاری اور آزاد روی پر بہت زور دیا ہے کیونکہ خود مختار الجھاؤ کی تشکیل اپنے ہی مواد سے ہوتی ہے۔ اس لیے یہ شعور و دانش کے قوانین سے ماورا ہوتا ہے۔ جب الجھاؤ مکمل طور سے خود مختار ہو جائے تو وہ نفس کے پس پردہ اپنی آزادانہ حکومت کا قیام عمل میں لے آتا ہے۔ اور جس طرح ایک ایٹم چھوٹے پیمانہ پر کائنات کا نمونہ ہے اسی طرح سے یہ خود مختار الجھاؤ چھوٹے پیمانہ پر نفس کا نمونہ ہوتا ہے۔ اس لیے ژنگ کے بقول نامکمل شخصیت اور الجھاؤ بنیادی لحاظ سے ایک ایسی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔

ان کی ساخت میں لاشعوری مواد کا بھی کافی سے زیادہ ہاتھ ہوتا ہے، اس لیے ان کی ماہیت پر پورے طور سے روشنی نہیں ڈالی جا سکتی ان کے اثرات سے صرف اس صورت سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ان سے وابستہ تصورات کو شعور کی روشنی میں لے آئیں۔ اس طریقہ سے ان کی شدت کو ختم یا کم کیا جا سکتا ہے۔ ژنگ کے خیال میں خود کار تحریر، بعض روحانی مظاہر اور خواب ــ یہ سبھی الجھاؤ کے کرشمے ہیں۔ زیادہ شدید حالتوں میں یہ تمام شخصیت پر چھا جاتے ہیں اور یوں فرد اس رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ اس کی مثال میں اس نے نطشے کی زندگی کو پیش کیا ہے جس کی شخصیت دو حصوں میں منقسم ہو چکی تھی۔ ایک حصہ تو نطشے میں تھا لیکن دوسرے کو وہ زرتشت یا دیونیسس (DIONYSUS) کہتا تھا۔ نطشے کی لامذہبی اس کے مذہبی الجھاؤ کی بنا پر تھی۔

جولینڈ جیکوبی (JOLANDE JACOBI) کے خیال میں ژنگ کے نزدیک دو طرح کے الجھاؤ ہیں۔ ایک تو وہ الجھاؤ جو ذاتی لاشعور میں ہوتا ہے، وہ کیونکہ زیادہ تر فرد کے تجربات سے تشکیل پاتا ہے، اس لیے ایک لحاظ سے فرد کی شخصیت اس سے ناواقف نہیں ہوتی اس لیے یہ الجھاؤ دور ہونے کے بعد ان سے وابستہ نفسی قوت صحت مندانہ مقاصد کے لیے صرف ہوتی ہے جبکہ وہ الجھاؤ جو اجتماعی لاشعور میں خود بخود ہی یا اساسی نقوش کی امداد سے اپنا ایک آزادانہ سلسلہ قائم کر لیتے ہیں وہ جب فرد کی شخصیت پر حملہ آور ہوتے ہیں تو ان کے اثرات خطرناک اور مریضانہ نوعیت کے ہوتے ہیں۔ روحوں اور بھوت پریت میں اعتقاد، موخر الذکر کی بنا پر ہوتا ہے۔

بالفاظ دیگر الجھاؤ ــ صحت مند اور مریضانہ نوعیت کے ہو سکتے ہیں۔

الجھاؤ کی اس لیے بے حد اہمیت ہے کہ یہ نہ صرف نفس کی تشکیل میں اساسی نوعیت کا کردار ادا کرتے ہیں بلکہ یہ اس کا ایک صحت مندانہ جزو ہیں۔ یہ صرف اسی وقت مریضانہ صورت اختیار کرتے ہیں جب ناخوشگوار حادثات، دبائی گئی خواہشات اور اندرونی کشمکش انہیں اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہیں۔

۲- خواب

"خواب وہ چھوٹا سا چور دروازہ ہے جو روح کے اندرونی نہاں خانوں میں کھلتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ خوابوں میں ہم اس عالمگیر اور ازلی انسان کا روپ دھار لیتے ہیں جو شبِ ازل سے ہی چلا آ رہا ہے، وہاں وہ اس کلی صورت میں ملتا ہے اور وہ کل اس میں مضمر ہے۔ وہ فطرت سے غیر ممیز ہوتا ہے اور اس کی تمام انانیت عریاں ہو جاتی ہے۔" (ژنگ)

ژنگ نے خوابوں کو بے حد اہمیت دی ہے۔ فرائیڈ کے برعکس ژنگ کے نزدیک خواب صرف تمنائی ہی نہیں بلکہ یہ حال کے ترجمان اور ماضی کے لیے ایک اشاریئے کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ اور وہ اس امر پر سختی سے عقیدہ رکھتا ہے کہ خواب "پیغام بر" بھی ہوتے ہیں۔

خوابی مطالعہ

جہاں تک خوابوں کی تعبیر و تشریح کا تعلق ہے تو وہ اس بارے میں کسی قطعی فارمولا کا قایل نہیں بلکہ ہر دبستانِ فکر کے نظریات سے استفادہ کا قایل ہے۔ مثلاً ظاہر بین لوگوں کے خوابوں کے لیے وہ فرائیڈ کے اصولوں کو اپنانے کا قایل ہے جبکہ باطن بین افراد کے لیے ایڈلر کے طریق کار کو اپنانے کی سفارش کرتا ہے۔ اس نے خود بھی لکھا ہے:

"میرا باضابطہ قسم کا کوئی خوابی نظریہ نہیں ہے نہ ہی میں اس بارے میں جانتا ہوں کہ خواب کیسے آتے ہیں، بلکہ میں تو اس بارے میں بھی غیر یقینی حالت میں ہوں کہ خوابوں کے مطالعہ کے میرے طریق کو بھی ایک باضابطہ قسم کا "طریق کار" قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔"

اس نے اپنے خوابی مطالعہ کی بنیادیں بہت وسیع کر دی ہیں اور قدیم اساطیر عوامی کہانیاں اور گیت، وحشی قبائل کے رسوم و روایات، بائبل اور بعض دیگر مذہبی صحائف کی تلمیحات و اشارات اور ازمنہ وسطیٰ کی کیمیاگری — اس نے ان سب میں ڈوب کر خوابوں کی تشریح کی سعی کی۔

ژنگ نے افریقہ میں ایلگن (ELGON) کے جنگلات میں بسنے والے ایلگونی (ELGONYI) قبائل کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ خوابوں کی دو اقسام کے قایل تھے۔ عام لوگوں کے خواب "چھوٹے خواب" کہلاتے تھے۔ یہ ذاتی نوعیت کے ہوتے تھے اور ان کے اثرات اس فرد یا زیادہ سے زیادہ چند افراد تک محدود ہوتے تھے، اس کے برعکس دوسری قسم "عظیم خوابوں" کی ہے جن سے تمام قبیلہ کی زندگی متاثر ہوتی تھی جو عموماً ذی حیثیت اور سربراہوں کو آتے تھے۔ ژنگ اس سے بہت متاثر ہوا، کیونکہ وہ خود بھی ذاتی خواب اور اجتماعی خواب کا قایل ہے گو ان دونوں میں واضح قسم کا خطِ امتیاز نہیں کھینچا جا سکتا۔ ویسے اجتماعی خواب بہت واضح قسم کے ہوتے ہیں اور ان کے اشارات عموماً حیران کن اور ناقابلِ فہم ہوتے ہیں۔ اور بظاہر ان کا خواب دیکھنے والے کے ساتھ کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا اور ایسے ہی خوابوں کو سمجھنے کے لیے قدیم تاریخی مواد اور اساطیر سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اجتماعی خواب — اجتماعی لاشعور کے اساسی نقوش کا مظہر ہوتا ہے اور اپنے معانی و اثرات کے اعتبار سے اس کا احاطہ صرف خواب دیکھنے والے تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ بابل کے شہنشاہ بخت نصر کا خواب جس کی تعبیر دانیال پیغمبر نے کی آنے والی کئی صدیوں کے واقعات کا آئینہ دار تھا۔ اسی طرح فرعون کا خواب جس کی تعبیر حضرت یوسف نے کی تھی مستقبل کے ۱۴ سالوں پر محیط تھا جبکہ قید خانہ میں ان کے دونوں ساتھیوں کے خواب ذاتی خواب تھے کیونکہ ان کے اثرات صرف ان ہی تک محدود رہے (ایک کو رہا کر کے دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا)

قدیم یونان سے لے کر آج تک کسی نہ کسی صورت میں خوابوں کی پیغام برانہ حیثیت پر زور دیا جاتا رہا ہے البتہ ژنگ نے اسے علمی انداز سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

ژنگ ان کی مستقبل نما حیثیت کا بڑی شدت سے قایل تھا اس کے کوہ پیمائی کے شوقین ایک دوست نے اسے خواب سنایا کہ وہ پہاڑ پر چڑھا چلا جا رہا ہے اور جیسے جیسے وہ بلند سے بلند تر ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے ہی اس میں فرحت اور انبساط کا ایک عجیب سا احساس تیز سے تیز تر ہوتا جاتا، حتیٰ کہ چوٹی پر پہنچ کر وہ اسی احساس کے تحت فضا میں اڑ جاتا ہے۔ ژنگ نے اسے سنجیدگی سے کہا۔ گو تم کوہ پیمائی سے باز نہ آ سکو گے لیکن آئندہ کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ تم کم از کم تنہا مت جاؤ — دو ماہ بعد وہ برف کے طوفان میں دب گیا۔ لیکن بروقت امداد سے بچا لیا گیا لیکن اس کے تین ماہ بعد وہ اپنے ایک دوست کی معیت میں کوہ پیمائی کے دوران چٹان سے گر کر ہلاک ہو گیا۔

فرائیڈ اور ژنگ کے نظریات میں اختلافات کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ فرائیڈ خوابوں کی تشریح و تحلیل کا قایل تھا، جبکہ . . . . بقول ژنگ خواب اندرونی سچائی اور حقیقت کو اس طرح سے بیان کرتا ہے۔ "جیسی کہ وہ ہے ویسے نہیں، جیسے میں نے اسے فرض کر رکھا ہے اور نہ ہی اس روپ میں جس میں کہ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔" ایک اور جگہ اس نے لکھا ہے "ہر خواب حصولِ معلومات کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔"

اپنی سوانح عمری میں بھی اس نے خوابوں کے بارے میں یوں لکھا ہے۔

"میں اس مسئلہ پر کبھی بھی فرائیڈ کا ہم نوا نہ ہو سکا، کہ خوابوں کے ظاہر میں کچھ اور بھی پوشیدہ ہے، یعنی ان کے معانی شعور سے چھپے ہوتے ہیں، میرے خیال میں تو خواب فطرت کا ایک عنصر ہیں، وہ ہمیں دھوکہ دینے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ جہاں تک ہو سکے وہ تو ہمیں کچھ سمجھانے کی سعی کرتے ہیں، پودے نمو پاتے ہیں اور جانور استعداد کے مطابق اپنی اپنی خوراک تلاش کرتے ہیں۔ یہ مظاہرِ زیست ہماری آنکھوں کو دھوکہ دینے کی کوشش نہیں کرتے، اب یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی کم نگاہی کی بنا پر خود ہی دھوکہ کھا جائیں۔" (ص: ۱۵۷)

خوابی اشاریت

ژنگ اشارات کو ایک مستقل اور دائمی حیثیت دینے کے نظریہ کو تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ ہر فرد کے ماحول، نسل، ملکی کوائف اور خواب کی حیثیت کے ساتھ ساتھ اشارات کے معانی اور مفاہیم بھی بدلتے رہتے ہیں۔

اشارات کے مفہوم کے تعین کے لیے صرف ایک جداگانہ خواب کا مطالعہ کافی نہیں، کیونکہ ایک خواب بسا اوقات گمراہ کن ثابت ہو سکتا ہے، اس مقصد کے لیے خوابوں کے ایک سلسلہ کے مطالعہ کی ضرورت ہے چنانچہ اس نے ایک مریض کے کم از کم ایک ہزار خوابوں کے ساتھ ساتھ اس کی فانتزلیوں وغیرہ کا بھی کئی ماہ تک مطالعہ کیا تھا خوابوں کے سلسلہ کے مطالعہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے اس مخصوص فرد کے اشارات کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ خوابوں کے ایک سلسلہ کا مطالعہ شروع کیا جاتا ہے تو ابتدائی خواب بالکل ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں لیکن جیسے جیسے یہ مطالعہ گہرا ہوتا جائے گا، ویسے ویسے ہی خوابوں کے اشارات میں الجھاؤ اور اجنبیت پیدا ہوتی جائے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی خواب ذاتی لاشعور یا شعور کے ان حصوں سے متعلق تھے، جو شعور کے قریب واقع ہوتے ہیں لیکن بعد میں جیسے جیسے یہ مطالعہ ترقی پذیر ہوتا جائے گا، تو اجتماعی لاشعور کے اثرات نمایاں ہونے شروع ہو جائیں گے اور یوں فرد کے اشارات کے اصل مفہوم کا تعین ممکن بن جائے گا۔

یعنی بعض اشارات کم و بیش حقیقی مفہوم کے حامل ہوتے ہیں جیسے "مثلاً":

ژنگ کے نزدیک انسان کے مذہبی جذبات بے حد اہمیت کے حامل ہیں بلکہ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ اعصابی خلل اور خود اذیتی اسی کی بنا پر ہے۔ ایسے مریضوں کے خوابوں میں "منڈل" ایک ایسا اشارہ ہے جو ہمیشہ ایک ہی مفہوم کا مظہر ہوتا ہے۔ یہ سنسکرت کا لفظ ہے جو شخصیت اور نفس کے استحکام کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ ایک مکمل مربع یا دائرہ ہے جس کے مرکز کو خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے یہ نہ صرف قدیم ہند بلکہ دنیا کے اکثر قدیم مذاہب میں ملنے کے علاوہ غیر متمدن قبائل کے فن اور رقص میں بھی ملتا ہے اور جب یہ موجودہ دور کے مریضوں کے خوابوں میں وقوع پذیر ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اب اس کے منتشر خیالات اور بے چین شخصیت سکون سے ہم کنار ہو جائے گی۔

ژنگ جن خوابوں کو انسانی زندگی کے لیے بے حد اہمیت دے کر انہیں مستقبل کا اشاریہ قرار دیتا ہے وہ ایسے خواب ہیں جو اساسی شقوش کی بنا پر ظہور پذیر ہوتے ہیں ان میں محبت، نفرت، شادی، جدائی، پیدائش، موت اور فرد کی زندگی کے اہم نشیب و فراز پر روشنی ڈالی جاتی ہے، بقول ژنگ:

"یہ خواب انسانی زندگی کے اہم ترین ادوار میں — آغاز شباب جوانی اور ادھیڑ عمری کی ابتدا (۳۶ سے ۴۰ سال) اور یا پھر موت کے قریب — دیکھے جاتے ہیں"

ایک اور جگہ اس نے یوں لکھا ہے:

"مجھے کئی مواقع پر اس امر کا مشاہدہ کرنے کا موقعہ ملا کہ بعض اوقات طویل مدت سے اعصابی خلل میں مبتلا مریضوں نے بیماری کے آغاز سے پہلے ایسے خواب دیکھے جو ذہن پر بہت گہرے اثرات چھوڑ جاتے ہیں اور جب اس کی تحلیل کی گئی تو یہ آشکار ہوا کہ اس خواب نے پوشیدہ طور سے زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے ان واقعات کی طرف اشارہ کر دیا تھا"

بالفاظ دیگر خواب عالمگیر نوعیت کے مواقع سے وابستہ ہیں اور اس امر کے غماز کہ فرد کا نفس اس مقام پر ہے جہاں اسے مزید ارتقاء کے لیے اب فطرت کی بھی آواز کی راہنمائی درکار ہے۔

ایسے خوابوں کا مطالعہ بے حد دشوار ہوتا ہے کیونکہ فرد کے "تلازمات" وغیرہ اس سلسلہ میں ممد نہیں ہوتے۔ ژنگ نے اس کے لیے جو طریقہ وضع کیا اسے "توسیع" کہتے ہیں، یعنی خواب کے مختلف عناصر کی متعلقہ تصورات اور اشارات کے ذریعہ سے توسیع کی جاتی ہے۔ یہ تصورات اور اشارات ایسے ہوتے ہیں جن سے ممکنہ معانی کے تعین کا امکان ہوتا ہے اور اس طریقہ سے صحیح راستہ کا اندازہ ہو جانے پر خواب کے اصل معانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اس ضمن میں تصورات و اشارات کے مطالعہ میں زمان و مکان کی قیود سے بلند ہو کر ان کے مفہوم کے تعین کی سعی کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے خواب فرد کے ساتھ ساتھ مجموعی لحاظ سے انسانیت سے بھی کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے انہیں زمان و مکان کی حدود میں جکڑ دینے کا یہ مطلب ہوگا کہ ان کے معانی کو محدود کر دیا گیا ہے۔

ژنگ کے نزدیک عہد طفلی اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ یہی وہ وقت ہے جب بچہ کو ایسے خواب آتے ہیں جن کے ذریعہ اس کے مستقبل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ژنگ نے اپنے جو حالات قلم بند کئے ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود عملی زندگی بھی اپنے ان نظریات کے مطابق بسر کرتا تھا۔ اس نے بے شمار ایسے مواقع کا تذکرہ کیا ہے جہاں اسے خوابوں نے آنے والے حالات کی بشارت دی۔ حتیٰ کہ اس کا اجتماعی لاشعور کا نظریہ بھی ایک خواب کی صورت میں اس پر واضح ہوا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنے دو منزلہ مکان میں ہے مگر وہ اس سے ناواقف ہے۔ اوپر کی منزل خوب صورتی اور سلیقہ سے آراستہ اور تصاویر سے مزین تھی۔ اس کی نچلی منزل میں تمام چیزیں بہت پرانی تھیں منزل پندرھویں اور سولہویں صدی کا حصہ معلوم ہوتی تھی۔ وہیں اسے ایک دروازہ نظر آیا جسے کھولنے پر سنگی زینہ ایک تہ خانہ میں لے جاتا ہے، اس تہ خانہ کی محرابوں اور دیواروں کی ساخت رومن عہد کی معلوم ہوتی تھی، پتھر کی سلوں کے فرش پر ایک انگوٹھی نظر آئی جسے کھینچا تو وہ سل بھی اٹھتی چلی گئی، اب پھر اسے ایک تنگ زینہ نظر آیا اس پر سے اتر کر وہ نیچے چٹان میں سے تراشیدہ ایک غار میں داخل ہوا۔ غار مٹی اور دھول سے اٹا پڑا تھا، فرش پر ہڈیاں اور ٹوٹے ہوئے برتن تھے جن میں دو انسانی کھوپڑیاں بھی تھیں — اور اس موقعہ پر اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس خواب میں مکان کی اوپر والی منزل شعور تھی اور نچلی منزل شعور کا پہلا درجہ اور جیسے جیسے وہ نیچے اترتا گیا لاشعور کی گہرائیوں میں پہنچتا گیا۔ ساتھ ہی تہذیب بھی قدیم سے قدیم تر ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ غار میں وہ آغاز تہذیب تک جا پہنچتا ہے اس کے نظریۂ لاشعور کو یہ خواب بہت ہی خوب صورتی سے واضح کرتا ہے۔

مطالعہ کا طریق کار

خوابوں کے مطالعہ کے دو طریقے ہیں، موضوعی اور معروضی — یعنی داخلی اور خارجی!

موضوعی طریق کار میں خواب کے تمام واقعات و حادثات اور کرداروں کا خواب دیکھنے والے کی شخصیت کی روشنی میں مطالعہ کیا جاتا ہے، جبکہ اس کے برعکس معروضی طریقہ میں خواب کے تمام واقعات اور کرداروں کے "ٹکڑے ٹکڑے" کر کے فرد کی ان یادوں کی امداد سے تحلیل کی جاتی ہے جو خارجی تعلقات و حادثات سے وابستہ ہوتی ہیں۔ ہم ژنگ کے طریقہ کو موضوعی اور فرائیڈ کے طریقہ کو معروضی قرار دے سکتے ہیں، اس نے سب سے پہلے ۱۹۱۲ء میں اپنی کتاب Transformations & Symbols of the Libido میں خوابوں کا موضوعی انداز سے مطالعہ کیا لیکن اس نے سختی سے اس طریقہ کو نہیں اپنائے رکھا بلکہ وہ ہر فرد کی انفرادی حیثیت کے مطابق مطالعہ کے طریق کار کا تعین کرتا تھا۔ مثلاً ایک عورت جب اپنے باپ کو خواب میں دیکھتی ہے تو اس صورت میں یا تو اسے باپ کے بارے میں کسی طرح کے معاملہ سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ باپ بیٹی کے تعلقات میں تغیر کا امکان ہو (خارجی) اس کا یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ اس کے اندر مردانہ خصائص اس کے باپ کا روپ دھار کر نمایاں ہونے کی کوشش کر رہے ہیں (داخلی) ویسے عام طور سے خوابوں میں داخلی پہلو تحلیل کے ثانوی مدارج میں نمایاں ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت ایک حد تک مریض کے ذاتی مسائل کا محاکمہ کر لیا جا چکا ہوتا ہے۔

خوابوں کی اقسام

خوابوں کی دیگر انواع کے بارے میں ژنگ کے خیالات مختصراً یوں ہیں:

۱۔ بعض اوقات خواب بظاہر عام حقائق کے برخلاف متضاد صورت میں واقعات کو پیش کر کے نفس کی نشوونما میں بعض رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک نوجوان شخص نے اپنے باپ کو نشہ اور بدمستی کے عالم میں دیکھا۔ حالانکہ اس کا باپ نہ صرف ایک بلند کردار انسان ہی تھا بلکہ باپ بیٹے کے تعلقات بھی بے حد خوشگوار رہے۔ دراصل بیٹے نے باپ کو اپنا آئیڈیل بنا رکھا تھا اور کیونکہ اس نے اپنی شخصیت کو باپ کی شخصیت میں مدغم کر رکھا تھا، اس لیے اس کی اپنی انفرادیت ختم ہو چکی تھی۔ اس کے خواب کا یہی مطلب تھا کہ تمہارا باپ فرشتہ نہیں اس سے بھی غلطی اور غیر ذمہ داری کا فعل سرزد ہو سکتا ہے۔ اس لیے تم اپنی انفرادیت کو اس میں مدغم مت کرو اور اپنی شخصیت کے آزادانہ ارتقاء میں اپنے باپ کی محبت کو رکاوٹ نہ بناؤ۔

بعض اوقات جب ہم کسی کو ناپسند یا اس سے نفرت کرتے ہیں تو اس کے متعلق بہت اچھے اچھے خواب دیکھے جاتے ہیں مثلاً اسے اس کے اصل سماجی مقام سے زیادہ ارفع حالت میں دیکھا جاتا ہے۔

۲۔ خوابوں سے کردار کی پوشیدہ کشمکش بھی ظاہر ہو جاتی ہے مثلاً جب ایک کمزور، متین اور بردبار انسان خواب میں جارحانہ اقدامات کرتا ہے یا کوئی بلند کردار اور شریف انسان خواب میں جنسی حرم بازاریں برپا کر دیتا ہے — اس ضمن میں اشارات سے خواب کو سمجھنے میں بڑی امداد ملتی ہے۔ اساطیر میں بیل، گدھا، انار، گھوڑے کا نعل اور رقص وغیرہ جنسی جذبات کی نمائندگی کرتے ہیں، اور یہ چیزیں خوابوں کے اشارات کی صورت میں بھی یہی فریضہ ادا کرتی ہیں۔

۳۔ خواب تمنائی بھی ہوتے ہیں لیکن یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے نسبتاً زیادہ سلجھے ہوئے ہوتے ہیں اس لیے ان کا مفہوم آسانی سے سمجھ لیا جا سکتا ہے جیسے پیاسا خواب میں پانی پیئے یا بھوکا من وسلویٰ سے لطف اندوز ہو۔

۴۔ یہ مستقبل کے بارے میں بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کی سیدھی سادی سی مثال وہ خواب ہیں جو ہر صبح کو جلد دفتر جانے والے فرد نے کبھی نہ کبھی ضرور دیکھے ہوتے ہیں اس کے اٹھنے کا وقت ہو چکا ہے لیکن وہ سوتے میں خود کو دفتر جانے کے لیے تیاری کرتے دیکھتا ہے اور ادھر الارم بج بج کر ختم ہو جاتا ہے، ایک نئے مکان میں جانے والی عورت نے خواب میں اس مکان کو مکمل طور سے دیکھ لیا حتیٰ کہ خواب میں اسے ان وجوہات کا بھی پتہ چل گیا جن کی وجہ سے پہلے کرایہ دار اسے چھوڑ رہے تھے۔

اس طرح آنے والے خطرات کے بارے میں بھی خواب آتے ہیں۔ چند سال پہلے لاہور میں ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔ کسی دوسرے شہر سے آنے والی بس کی چھت پر سے ایک مزدور سامان اتارتے وقت گرا اور چند سانسوں بعد اس نے دم توڑ دیا جس وقت وہ مر رہا تھا تو اس کی بیوی بھاگتی ہوئی آئی۔ اور اس کے مردہ جسم سے لپٹ کر رونے لگی۔ لوگوں کے استفسار پر بیوی نے بتایا کہ وہ اپنے گھر میں سو رہی تھی کہ اس نے خواب میں وہ سب کچھ دیکھا جو درحقیقت وقوع پذیر ہو چکا تھا اور اس خواب کی وجہ سے وہ پریشان ہو کر اس کی خیریت کا پتہ کرنے کے لیے بھاگی چلی آئی، لیکن وہاں آ کر اسے پتہ چلا کہ اس کا خواب سچ نکل آیا تھا۔

۵۔ خوابوں کا ایک عجیب وغریب پہلو ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے جن میں ایک افرادِ کنبہ — خصوصیت سے میاں بیوی یا والدین اور بچے — بغیر ایک دوسرے کو بتائے ایک ہی خواب دیکھتے ہیں یا مستقل طور سے دیکھتے رہتے ہیں۔ تین لڑکیوں نے جوان ہونے کے بعد ایک دوسرے سے اس امر کا اعتراف کیا کہ عنفوانِ شباب کے قریب وہ تینوں ہی اپنی ماں کے متعلق بہت خراب اور خوفناک قسم کے خواب دیکھتی رہیں، انہوں نے اسے جادوگرنی اور خطرناک جانور کے روپ میں دیکھا۔ حالانکہ ان کی ماں نہ صرف خوب صورت تھی بلکہ یہ تینوں اس سے بے حد پیار کرتی تھیں — کئی سالوں بعد ان کی ماں پاگل ہو گئی اور جانوروں کی طرح ہاتھ اور پاؤں کے بل چلتی ہوئی وہ سؤر، کتوں اور ریچھوں کی آوازوں کی نقلیں اتارا کرتی۔

اس سے بھی عجیب تجربات یہ ہے کہ بچے بعض اوقات اپنے والدین کے ان مسائل کے بارے میں بھی خواب دیکھتے ہیں جن کے بارے میں وہ خود ذاتی طور سے قطعی لاعلم ہوتے ہیں۔ ایک نوسالہ بچی کو مستقل طور سے حرارت رہتی تھی حالانکہ جسمانی لحاظ سے وہ بالکل صحت مند تھی اس کے خوابوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ اسے یہ معلوم تھا کہ اس کے والدین کی آپس میں نہیں بنتی اور وہ طلاق کی فکر میں ہیں اور اس خوف کی وجہ سے اسے حرارت رہتی تھی کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اس کا باپ گھر سے جانے کے بعد کبھی بھی واپس نہ آئے گا — لیکن جونہی حالات بدلے تو وہ بھی صحت یاب ہو گئی۔

۳۔ نفس

ماہیت اور خصائص

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے ژنگ نے ذہن اور ذہنی کی جگہ نفس اور نفسی کی اصطلاحات استعمال کی ہیں اس کے نزدیک نفس ایک قسم کی غیر طبعی فضا ہے یہ ایک ایسی فضا ہے جو شخصیت میں ہی واقع ہوتی ہے اور وہ اس کے اندر وقوع پذیر ہونے والے وقوعات کا اس طرح سے ذکر کرتا ہے جیسے وہ عام طبعی چیزیں ہوں اس سے بعض اوقات عام قاری الجھن میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے لیکن یہ امر ذہن نشین رکھنا چاہیے کیونکہ اس کے خیالات الجھے تھے اس لیے بعض اوقات اس نے انہیں سمجھانے کے لیے طبعی علوم سے مثالیں لی ہیں، یہاں یہ ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ ژنگ کے نظریہ نفس سے ملتا جلتا نظریہ قدیم چینی فلسفہ میں ملتا ہے۔

نفس ایک ایسا آزادانہ نظام ہے جو اپنی ساخت کے اعتبار سے حرکی اور توانائی رکھنے والا ہے۔ اس نے نفس کی اس قوت کو لیبڈو کا نام دیتے ہوئے فرائیڈ کی یہ اصطلاح فرائیڈ سے کہیں وسیع تر مفہوم میں استعمال کی ہے ژنگ کے بقول لیبڈو "اعمال زیست کی توانائی" کا نام ہے۔ اس نے اس توانائی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ توانائی جو بحیثیت کل کائناتی حیثیت سے ظہور پذیر ہوتی ہے، اور دوسری وہ توانائی جو صرف انسان کے نفس سے وابستہ ہے جب توانائی کے اس نظریہ کا وسیع پیمانہ پر جائزہ لیں تو یہ کسی حد تک ہنری برگساں کے نظریہ "جوشِ حیات" سے جا ملتا ہے۔

یہ توانائی ہر دم حرکت پذیر اور متغیر رہتی ہے۔ اس حرکت پذیری کے اظہار کے لیے اس نے نفسی عمل کی اصطلاح وضع کی اور اسی کا مطالعہ اصول تضاد سے کیا جاتا ہے۔ اس سارے نظریہ کو ہیرکلیٹس کے اس قول کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے، جسے علامہ اقبال نے یوں نظم کیا تھا:

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں

بقول ژنگ:

"ہر انسانی چیز اضافی ہے کیونکہ اس کا دار و مدار اندرونی تضاد پر ہے، ہر چیز اپنی وقوع پذیری کے لیے توانائی کی محتاج ہے جبکہ توانائی کا انحصار پہلے سے موجود اندرونی تضاد پر ہے۔ اس اندرونی تضاد کے بغیر توانائی کا تصور ہی محال ہے۔ سردی، گرمی اور نشیب و فراز وغیرہ اس لیے لازمی ہیں کہ ان ہی سے عمل تعادل — توانائی جاری رہ سکتا ہے۔ تمام زندگی توانائی ہے اس لیے اس کا انحصار مخالف قوتوں پر ہے۔"

ژنگ نے دو قطبین کو فرض کیا ہے یہ دونوں متضاد ہیں اور ان دونوں کا باہمی تضاد جتنا زیادہ ہو گا۔ توانائی میں اتنی ہی شدت ہو گی۔

فرائیڈ کے باب میں جس انگریزی اصطلاح کو مراجعت لکھا گیا ہے اسے ہی ژنگ کے سلسلہ میں رجعت کہا گیا ہے کیونکہ ایک ہی اصطلاح کو ہر دو نے جداگانہ مفہوم کے تحت استعمال کیا ہے اس لیے الجھن سے بچانے کی خاطر دونوں کا علیحدہ علیحدہ ترجمہ کر دیا گیا ہے۔

بغیر تضاد کے توانائی نہیں ہو گی، ان متضاد قطبین کی کئی اقسام ہیں۔ مثلاً ترقی، رجعت، شعور، لاشعور، باطن بین، ظاہر بین، احساس، خیال وغیرہ۔

لیبڈو (یعنی توانائی) کی وہ حرکت جو آگے کی طرف ہو اسے ترقی اور برعکس اس کے اگر حرکت پیچھے کی طرف ہو تو اسے رجعت کہتے ہیں۔ لیبڈو کی یہ حرکت بالکل لہروں ایسی ہے۔ ترقی شعوری تقاضوں کی تکمیل کرتی ہے اور رجعت لاشعوری حرکات کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ ترقی کا مطلب ہے کہ فرد اپنے ماحول معاشرہ اور گرد و پیش کی دنیا کے تقاضوں سے پوری مطابقت رکھتا ہے جب کہ رجعت کی صورت میں فرد سب سے کٹ کر — رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو کی خواہش کا مظہر بن جاتا ہے۔ تمام عمل ارتقا اور تخلیق ترقی کی کرشمہ سازیاں ہیں جبکہ رجعت بے عملی، مردہ دلی اور ناکارہ زیست کو جنم دیتی ہے۔

لیبڈو کی ترقی — لاشعور سے شعور کی طرف ہوتی ہے اور لیبڈو کی رجعت شعور سے لاشعور کی طرف۔ اگر ان دونوں قطبین میں باہمی تضاد شدید نوعیت کا ہو اور لیبڈو کی حرکات میں بھی کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو تو نفس میں توازن برقرار رہتا ہے لیکن ہوتا یوں ہے کہ بعض اوقات لیبڈو کو ایک مخصوص ڈگر پر چلانے کی کوشش کی جاتی ہے، یا دباؤ کی وجہ سے اس کے راستہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں اور یا پھر خارجی حالات کی بنا پر شعوری مطابقت ناکام رہتی ہے اور یوں لیبڈو کی فطری ترقی کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ اور وہ واپس لاشعور میں جانے پر مجبور ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لاشعور میں ضرورت سے زیادہ توانائی اکٹھی ہو جاتی ہے یہ فالتو توانائی اخراج کے مواقع کی متلاشی رہتی ہے اور اسی فالتو توانائی کی وجہ سے اعصابی خلل، ہسٹریا وغیرہ ظہور پذیر ہوتی ہیں، بعض اوقات بالغ افراد بچوں بلکہ جانوروں ایسی حرکات کرتے ہیں زیادہ انتہاپسندانہ صورتوں میں جب لیبڈو کو اخراج کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو اس کی حالت کچھ پہاڑی ندی میں سیلاب ایسی ہو جاتی ہے اور جس طرح وہ پانی تنگ کناروں سے باہر اِدھر اُدھر پھیل جاتا ہے اسی طرح لیبڈو کی یہ توانائی شخصیت کے سکون کو درہم برہم کر کے انتشار سے روشناس کراتی ہے۔

شخصیت کے نقش و نگار

روپ: آپ اپنے آپ کا جائزہ لیں — کیا آپ درحقیقت وہی ہیں جس رنگ میں آپ خود کو پیش کرتے ہیں۔ ہر انسان دوسرے کو گریبان میں جھانکنے کا مشورہ دیتا ہے لیکن خود کوئی یہ تکلیف گوارا نہیں کرتا کہ وہ بھی اپنے گریبان میں جھانک لے، وہ کبھی نہیں جھانکے گا کیونکہ اسے جو کچھ نظر آئے گا وہ اس کی تاب نہ لا سکے گا۔ ہر انسان آئینہ دیکھتا ہے لیکن اپنی شخصیت کے صحیح نقوش کا جائزہ لینے کے لیے لوگ اپنے من کو آئینہ بنانے کی ہمت کیوں نہیں رکھتے؟

ژنگ اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ تہذیب و تمدن کے تقاضوں کی وجہ سے فرد اور معاشرہ میں بعض اقدار کی تسلیم آوری کے لیے ایک قسم کا سمجھوتہ سا ہو جاتا ہے اور یہ اس کا نتیجہ ہے کہ ہر انسان اپنے آپ کو اپنے اصل خد و خال میں پیش نہیں کرتا بلکہ اس نے اپنے لیے خوب صورت لبادے، مصنوعی نقوش، حسین نقاب اور ملمع کے اصول اپنا رکھے ہیں، انہیں ژنگ نے روپ کا نام دیا ہے۔ اس روپ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فرد بعض مخصوص حالات کے لیے مخصوص قسم کا طرزِ عمل (جسے اس کی اصل شخصیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا) متعین کر لیتا ہے اور یہ روپ جیسے جیسے قوت پذیر ہوتا جائے گا اس کی شخصیت بھی مختلف رنگوں میں رنگی جائے گی۔ اسی کی بنا پر ایک ہی انسان کا طرزِ عمل اپنی ماں، بیوی، دوست، افسر، ماتحت ساس وغیرہ سے بالکل جدا گانہ ہوگا اور یوں اصل انسان روپ کے پیچھے روپوش ہو جائے گا، اس کے پاس ہر موقع و محل کے لیے اتنے مصنوعی چہرے ہوں گے کہ وہ اپنے اصل نقوش کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔

روپ ایک شعوری عمل ہے اس لیے یہ لاشعور کے مخالف ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ روپ میں جتنی زیادہ شدت ہوگی اسی شدت سے لاشعور اس کے خلاف نبرد آزما ہوگا۔ روپ جب خوابوں میں ظہور پذیر ہو تو ایک ایسے انسان کی شبیہ سامنے آتی ہے جس میں وہ تمام خصائص موجود ہوتے ہیں جو کسی فرد نے اپنے روپ سے وابستہ کر رکھے ہوں اپنی انتہاپسندانہ صورتوں میں روپ اس بنا پر نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے کہ اس کی خاطر شخصیت کے باقی تمام (جائز) تقاضوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا فرد اس روپ کو خود پر اتنا مسلط کر لیتا ہے کہ وہ اسے ان مواقع کے لیے بھی اپنی آڑ بنا لیتا ہے۔ جن کے لیے اس کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی مثلاً ایک کٹھ ملا — جو زندگی کے ہر اچھے برے موقع پر خود کو منبر پر چڑھا محسوس کرتا ہے۔

بقول ژنگ:

"دنیا سے مطابقت اور اس مطابقت کے لیے اختیار کردہ طریق کار کا نام روپ ہے۔ ہر پیشے اور ہر مشغلے کا اپنا اپنا مخصوص قسم کا روپ ہوتا ہے صرف پریشانی کی بات یہ ہے کہ افراد اپنے اپنے روپ سے تطبیق کر لیتے ہیں۔ پروفیسر کریس کی کتابوں سے اور مغنیہ آواز سے، قدرے مبالغہ سے کام لیتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ گو روپ حقیقت تو نہیں لیکن جسے فرد اور دوسرے حقیقت سمجھ بیٹھتے ہیں؟"

پرچھائیں: فرد کی انا شخصیت کے جن پہلوؤں کو اچھا سمجھتی ہے انہیں وہ روپ کے ذریعہ شعور میں رکھ کر ناپسندیدہ عناصر کو شعور سے ذاتی لاشعور میں دھکیل دیتی ہے یہ تمام ناپسندیدہ عناصر گروہوں کی صورت اختیار کر کے شعور پر شب خون مارنے کی تاک میں رہتے ہیں جونہی لیبڈو کی رجعی حرکت کی وجہ سے کچھ توانائی ذاتی لاشعور میں آتی ہے تو یہ ناپسندیدہ عناصر اس کے سہارے سے ایک خود مختار الجھاؤ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں کیونکہ یہ فرد کی شخصیت کے تاریک، کمزور اور ناپسندیدہ پہلوؤں کا مجموعہ ہوتا ہے اس لیے ژنگ نے انہیں پرچھائیں کا نام دیا ہے۔ یہ پرچھائیں شعور اور شخصیت کے لیے باعثِ تکلیف ہوتی ہے یہ شعور میں اچانک ہی آ دھمکتی ہے اور یہ اسی کی بدولت ہوتا ہے کہ بعض اوقات انسان سے ایسی حرکات اور افعال سرزد ہو جاتے ہیں جو اس کے شعور و دانش کے برعکس ہوتے ہیں اسی کی وجہ سے بعض اوقات ایسی احمقانہ غلطیاں اور حماقتیں کی جاتی ہیں جو ناقابلِ توجیہ ہوتی ہیں یہ کچھ ایسے ہے، جیسے شخصیت میں کوئی اور روپوش شخصیت جان بوجھ کر الٹی سیدھی حرکتیں کرتی ہو اور شاید ہی کوئی انسان ایسا ہو جسے کبھی بھی یہ کہنے کا موقع نہ ملا ہو:

مجھے سمجھ نہیں آتی۔ کبھی کبھی نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے — ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنے آپ میں نہیں تھا۔

بعض اوقات ہم کسی انسان سے بلاوجہ ہی متنفر ہو جاتے ہیں۔ کسی سے شدید نفرت کی صورت میں دراصل ہم کسی اپنی ایسی خصوصیت کو اس شخص میں دیکھ کر اور اس کے خلاف اظہارِ نفرت کر کے گویا ہم اپنی شخصیت کے اس ناپسندیدہ حصہ کے خلاف نفرت ظاہر کرتے ہیں یہ بھی پرچھائیں کی بدولت ہوتا ہے۔ جب یہ خوابوں میں آئے تو اس وقت بھی یہ غیر مہذب اور کم حیثیت لوگوں وغیرہ کے بھیس میں آتی ہے یا پھر ایسے افراد کی صورت میں جو ان ناپسندیدہ خصائص کے حامل ہوں جن سے پرچھائیں کی تشکیل ہوتی ہے۔

یہ ہماری ان تمام خواہشوں اور ہیجانات کا مجموعہ ہے جنہیں ہم ناجائز سمجھتے

ہوئے ذاتی لاشعور میں دھکیل رہتے ہیں اور یہ کیونکہ لاشعوری ہے اس لیے کسی ذریعہ سے بھی اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے یہ انسان میں جبلّی اور خلقی ہے اور اس لیے اس کی حیثیت عالمگیر ہے اس کا اجتماعی پہلو بھوتوں، چڑیلوں، جادوگرنیوں اور شیاطین پر اعتقاد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ژنگ رقم طراز ہے:

"پرچھائیں ان تمام (منفی) اوصاف کی تجسیم ہے جنہیں فرد ہمیشہ جھٹلانے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جو موقع ملتے ہی — بلاواسطہ یا بالواسطہ طور سے — اظہار کی کوشش کرتی ہیں، اس ضمن میں کردار کے خام پہلو اور غلط رجحانات کا نام لیا جا سکتا ہے۔"

گو پرچھائیں شخصیت کے منفی رجحانات کی عکاسی کرتی ہے لیکن اسے دبانا زیادہ خطرناک ہوتا ہے اگر اسے زندگی کے عام حالات میں اظہار کا تھوڑا بہت موقع ملتا ہے تو اس کی ضرر رسانی میں قدرے کمی رہتی ہے لیکن مستقل طور سے دبائے رکھنے کی صورت میں اس کا اظہار کچھ سیلاب ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے جیسے فسادات اور بلووں میں ہوتا ہے، یعنی پُرامن لوگ بھی جامۂ تہذیب اتار پھینکتے ہیں۔

انیما اور انیمس

انسانی سوچ نے صدیوں سے بعض اوصاف کو مردانہ قرار دے کر انہیں صرف مردوں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے جبکہ بعض خصوصیات عورتوں سے وابستہ سمجھی جاتی ہیں۔ پہل کرنے کا حوصلہ، ایک خاص قسم کی جارحیت اور چھا جانے والی کیفیت، قوت، اقتدار وغیرہ - یہ مردانہ اوصاف سمجھے جاتے ہیں۔ جبکہ حلیمی، محکومی اور کمزوری وغیرہ عورتوں کی خصوصیات گنی جاتی ہیں — لیکن کیا اوصاف و خصوصیات کی یہ تقسیم قطعی ہے — کیا واقعی ہر مرد ہر لحاظ سے مردانہ اوصاف کی شرائط کو پورا کرتا ہے اور کیا واقعی تمام عورتیں نسائی خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں؟

مشاہدہ اور تجربہ اس کی تردید کرتے ہیں، بعض مرد ایسے مل جاتے ہیں جو عورتوں کی طرح حلیمی اور محکومی میں زندگی بسر کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں جبکہ ایسی عورتوں کی بھی کمی نہیں جو مردوں کی مانند قوت و اقتدار حاصل کرنے کے لیے جارحیت اور چھا جانے والی کیفیت رکھتی ہیں تو پھر اس تفریق و تمیز کی کیا وجہ ہے —؟

بقول ژنگ:-

"ہر انسان کے لاشعور میں عورت کا ایک ایسا اجتماعی تصور موجود ہوتا ہے جو اسے ورثے میں ملتا ہے اور اس کی امداد سے وہ عورت کی فطرت کو سمجھتا ہے۔"

یہ تصور لاشعوری ہوتا ہے لیکن زندگی میں عام عورتوں کے ساتھ میل ملاپ کی بنا پر یہ شعوری ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں ماں کا کردار سب سے اہم ہے کیونکہ یہی وہ ہستی ہے جو سب سے پہلے بچہ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ اثر اتنا گہرا ہوتا ہے کہ ایک لحاظ سے انسان تمام عمر اس کو فراموش نہیں کر سکتا۔ بچے کے اپنی ماں کے بارے میں تمام تجربات کی اس لحاظ سے اور بھی اہمیت ہے کہ ان سے وابستہ تاثرات دراصل اس کی ماں کے طرزِ عمل پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ بچہ جس رنگ میں اس کے طرزِ عمل کی تعبیر کرتا ہے اسی رنگ میں اس کے تاثرات رنگے جاتے ہیں اس لیے بچہ اپنی ماں کا جو تصور قائم کر لیتا ہے، اسے عموماً اصل ماں سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ تصور بچہ میں اس طبعی صلاحیت کی بنا پر ہوتا ہے جسے ژنگ نے انیما کا نام دیا ہے۔

سیدھے سادے الفاظ میں ہم انیما کو کسی مرد کے ان زنانہ خصائص کا مجموعہ قرار دے سکتے ہیں۔ جو نوعیت کے اعتبار سے لاشعوری ہوتے ہیں۔ عورتوں میں لاشعوری مردانہ اوصاف کو انیمس کہتے ہیں۔

یہ حیاتیاتی لحاظ سے بھی غلط نہیں کیونکہ اب یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ مرد اور عورت دونوں میں تولیدی اعضاء مشترک تھے لیکن صدیوں کے عدم استعمال کی وجہ سے ایک صنف میں دوسری کے تولیدی اعضاء اپنی مکمل صورت نہیں اختیار کر پاتے اسی طرح اکثر قدیم مذاہب اور اساطیر میں بھی مشترک جنسی خصائص کا عقیدہ ملتا ہے مثلاً ہندوؤں کے نزدیک شیو یا شنکر — فنا اور بقا — دو قوتوں کا مالک ہے، اس کی ایک قوت کو لنگ اور دوسری کو یونی سے ظاہر کیا جاتا ہے اس طرح برہما نے اپنے آپ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک مرد اور دوسرا عورت تھا۔ دونوں کے جسمانی ملاپ سے منو نے جنم لیا۔

یونانی اور دیگر اساطیر میں بھی اس سے ملتے جلتے عقاید ملتے ہیں اور چینی تاؤمت کی تو بنیاد ہی اس اصول پر قائم ہے۔

انیما اور انیمس کی اس لحاظ سے بہت زیادہ اہمیت ہے کہ ایک حد تک جنسی محبوب کے انتخاب کا انحصار ان ہی پر ہوتا ہے صنفِ مخالف میں وہ جسے پسند کرتے ہیں، دراصل وہ ان کی اپنی لاشعوری خصوصیات ہوتی ہیں اور اپنے محبوب میں نظر آنے والی خوبیاں درحقیقت انیما اور انیمس کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ ژنگ نے انہیں دانتے کی محبوبہ بیٹریس (BEATRICE) اور رائیڈر ہیگرڈ (RIDER — HAGGARD) کے مشہور ترین ناول SHE کی ہیروئن سے تشبیہ دی ہے

ژنگ کے خیال میں فرد کی جنس سے قطع نظر فرد کا شعور مردانہ اور لاشعور زنانہ ہوتا ہے اور اس لیے مرد کے احساسات و ہیجانات اور عورت کی سوچ اور تفکر کا تعلق لاشعور سے ہوتا ہے۔ انیما کی بدولت مردوں پر موڈ طاری ہوتے ہیں اور انیمس کی بدولت عورتیں ہر معاملہ میں رائے زنی کیے بغیر نہیں رہ سکتیں اس لیے عموماً عورتوں کی سوچ کو حقائق سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ —

ژنگ کے نزدیک انیما اور انیمس کی اہمیت اور ان کے اثرات صرف فرد کی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتے بلکہ یہ اہم ترین اساسی نقوش میں سے ہیں اور ان ہی بدولت علم الاصنام اور دیوی دیوتاؤں کی تخلیق کی گئی، ہمارے خواب بھی ان سے خالی نہیں ہوتے ایک مرد کے خوابوں میں انیما ایک ایسی عورت کے روپ میں آئے گا جس کا کوئی چہرہ نہیں یا اگر ہے تو وہ اس کے نقوش سے ناآشنا ہے، اس کے برعکس عورت کے خوابوں میں انیمس مردوں کے اژدحام کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے بعض اوقات یہ لڑکے یا محض ایک مردانہ آواز کی صورت میں بھی ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔

"عورتوں کے طرزِ عمل میں انیمس کا مشاہدہ کرنا کوئی مشکل نہیں۔ عورتیں انیمس کے خصائص کا عام مردوں پر اطلاق کرنے کی عادی ہوتی ہیں اس لیے ایک عورت ہمیشہ مرد کو اس کے اصل خدوخال میں نہیں دیکھ سکتی۔ بلکہ اسے اپنے انیمس کی روشنی میں دیکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ جذباتی وابستگی کی صورت میں عورتیں عموماً اپنے محبوبوں کو دیوتاؤں کا درجہ دے دیتی ہیں۔ وہ اسے سورج قرار دے کر خود سورج مکھی بن کر رہ جاتی ہیں، لیکن جونہی حقیقت سے دوچار ہوتی ہیں تو ان کے تمام خواب کانچ کے برتن کی طرح چکنا چور ہو جاتے ہیں۔

"جن عورتوں میں انیمس زیادہ شدید صورت اختیار کر جاتا ہے — وہ سخت گیر استانیوں اور جابر ماؤں کی صورت میں اپنے مردانہ پن کا اظہار کرتی ہیں، ان میں استدلالی طریقہ سے سوچنے کی صلاحیت نہیں رہتی اور بظاہر ریشم کے لچھوں ایسی نرم روی کے باوجود بھی وہ فولاد ایسی سختی رکھتی ہیں، یہ ٹوٹ جائیں گی مگر انہیں موڑنا آسان نہیں ہوتا۔

جن مردوں میں انیما زیادہ قوی ہوتا ہے۔ ان پر بعض اوقات موڈ خراب ہونے کا دورہ سا پڑتا ہے وہ ہیجانی اور جذباتی لحاظ سے بہت زیادہ اشتعال

پذیر ہو کر الٹی سیدھی بلکہ احمقانہ حرکتیں کر جاتے ہیں۔ بسا اوقات اسی انیما کے بدولت بعض لوگ عورتوں سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ انہیں اپنے جن انیما خصائص سے نفرت ہوتی ہے، وہ صنفِ نازک پران کا اطلاق کر کے گویا خود کو انیما کے اثرات سے بچا لیتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے زندگی سے مطابقت پیدا کرنا آسان نہیں رہتا۔ اس کے برعکس جب مرد اپنے انیما کے خصائص کو پسند کرتا ہو تو وہ جس عورت پران کا اطلاق کرے گا وہ اسے پرستش کی حد تک چاہے گا، اور اپنے جنونِ الفت کے ہاتھوں اس کی خاطر تن من دھن سب کچھ تباہ کرنے سے بھی احتراز نہ کرے گا۔

جب دونوں فریقین میں انیما اور انیمس قوی ہوں تو ان کی شادی کامیاب اور خوشگوار رہتی ہے۔ مرد میں دبنے کی خواہش ہوگی اور عورت میں چھا جانے کی، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو ان دونوں کی حالت ندی کے کناروں ایسی ہوتی ہے جو سدا ساتھ رہتے ہوئے بھی نہیں مل سکتے۔

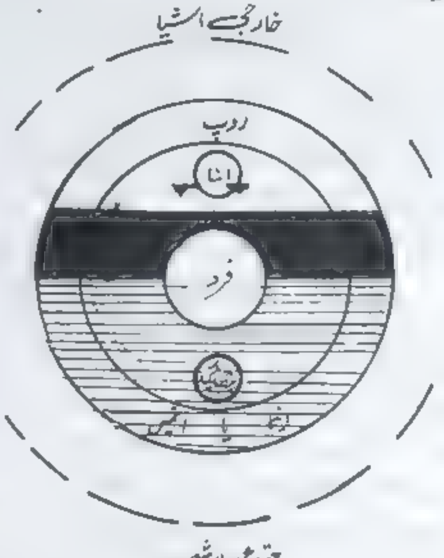

ذات

انیما محض بعض رجحانات کا نام ہی نہیں بلکہ یہ بے انتہا توانائی بھی رکھتا ہے جب تک یہ لاشعوری رہتا ہے۔ اس وقت تک تو یہ توانائی بھی لاشعور ہی میں رہتی ہے۔ لیکن جب یہ شعور میں آتا ہے تو زندگی کے عام مظاہر میں اظہار پا کر آسودگی حاصل کر لیتا ہے۔ یوں لاشعور سے تو وہ توانائی خارج ہو گئی لیکن شعوری انا نے اسے حاصل نہ کیا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ توانائی کدھر گئی؟

اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ شعور کا مرکز انا ہے جو اپنی جگہ آزاد اور خود مختار ہے، اسی وجہ سے ایک تو وہ لاشعوری توانائی سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتی اور اگر ـــ بفرضِ محال وہ اس توانائی کو اپنا بھی لے تو اس کی حالت اس کشتی ایسی ہوگی جو زیادہ بوجھ سے ڈوب جاتی ہے۔

ویسے بھی انیما کی توانائی انا کے بس کا روگ نہیں ہوتی، اس لیے یہ توانائی شعور و لاشعور کے درمیان اپنا مقام بنا لیتی ہے جہاں یہ ان دونوں کے درمیان ایک قسم کے پل کا کام کرتی ہے۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں شعور اور لاشعور کی متضاد خصوصیات کا باہمی امتزاج ایک متحد شخصیت کو جنم دیتا ہے ـــ اسے ہی ژنگ نے ذات کا نام دیا ہے۔ یہ ذات کچھ ویسا ہی کام کرتی ہے جس طرح انا شعور کا مرکز ہے اسی طرح شخصیت کے یہ مختلف عناصر اور عوامل لاشعور کے لیے ایک قسم کا مرکز بن جاتے ہیں یہ صرف ذات ہی کی بدولت ہے کہ ہر انسان میں شعور و لاشعور، خیر و شر اور دیگر تمام متضاد اور مخالف خصائص کا اجتماع اس انداز سے ہو جاتا ہے کہ اس کی شخصیت کا توازن برقرار رہتا ہے۔

اگر ذات کی تشکیل ڈھنگ سے ہو تو اس کی مقناطیسی قوت سب پر چھا جاتی ہے حتیٰ کہ انا جو پہلے تمام نفس کا مرکز تھی اب ذات کا طواف کرتی ہے (وہ شعور کا مرکز بھی رہتی ہے) اور ژنگ کے بقول یہ طواف بالکل اسی طرح سے ہے جس طرح زمین سورج کے گرد گردش کناں ہے۔ اور یوں اب ذات تمام نفس کی مرکزیت کی ذمہ داری اختیار کر کے تمام قوت و توانائی کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔

لیکن ذات کی تشکیل کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لیے لامتناہی سعی اور جہدِ مسلسل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ذات کی صورت میں فرد نے اپنی شخصیت کے تمام متضاد پہلوؤں کو ایک مرکز پر لا کر روشنی اور سایوں کے مناسب امتزاج سے صحت و توانائی کی ایک مکمل تصویر تیار کرنی ہے ـــ اور ظاہر ہے کہ یہ آسان نہیں۔ ژنگ کے الفاظ میں ذات کی یوں تعریف کی جا سکتی ہے:

"ذات صرف مرکز ہی نہیں بلکہ شعور اور لاشعور کو اپنے دامن میں لے لینے والا دائرہ بھی ہے۔ جس طرح شعور کا مرکزی نقطہ انا ہے اسی طرح اس وحدت کا مرکز ذات ہے۔"

ایک اور موقع پر:

"ذات مقصودِ حیات ہے۔ یہ تو انفرادیت کے مکمل اظہار کا نام ہے۔"

نفسیاتی اقسام

نفسیاتی اقسام کا نظریہ ژنگ کے مشہور ترین نظریات میں سے ایک ہے باطن بین اور ظاہر بین اب ایسے الفاظ نہیں رہے کہ جن کا مفہوم کانوں کے لیے قطعی اجنبی ہو۔

ژنگ نے وظائفِ نفس کے چار مدارج مقرر کئے ہیں۔ بالفاظِ دیگر انسان کسی شے کی حقیقت یا اس کے وجود کا ادراک چار ذرائع سے کر سکتا ہے۔ ان چار مدارج میں سے دو عقلی اور دو غیر عقلی ہیں۔ عقلی کے ضمن میں سوچ اور احساس اور غیر عقلی کے تحت حس اور وجدان آتے ہیں۔

حس

خارجی ماحول سے ابتدائی واقفیت حواس کے ذریعہ سے حاصل کی جاتی ہے جو اس حسِ ہماری معلومات کے لیے خشتِ اساس کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سوچ

لیکن حواسِ خمسہ کے ذریعہ سے اشیاء کا ادراک اس وقت تک نامکمل رہتا ہے جب تک ان کے متذکرہ معانی و مفاہیم سے شناسائی نہ پیدا کی جائے۔ اشیاء کو معانی عطا کرنا اور بعد میں ان کو ان ہی کے معانی کی روشنی میں پرکھنا سوچ کا مرہونِ منت ہے۔

احساس

لیکن محض معانی بھی ایک حد تک کے بعد بے کار محض ثابت ہوتے ہیں کیونکہ بعض اشیاء کے ساتھ خوشگواری اور ناخوشگواری کے پہلو بھی وابستہ ہیں، یوں ہر شے کی قدر کے تعین کی ضرورت محسوس ہوتی ہے شے کی قدر کے تعین کے عمل کا نام احساس ہے۔

وجدان

بظاہر مندرجہ بالا عناصر انسانی معلومات کے لیے کافی نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود حقیقت کے بعض پہلو ایسے ہیں جن تک اس کی رسائی حس، سوچ یا احساس کے ذریعہ سے بھی نہیں ہو سکتی۔ اس صورت میں حقیقت کا بلاواسطہ ادراک کیا جاتا ہے۔ حقیقت اور اشیاء کے باہمی تعلق کے اس

بلاواسطہ ادراک کا نام وجدان ہے اور جہاں یہ تینوں ناکام رہتے ہیں وہاں سے وجدان کی حد شروع ہوتی ہے۔

ہر انسان ان چاروں ذرائع کو ہی بروئے کار لاتا ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ بعض مخصوص حالات کی وجہ سے ان میں سے ایک عنصر زیادہ ترقی یافتہ صورت میں ملتا ہے اور باقی تین اس ایک کے تابع ہو کر ایک لحاظ سے اس کی رنگ میں رنگے جاتے ہیں، مثلاً وہ انسان جو سوچ کو باقی تین پر ترجیح دیتا ہے تو اس کے لیے سوچ کسی مقصد کا ذریعہ نہیں بلکہ خود ایک قسم کا مقصد بن کر رہ جاتی ہے۔ یہ ایک لحاظ سے فطرتِ ثانیہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور اس کے لیے دوسروں کی سوچ ہی ان کی پرکھ کا معیار بن کر رہ جائے گی۔

یہی حال دیگر تین عناصر کا ہے۔

ژنگ نے حقیقت کے ادراک کے ان چار ذرائع پر مبنی انسانوں کی نفسیاتی لحاظ سے چار اقسام قرار دی ہیں۔

نفسیاتی اقسام کو ژنگ کی اصطلاحی زبان

باطن بین، ظاہر بین

میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے: لیبیڈو کی ترقی حرکت سے ایک عنصر کو دیگر تین عناصر پر فوقیت حاصل ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے جس شعوری رجحان کا تعین ہوتا ہے وہ اس کی سمتی حرکت سے تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ چاروں اقسام لیبیڈو کی ترقی اور سمت حرکات کی پیدا کردہ ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ لیبیڈو میں داخلی اور خارجی حرکت بھی ہوتی ہے۔ لیبیڈو کی ان حرکات سے نفس میں ایک نئی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے اگر لیبیڈو کی ترقی حرکت کا ذکر کیا جائے تو اس کے ساتھ ساتھ اس امر کی توضیح بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ کہ یہ ترقی حرکت داخلی ہے، کہ خارجی۔ کیونکہ لیبیڈو کی ترقی حرکت جہاں بیرونی ماحول اور گرد و پیش کی اشیاء کی طرف (خارجی) ہو سکتی ہے تو وہاں اس کا فرد کی اپنی ذات پر ارتکاز خارج از امکان نہیں جو کہ سراسر داخلی ہے۔

ژنگ نے لیبیڈو کی ان داخلی اور خارجی حرکات کے لیے باطن بین اور ظاہر بین کی اصطلاحات وضع کی ہیں۔ جب لیبیڈو بیرونی اشیاء اور ان کے مظاہر سے دلچسپی لیتا ہے تو ایسے فرد کو ظاہر بین کہتے ہیں اس کے برعکس جب لیبیڈو اپنے نفس کی گہرائیوں میں گم رہتا ہو تو فرد بیرونی ماحول سے کٹ کر اپنے لیے خود ہی ایک محشر خیال بن کر رہ جاتا ہے، اسے باطن بین کہتے ہیں۔

ژنگ رقم طراز ہے:

"ایسے انسانوں کی اکثریت ہے جو کسی عمل کے موقع پر ایک ثانیہ کے لیے قدرے جھجکتے ہیں۔ گویا بغیر الفاظ استعمال کئے ہی وہ انکار کر دیتے ہیں۔۔۔ برعکس ان کے ایسے لوگ بھی ہیں جو اس موقع پر فوراً میدان عمل میں یہ سمجھتے ہوئے کود پڑتے ہیں کہ ان کا طرز عمل بالکل صحیح ہو گا۔۔۔ اوّل الذکر کو باطن بین اور موخر الذکر کو ظاہر بین کہا جا سکتا ہے":

واضح رہے کہ باطن بین اور ظاہر بین کے معانی مندرجہ بالا چار اقسام سے زیادہ وسیع ہیں اور یہ چاروں اقسام ان دو میں شامل ملیں گی۔ مثلاً یہ ممکن ہے کہ ایک ظاہر بین میں سوچ زیادہ قوی ہو اسی طرح دیگر عناصر بھی کسی نہ کسی خاص ترتیب و امتزاج کے ساتھ پائے جا سکتے ہیں اور یوں ظاہر بین سوچنے والا — ظاہر بین احساسات والا — علیٰ ہذا القیاس انسانوں کی نفسیاتی لحاظ سے آٹھ اقسام بن جاتی ہیں — یہ تقسیم ان آٹھ اقسام تک ہی محدود نہیں کیونکہ انسانوں کو کبوتروں کی مانند کابک کے مختلف خانوں میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صرف انسانوں کو سمجھنے کے لیے اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ژنگ کے ان اصولوں کی روشنی میں بعض مشاہیر کی شخصیات کا تجزیاتی مطالعہ بھی کیا۔ مثلاً اس نے کانٹ (باطن بین سوچنے والے) کا گوارلیمان (ظاہر بین سوچنے والے) کے ساتھ تقابلی مطالعہ کیا۔

افراد کے نفسیاتی طرزِ عمل میں ابتداء سے ہی تفریق و تمیز کی جا سکتی ہے بلکہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پیدائشی لحاظ سے ہی بعض مخصوص رجحانات کے حامل ہوتے ہیں ایک ہی والدین کے بچے ایک ہی گھر میں یکساں حالات میں پرورش پاتے ہیں لیکن ایک باطن بین اور دوسرا ظاہر بین نکلتا ہے۔ بقول ژنگ ظاہر بین بچہ بہت جلد اپنے آپ کو ماحول کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے وہ ہر چیز پر خصوصی توجہ دیتا ہے اور ان سے خوف یا شرم نہیں محسوس کرتا بلکہ بڑے اعتماد سے ان کے درمیان رہتا ہے اس طرح اس کی ادراکی قوت بھی زیادہ شدید ہوتی ہے، ایسے ہی بچے والدین کے چہیتے، دوستوں میں مقبول اور اساتذہ کی پسندیدگی کا مرکز بنتے ہیں۔ یہ سب کے دوست ہیں، اور سب ان کے بہی خواہ۔ مسرت اور کامرانی ان ہی کے لیے ہوتی ہیں لیکن اس کے برعکس باطن بین شرمیلا اور جھجکتا رہتا ہے ہر نیا چہرہ، نئی بات اور عمل کا نیا موقع اس کے لیے ایک بارِ گراں سے کم نہیں ہوتا۔ یہ خلوت گزین اپنے خیالات کے تانے بانے میں الجھا رہتا ہے یہ سب سے عاجز اور سب اس سے پریشان۔ لیکن عموماً ایسے بچے ہی بڑے ہو کر فن کار، موسیقی دان اور ادیب بنتے ہیں کیونکہ تنہائی پسند ہونے کی وجہ سے ان کی قوتِ متخیلہ باقی قوی کی نسبت بہت زیادہ نشوونما پا جاتی ہے۔

آخر میں ایک اور نقشہ درج کیا جاتا ہے جس سے ژنگ کے نقطۂ نظر سے قبل تہذیب سے جدید عہد کے فرد کا ارتقاء واضح ہو جاتا ہے یہ بھی اس کے غیر مطبوعہ لیکچروں سے لیا گیا ہے۔ اور اپنی جگہ اس قدر کامل ہے کہ اس کے لیے کسی قسم کی تشریح کی ضرورت نہیں ہے (نقشہ اگلے صفحے پر)

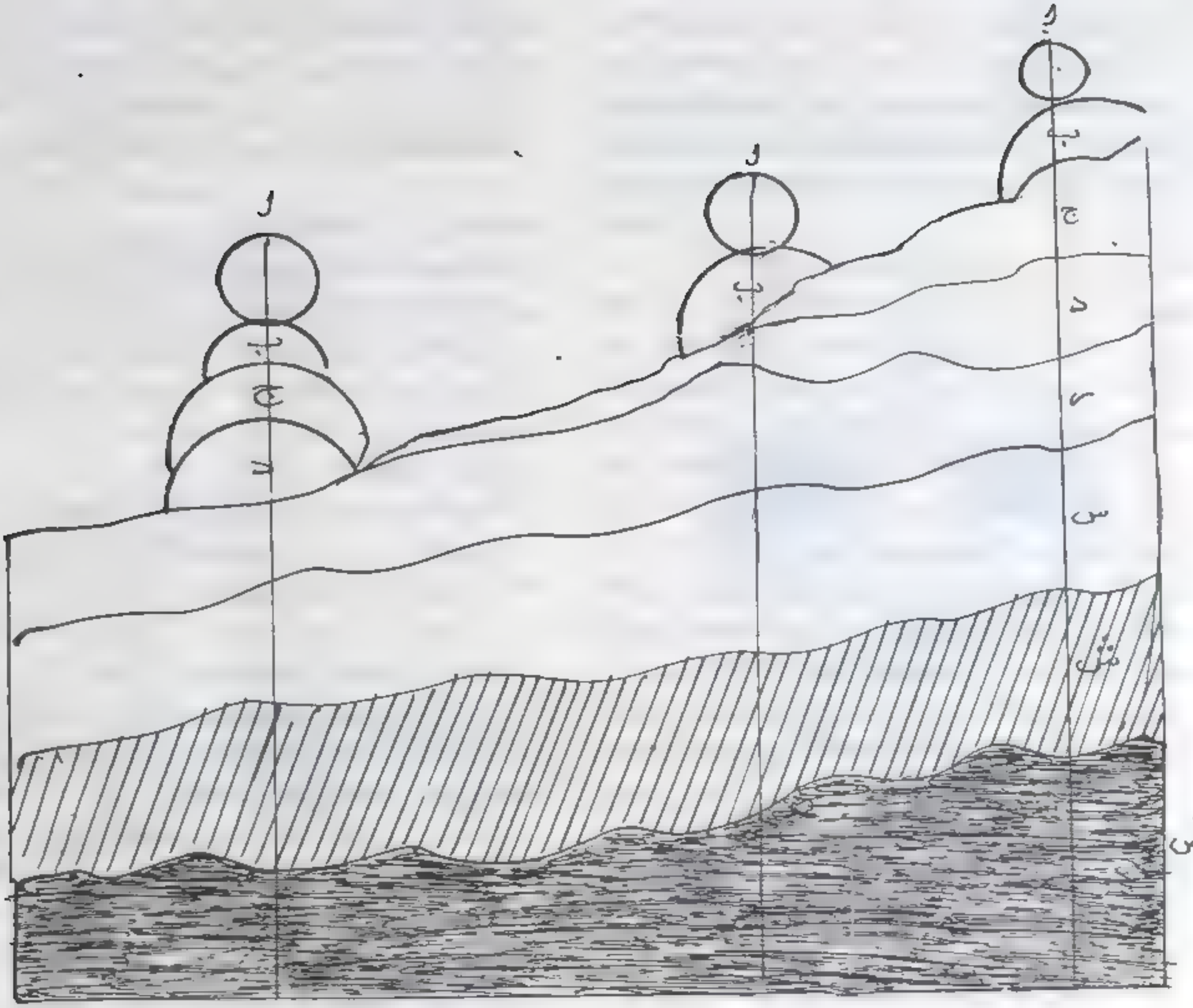

ا ۔ فرد
ب ۔ کنبہ
ج ۔ برادری
د ۔ قوم
ر ۔ بڑے انسانی گروہ (مثلاً پاکستانی لوگ)
س ۔ قدیم غیر آباد
ش ۔ عمومی حیوانی آباد
ص ۔ عمومی زندگی

ایڈلر

الفریڈ ایڈلر : ایک مطالعہ

نظریات :— انفرادی نفسیات - ایک تعارف

(۱) شخصیّت کی تشکیل

معنوی کمتری — معنوی زبان — احساس کمتری — ماحول (عقائد و نظریات، کنبہ، سماجی حیثیت)

(۲) بچہّ کی نشو ونما۔ قطرہ سے گوہر ہونے تک

ذہنی تحریک — نظام ادراک — راہنما مفروضہ — اندازِ زلیست — احتجاجِ مردانگی

(۳) اعصابیت

کمتری الجھاؤ —— برتری الجھاؤ —— نیوراتیت

(۴) نظریۂ جنس

جنس اور معاشرہ — جنسی کردار — شادی — جنسی کجرویاں

(۵) خواب

الفریڈ ایڈلر - ایک مطالعہ

ایڈلر ۱۸۷۰ء میں ویانا کے نواحی قصبہ پینزنگ میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ لیوپولڈ ایڈلر مکئی کا بیوپاری تھا۔ والدین ہنگری سے تعلق رکھتے تھے۔ گو یہ یہودی والدین کے ہاں پیدا ہوا مگر اس نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا۔ اور مسیحیت قبول کر کے پروٹسٹنٹ فرقہ میں شامل ہو گیا۔

ایڈلر چار بھائیوں اور دو بہنوں پر مشتمل کنبہ میں دوسرے نمبر پر تھا۔ ایڈلر نے خود ہی اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اس کے اپنے بھائی کے ساتھ تعلقات کوئی ایسے خاص خوشگوار نہ تھے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ پہلا بچہ ہونے کی وجہ سے ماں بڑے بھائی کو باقیوں پر زیادہ ترجیح دیتی ہو گی بہر حال یہ حقیقت ہے کہ اسے اپنی ماں کے ساتھ کوئی ایسی زیادہ دلچسپی نہ تھی ویسے بھی وہ مرد مزاج عورت تھی اور جب اس کے چھوٹے بھائی کی اچانک موت کے بعد اس نے — ایڈلر کے خیال میں — زیادہ عرصہ تک سوگ منانے کی بجائے جلد ہی ہنسنا مسکرانا شروع کر دیا تو اس "جرم" کے لیے ایڈلر نے تمام عمر اسے معاف نہ کیا۔ یوں بھی اس کی ماں اعصابیت کی شکار اور کوئی ایسی زیادہ خوش مزاج نہ تھی — بس وہ صبح سے لے کر رات گئے تک گھر کے کاموں میں جتی رہتی۔

ایڈلر اپنے باپ سے بہت زیادہ مانوس تھا جو ایک بے فکر اور بذلہ سنج انسان تھا۔ اس میں آہنی قوت ارادی کے ساتھ ساتھ احساس تفاخر بھی تھا وہ صرف خوش شکل ہی نہیں بلکہ اچھے اور صاف ستھرے کپڑوں کا بھی شوقین تھا بلکہ لباس کی صفائی اور جوتے کی چمک کا تو اسے اچھا خاصا خبط تھا اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ بچوں کو آزادی دے کر ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے اصول پر کاربند تھا اس نے نہ تو بچوں کے بے جا لاڈ پیار اور چاؤ چونچلے ہوتے تھے اور نہ ہی انہیں بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ اور سزا ملتی تھی۔ علی الصبح باپ بیٹا دونوں سیر کو جاتے اور اس موقع پر اس کا باپ عموماً اسے یہ کہا کرتا تھا:

"الفریڈ! ہر ایک کی بات پر بلا سوچے سمجھے کبھی بھی یقین نہ کرو!"

ایڈلر کا تمام کنبہ موسیقی سے شغف رکھتا تھا۔ اس کا ایک بھائی وائلن میں تو دوسری بہن پیانو بجانے میں ماہر تھی۔ خود ایڈلر کی اپنی آواز اتنی دلکش تھی اور اس کا گلا اتنا سریلا تھا کہ سب نے اسے موسیقی کو بطور پیشہ اپنانے کا مشورہ دیا تھا۔

ایڈلر نے بعد میں بتایا کہ بچپن میں میرے ذہن میں ہر وقت موسیقی کی دھنیں سمائی رہتی تھیں اور دماغ میں خیالات کی بجائے دھنیں آتی تھیں، ویسے یہ کبھی کبھی پیانو کے ساتھ شوبرٹ (SCHUBERT) اور شومین (SCHUMANN) کی بیلڈز گایا کرتا تھا۔ موسیقی کے ضمن میں یہ دونوں فن کار اس کے محبوب تھے۔

بچپن میں ایڈلر بہت لالچی اور ندیدہ تھا۔ اس کی خواہش ہوتی تھی، کہ ہر چیز اسے ہی مل جائے۔ اس کے باپ نے ایک مرتبہ اس کے آگے بھری ہوئی پلیٹ رکھ کر کہا۔

"جو تم باقی چھوڑو گے ہم سب اسے کھائیں گے۔" اور اس کے بعد ایڈلر نے کبھی ندیدے پن کا مظاہرہ نہ کیا۔

ایڈلر بچپن میں زیادہ تر بیمار ہی رہا مگر لڑکپن میں اس کی صحت بہت اچھی تھی یہ سارا سارا دن گھر سے باہر جیبڑہ کے جنگلات میں گھومنے، کشتی رانی اور کوہ پیمائی میں گزار دیا کرتا۔ اسے پھولوں سے عشق اور پرندوں سے پیار تھا۔ یہ سکول سے آتے وقت سیٹی بجایا کرتا اور اس کے پالے ہوئے تمام کبوتر اس کی طرف اڑے چلے جاتے اسی طرح پھولوں سے عشق کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ پھول توڑنے کے لیے شاہی محل کے باغ میں جا گھستا تھا۔

یہ لڑائی مار کٹائی میں بھی تیز تھا مگر پھر بھی یہ اپنے علاقے کے مقبول ترین لڑکوں میں سے تھا اور زندگی سے گہرے پیار کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ زندگی کے تمام مظاہر سے یکساں قسم کی دلچسپی کا اظہار کرتا تھا، اس نے ایک مرتبہ کہا تھا:

"مجھے شور سے محبت ہے اور مجھے ایک معروف سڑک پر آمد و رفت کے شور سے بڑھ کر اور کوئی موسیقی پسند نہیں!" جب بڑا ہونے کے بعد یہ سڑکوں کی موسیقی کے لیے وقت نہ نکال سکتا تو اس نے ان کی جگہ کیفے اور ریستورانوں کے شور میں خود کو مدغم کر دیا۔ جنگ عظیم اوّل سے قبل کا ویانا موسیقی، اوپیرا، ناچ گھروں اور ہوٹلوں کے لیے خاص مشہور تھا، چنانچہ ایڈلر بھی اپنے مخصوص احباب کے ساتھ فرصت کے اوقات اپنے پسندیدہ کیفے میں گزارا کرتا۔ یہاں نہ صرف شہر کے دانش وروں سے ہی ملاقات ہو سکتی تھی بلکہ زمانہ بھر کی خبریں اور تازہ ترین سکینڈلوں کے ساتھ ساتھ لوگوں کو مشاہدہ کرنے کے مواقع بکثرت ملتے تھے۔

اس طرح اسے فلموں سے بہت دلچسپی تھی، فلموں کے ساتھ ساتھ سنسنی خیز خبروں کے لیے یہ شام کے اخبارات کا بڑے شوق اور دلچسپی سے مطالعہ کرتا جب وہ نیویارک میں تھا تو ایک دن اپنے ہوٹل کی کھڑکی سے ٹریفک کی سرخ سبز روشنیوں کو کافی دیر تک تبدیل ہوتے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے ان پر یوں اظہار خیال کیا:

"یہ ایک بڑے شہر کی شاعری ہے"

چھوٹے چھلے ایڈلر کے چہرہ میں سب سے نمایاں اور جاذب اس کی آنکھیں تھیں چمکدار روشن اور ہنستی مسکراتی آنکھیں، ادھر گھنی بھوؤں کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں چنچل پن کی بجائے ایک خاص گہرائی اور تفکرانہ انداز پیدا ہو گیا تھا۔

ایڈلر کی انفرادی نفسیات میں احساس کمتری کو اساسی اور مرکزی اہمیت حاصل ہے اور ایسے کئی شواہد موجود ہیں جن کی بنا پر اگر یہ قیاس لگایا جائے کہ یہ خود بھی بچپن میں اس کے ہاتھوں کافی پریشان رہا تو کچھ غلط نہ ہو گا۔ سب سے پہلے تو اسے یہ احساس تھا کہ اس کی ماں اس کے — اور باقیوں کے مقابلہ میں — سب سے بڑے بھائی کو ناجائز حد تک ترجیح دیتی ہے۔ اس لیے اس کی کبھی بھی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ اچھی طرح سے نہ بن سکی۔ اس کا بھائی اسے ضدی اور چڑچڑا سمجھتا تھا اس وجہ سے اسے اپنے گھر سے کوئی خاص دلچسپی نہ رہی تھی۔ اس کی ابتدائی یادوں میں جلن، حسد اور محرومی کا وہ احساس بھی ہے جو چھوٹے بھائی کی پیدائش پر اس نے محسوس کیا کیونکہ اب اسے ایسے محسوس ہوتا تھا کہ بڑے اور چھوٹے بھائی نے مل کر "اس کی" ماں کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔

اس کی اولیں یاد دو سال کی عمر کے اس دن سے متعلق ہے جب یہ سوکھے کی بیماری کی وجہ سے پٹیوں میں بندھا ایک بنچ پر بیٹھا تھا، اس کا صحت مند بڑا بھائی بھی اس کے ساتھ بیٹھا تھا جو بڑی آسانی سے اچھل کود اور بھاگ دوڑ سکتا تھا، جب کہ اس کے لیے معمولی سی حرکت بھی باعث اذیت تھی — یہ اور ایسے ہی کئی اور تاثرات نے مل کر اسے اسی راستہ پر لگایا جس پر چل کر اس نے کمتری الجھاؤ کا نظریہ پیش کیا۔ اس ضمن میں وہ خود بھی رقم طراز ہے:

"میں نے ابتدا سے ہی عضویاتی کمتری کے احساس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی، اس کے ساتھ ہی اپنے کنبے سے باہر کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی وجہ سے

ؔ ایک دفعہ ایڈلر سے پوچھا گیا کہ بچوں کی تربیت کس مقصد کے تحت کی جانی چاہیئے۔ ایڈلر کا جواب اسکے باپ کے نظریہ کی بازگشت معلوم ہوتا ہے:
"بچے کو ایذا ... مت دباؤ"

میرے نفسی ڈھانچہ کی ساخت کچھ اس انداز سے ہوئی کہ زندگی کے بارے میں میرا طرزِ عمل بدل کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھ میں ہر معاملہ میں اپنے بھائی کی برابری کرنے کا بھی شدید جذبہ تھا۔ جن لوگوں نے میری حاصلِ زیست کتاب Individual Psychology کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ یہ ضرور محسوس کریں گے کہ عضویاتی کمتری کے بارے میں پیش کیے گئے نظریات اور میرے بچپن کے واقعات میں یک گونہ مماثلت پائی جاتی ہے۔"

ایڈلر بھی باپ کی طرح مضبوط قوتِ ارادی اور بلند عزائم کا مالک تھا، لیکن سکول میں تعلیم کے دوران یہ کوئی ایسا ہونہار اور ممتاز طالب علم نہ تھا۔ خصوصاً ریاضی سے اسے شدید نفرت تھی — بلکہ اس کے ایک استاد نے تو اس کے باپ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اسے سکول سے ہٹا کر کسی موچی کی شاگردی میں دیا جائے کیونکہ تعلیم اس کے بس کا روگ نہیں۔

ایک دن جماعت میں استاد تختۂ سیاہ پر ایک مشکل سوال سے کشتی لڑ رہا تھا سبھی اس سوال کو حل کرنے میں ناکام رہے تھے۔ اچانک — جیسے اندھیرے کمرہ میں اجالا ہو جائے اسی طرح اس کے ذہن میں سوال کا جواب آ گیا، مگر اپنی مسلّمہ نالائقی کو دیکھتے ہوئے اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ہاتھ کھڑا کر کے سوال کا حل بتلائے لیکن جب استاد اور ہوشیار طالب علم سبھی ہمت ہار بیٹھے تو اس نے ہمت کی اور جونہی اس نے ہاتھ کھڑا کیا استاد اور ہم جماعت سبھی کے قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا، لیکن ایڈلر کا جواب واقعی صحیح تھا! اس دن کے بعد سے اس کی نالائقی ختم ہو گئی اور حساب اس کا محبوب ترین مضمون بن گیا۔

مریضانہ بچپن کے ساتھ ساتھ ہی بعض ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے اس کے ذہن پر موت نے گہرا (مگر غیر مریضانہ) نقش چھوڑا۔ کم عمری ہی میں ورمِ حلق کی وجہ سے اسے دم گھٹنے کی کیفیت کا بڑا شدید اور خوفناک تجربہ ہوا تین سال کی عمر میں ایک صبح جاگنے پر اسے معلوم ہوا کہ چھوٹا بھائی متصل بستر پر مردہ حالت میں پڑا ہے اور دو سال بعد جب یہ نمونیہ میں مبتلا تھا تو ڈاکٹر نے اس کی نازک حالت دیکھ کر صاف کہہ دیا کہ اب اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں — ایک طویل مدت کے بعد ایڈلر نے اس وقت کے تاثرات کو یوں بیان کیا:

"اس وقت مجھ پر شدید قسم کی دہشت غالب آ گئی اور جب چند دنوں کے بعد میں ٹھیک ہو گیا تو میں نے اسی وقت ڈاکٹر بننے کا تہیہ کر لیا تاکہ دوسرے ڈاکٹروں کے رحم و کرم پر پڑا رہنے کی بجائے موت اور بیماری سے مقابلہ کے لیے میں خود کو زیادہ مناسب اور موزوں اسلحہ سے لیس کر سکوں۔"

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ہی اس کے ایک دوست کے باپ کا انتقال ہو گیا اور یوں اس کے اس ارادہ کو اور بھی تقویت ملی —

فلیس بوٹم (PHYLLIS BOTTOME) کے بقول ایڈلر نہ صرف تناقضات سے محبت کرتا تھا بلکہ خود اس کی زندگی بھی مجموعہ اضداد تھی۔ وہ بڑی آسانی سے دوست بن جاتا لیکن اس کی تہہ کو کوئی نہ پا سکتا تھا۔ بہت بے تکلف لیکن ساتھ ہی نہایت گمبھیر، وہ اپنے ساتھیوں کے لیے سخاوت، سیر چشمی اور دل جمعی سے کام کرنے والا تھا لیکن اگر کوئی ان خصوصیات سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا تو یہ اس کا سب سے بڑا دشمن تھا، جس انسان پر اسے اعتماد نہ ہوتا اس کے ساتھ یہ کسی قسم کا رابطہ رکھنا پسند نہ کرتا اس کے ساتھ ہی جہاں اس میں بے انتہا صبر اور ضبط کوٹ کوٹ کر بھرا تھا وہاں طبیعت کے لحاظ سے بہت گرم، تیز اور جوشیلا تھا۔

ایڈلر کو ارسطو کی تعلیمات سے بہت لگاؤ تھا اور اسی کی مانند یہ تندی عقلِ عام کے اصولوں کی روشنی میں بسر کرنے کا قائل تھا۔ اس کی اصول پرستی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی تھی یہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو محض اچھے اچھے اصول وضع کرنے میں لگے رہتے ہیں بلکہ اس نے جو اصول بنائے یہ ان پر حتی الامکان عمل پیرا ہونے کی سعی کرتا۔ اس کا قول ہے:

"اپنے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی نسبت ان کی خاطر جنگ کرنا زیادہ آسان ہے

گو ایڈلر مسلسل باتیں کر سکتا تھا۔ یوں بھی ہوٹلوں میں بیٹھنے کے عادی عموماً باتونی ہوتے ہیں اور یہ خود بھی کوئی کم باتونی نہ تھا مگر اس میں ایک وصف یہ بھی تھا کہ چائے کی میز پر کبھی مجمع بازی نہ کی بلکہ بعض اوقات تو یہ گھنٹوں خاموشی سے بیٹھا دوسروں کی باتیں سنتا رہتا۔ اس نے باتیں سننے کے فن میں اتنا کمال پیدا کر لیا تھا کہ یہ دوسروں کو اپنی خاموشی کا احساس تک نہ ہونے دیتا لیکن جب یہ گفتگو کرتا تو اس کا لہجہ ہموار انداز خوشگوار اور باتوں میں مزاح کی ہلکی ہلکی چاشنی، برمحل حکایتیں اور برجستہ فقرے — یہ سب کو مزہ دیتے تھے۔ بلکہ یہ مزہ لینا اس کی سب سے بڑی خصوصیت تھی اس دور کے وی آنا میں مائیں اپنی بیٹیوں کو نوجوانوں کے ساتھ تنہا باہر نہ جانے دیتی تھیں مگر اس کی بہن ہرمین (CHERMINE) کا کہنا ہے کہ تمام مائیں اپنی بیٹیوں کے بارے میں اس پر اندھا اعتماد کرتی تھیں اور اس نے بھی ان کے اعتماد کو ٹھیس نہ لگنے دی — بلکہ جہاں تک جنسی معاملات کا تعلق ہے تو یہ نسبتاً سرد ہی معلوم ہوتا ہے اس دور کا وی آنا یورپ کے دیگر شہروں کی نسبت جنس کے بارے میں نسبتاً زیادہ آزاد خیال تھا وہ لوگ اسے انسانی زندگی کی ایک اہم ترین مسرت تصور کرتے تھے اس لیے جنس کے بارے میں ان کی اقدار میں کافی سے زیادہ لچک پائی جاتی تھی اور یہ تمام اصول بھی شادی شدہ عورتوں کے لیے تھے، مردوں کو تو کھلی چھٹی تھی، اس لیے بہت کم مرد ایسے ہوں گے جن کے ایک سے زیادہ عورتوں سے تعلقات نہ ہوں گے لیکن ایڈلر کبھی بھی ترغیبات کے چکر میں نہ الجھا۔ شاید اس کی وجہ یہ احساس ہو کہ اس نے زندگی میں کیا کیا کام کرنے ہیں اس لیے وہ وقت ضائع کرنا پسند نہ کرتا تھا"

ابتدائی تعلیم کے بعد اس نے ڈاکٹری کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ جہاں حیاتیات اور علم تشریح الاجسام اس کے خاص اور پسندیدہ مضامین تھے۔ ۱۸۹۵ء میں (جبکہ یہ ۲۵ برس کا تھا) ڈاکٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد یہ تین سال تک POLY CLINIC اور VIENNESE HOSPITAL میں کام کرتا رہا۔ بعد ازاں اس نے پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی۔ ہسپتال کے دوران میں اس نے امراضِ چشم سے خاص شغف ظاہر کیا چنانچہ ایڈلر نے اسی موضوع پر ایک رسالہ (اور اس کی اولین تصنیف) تحریر کیا، جس کا عنوان یہ تھا۔ A manual of Health for the tailoring industry بے باک حقیقت بیانی کی وجہ سے اسے اونچے حلقوں میں ناپسند کیا گیا۔

بحیثیت ایک معالج ایڈلر نے جلد ہی بہت زیادہ شہرت حاصل کر لی۔ اور یوں اس کم عمر ڈاکٹر کا نام ممتاز لوگوں کے ساتھ لیا جانے لگا۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ عام لوگوں کی طرح عورتوں کے پیچھے اپنا وقت ضائع نہ کرتا تھا۔ اس کے علاوہ عورت، محبت، جنس اور جنسی طرزِ عمل کے بارے میں اس کے اپنے مخصوص نظریات تھے۔ اور یہ اپنے اصولوں اور نظریات کو ان عورتوں کی خاطر قربان کرنے کو تیار نہ تھا۔ جن سے اسے محبت نہ تھی محبت کے بارے میں یہ شیکسپیئر کے اس مصرعے کا حامی تھا:

He never loved who loved not at first night.

اس نے ایک مرتبہ محبت کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کیا۔

"محبت دو افراد کے باہمی عمل کا نام ہے۔ جب ایک کام کو دو نے مل کر کرنا ہو تو اس کی بجا آوری کے لیے ایک خاص طریق کار متعین ہوتا ہے اس لیے جب اسے صرف ایک ہی کے کرنے کا سمجھ لیا جائے تو اسے خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچایا جا سکتا۔ یہ تو کچھ ایسے ہے کہ محبت کے الجھے ہوئے مسئلہ کو سلجھانے کے لیے دونوں فریقین کو مکمل طور سے اپنی ذات کو فراموش کر کے دوسرے فریق کی بہبود کے لیے خود کو وقف کرنا ہوتا ہے ــ یہ دو انسانوں کو ملا کر ایک نئی زندگی کی تشکیل کے مترادف ہے۔"

محبت کے اگر اس معیار کو سامنے رکھا جائے تو اس کی محبت اور شادی اس پر پوری اترتی ہیں۔ اس کی روسی محبوبہ رئیسہ تیموفیتہ ــ (RAISSA TAIMOFEJEWNA) ہر معاملہ میں ایک باغی لڑکی تھی جو مارکس کی تعلیمات میں انسانیت کی بقا سمجھتی تھی اور جس نے خود کو اس جدوجہد کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ وہ اس وقت وی آنا میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ سیاست اس کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ گو اس کا قد چھوٹا تھا مگر اس کے باوجود اس کے نقوش دل آویز تھے۔ اس کی گہری نیلی آنکھوں میں خاص قسم کی چمک اور کشش تھی، اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کا ایک مخصوص انداز تھا وہ بڑی بے باک اور جرأت مند لڑکی تھی بلکہ ان دونوں خصوصیات کے ساتھ ساتھ خودداری اور دیانت اس کے کردار کی نمایاں خصوصیت تھی۔ اسے تصنع اور ظاہرداری سے سخت نفرت تھی اسے گھر گرہستی کے دھندوں سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ ہی عام لڑکیوں کی مانند اسے ملبوسات اور بناؤ سنگھار کا کوئی خاص شوق تھا۔

ایڈلر اس سے زمانۂ طالب علمی کے دوران میں ملا۔ ان کی محبت کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب وہ چھٹیوں میں واپس روس گئی تو یہ بھی دو مرتبہ (معاشی حالات کی تنگی کے باوجود) اس کے پیچھے جا پہنچا۔ طبیعتوں کے تضاد کے باوجود ان دونوں میں والہانہ محبت تھی۔ ایڈلر نے رئیسہ کے بارے میں اپنے ایک دوست کو بتایا:

"اگر میں نے اپنی لیبارٹری میں اسے خود بھی بنایا ہوتا تو بھی مجھے اپنے ذوق کے لیے اس سے زیادہ اور کچھ نہ چاہیے تھی:"

رئیسہ ایک آسودہ حال خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ حسبِ معمول رئیسہ کی ماں اور اس کے خاندان دونوں نے ایڈلر کو بے حد پسند کیا چنانچہ ان کی شادی کسی رکاوٹ کے بغیر ہو گئی۔ ایڈلر کی محبت اور شادی کے ارادہ سے اس کے گھر والے قطعی طور سے لاعلم تھے اس لیے جب ۱۸۹۷ء کے ایک دن روس گئے ہوئے ایڈلر کی طرف سے شادی کی خبر کا تار موصول ہوا تو سب کی حیرانی کی انتہا نہ رہی ہو گی۔

شادی کے فوراً بعد ان کی معاشی حالت اچھی نہ تھی۔ اس کی نئی نئی پریکٹس تھی پھر ایڈلر اپنے گھر والوں کی بھی امداد کرتا تھا ادھر گو رئیسہ کے گھر والے اسے ہر ممکن امداد دینے کو تیار رہتے مگر رئیسہ کی خودداری نے یہ گوارا نہ کیا۔ لیکن یہ دونوں محبت کے نشہ میں چور تھے۔ ادھر ایڈلر کو اپنے مستقبل اور اپنی صلاحیتوں پر اعتماد تھا اس لیے یہ بہت خوش تھے۔

یونیورسٹی میں میڈیکل تعلیم کے دوران ایڈلر کو نفسیات سے گہری دلچسپی پیدا ہو چکی تھی اور اس نے بحیثیت ایک سائنس اس کے ارتقاء کا مکمل طور سے مطالعہ کیا تھا مگر وہ اس کی رفتارِ ترقی سے مطمئن نہ تھا، ادھر زندگی کے سادہ خیالی مسائل اور خصوصیت سے اعصابی خلل کے بارے میں اس نے اپنے نظریات وضع کرنے شروع کر لیے تھے اس دوران میں اس نے فرائیڈ کی کتاب Dream Analysis کا مطالعہ کیا اور گو یہ اس سے بے حد متاثر ہوا مگر اس کتاب نے اس کے اپنے نظریات میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کی ۱۹۰۰ء میں فرائیڈ کی اس کتاب کے بارے میں ایک مضمون چھپا جس میں اس کا مضحکہ اڑانے کی حد تک نکتہ چینی کی گئی تھی ایڈلر کو یہ غیر علمی نکتہ چینی سخت ناگوار گزری۔ اس لیے اس کے جواب میں اس نے ایک مضمون لکھا۔ جس پر فرائیڈ نے اظہارِ تشکر کے لیے اسے ایک پوسٹ کارڈ بھیجا جس میں ایڈلر کو تحلیلِ نفسی سے دلچسپی رکھنے والے حلقہ میں شمولیت کی دعوت دی گئی۔ گو نظریات میں تضاد ہونے کی بنا پر ایڈلر نے حلقہ میں اپنی شمولیت کے عمل فائدہ کے بارے میں شکوک کا اظہار کیا لیکن فرائیڈ نے اسے قائل کر لیا اور یوں جب ۱۹۰۲ء میں تحلیلِ نفسی میں دلچسپی لینے والے پہلے ۵ افراد کا حلقہ قائم ہوا تو ایڈلر بھی اس میں شامل تھا۔ گو ایڈلر فرائیڈ سے ۱۴ برس چھوٹا تھا مگر فرائیڈ اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ وہ اپنے بعد اسے تحلیلِ نفسی کی انجمن کا صدر بنانا چاہتا تھا اس طرح جب تحلیلِ نفسی کے پرچار کے لیے ایک جرنل کا آغاز کیا گیا تو یہ بھی اس کا ایک مدیر تھا۔ لیکن نظریات میں اساسی اختلافات کے باعث جلد ہی ان میں نظریاتی کشمکش شروع ہو گئی ۱۹۱۱ء میں ایڈلر نے تین لیکچروں میں فرائیڈ کے نظریۂ جنس پر کڑی تنقید کی ــ گو سٹیکل (STEKEL) نے دونوں میں مفاہمت کی کوششیں کیں مگر وہ بار آور نہ ہو سکیں اور ایڈلر نے حلقہ کی صدارت سے استعفےٰ دے دیا اس پر سٹیکل بھی نائب صدارت سے مستعفی ہو گیا۔ ان دونوں کے اختلافات کی وجہ سے دو گروہ بن گئے۔ جو لوگ ایڈلر کے حامی تھے انہوں نے پہلے خود کو SOCIETY FOR FREE PRYCHO-ANALYTIC RESEARCH کا نام دیا۔ مگر اگلے سال ہی اپنے اندازِ فکر کو فرائیڈ کے طرزِ فکر سے ممیز کرنے کے لیے ایڈلر نے اس کا نام انفرادی نفسیات سے بدل دیا۔ انفرادی نفسیات نے جلد ہی عوام اور ماہرینِ نفسیات کو اپنی طرف متوجہ کرا لیا اور کچھ مدت کے بعد صرف وسطی یورپ میں ہی ۳۴ گروپ اس نئے دبستان کی تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے کام کر رہے تھے۔ گو ہٹلر کے اقتدار سے جرمنی اور اس کے زیرِ اثر علاقوں میں اس تحریک کو کافی نقصان پہنچا لیکن اب یہ بین الاقوامی شہرت اختیار کر چکی تھی اور انگلینڈ، سوئٹزرلینڈ، ہالینڈ فرانس، آسٹریا اور امریکہ کے اکثر اہم مقامات میں انفرادی نفسیات کی حامی انجمنوں کی کارگزاریاں جاری رہیں۔

۱۹۱۴ء میں The International Journal of Individual Psychology کے نام سے ایک جریدہ کا اجرا کیا گیا۔ یہ جرمن میں تھا اور اس میں انفرادی نفسیات اور اس کے بارے میں مضامین لکھے جاتے تھے۔ یہ پرچہ آسٹریا۔ جرمن۔ چیکوسلواکیہ۔ یوگوسلاویہ اور ہالینڈ میں بہت مقبول تھا۔

اس کی مساعی سے جلد ہی انفرادی نفسیات سے دلچسپی رکھنے والوں کی ایک کثیر تعداد جمع ہو گئی چنانچہ ایک دوسرے کے خیالات سے مزید استفادہ کرنے کے لیے ۱۹۲۲ء میں انفرادی نفسیات کی پہلی بین الاقوامی کانفرنس وی آنا میں منعقد کی گئی۔

۱۹۵۴ء میں ایک بین الاقوامی تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا۔

۱۹۱۰ء میں ایڈلر نے پریکٹس ترک کر کے خود کو کلی طور سے نفسیات اور اعصابی خلل کی تحقیق کے لیے وقف کر دیا۔

اس کی پہلی باقاعدہ تصنیف Inferiority of Organ

تھی جو ۱۹۰۷ء میں چھپی۔ اس کتاب کے لیے وہ پچھلے دس سال سے مواد اکٹھا کر رہا تھا۔ اور اسے انفرادی نفسیات کے سنگِ اساس کا درجہ دیا جاتا ہے۔

۱۹۱۲ء میں اس کی دوسری — اور سب سے اہم ترین کتاب ..... The Neurotic constitution چھپی۔ ایڈلر کو خود بھی اس پر ناز تھا کیونکہ یہ اس کی تمام ذہنی کاوشوں کا نچوڑ تھی۔ اس کی طباعت کے بعد اس نے ایک دوست سے کہا "اس کتاب سے میں نے اپنی انفرادی نفسیات کی بنیاد رکھی ہے"۔

اب وہ ۴۲ برس کا تھا اور ایک ماہرِ نفسیات کے لحاظ سے اس کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ علاوہ ازیں اب وہ تین بچیوں اور ایک بچہ کا باپ بھی تھا۔

۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم میں یہ روسی محاذ کے نزدیک دو سال تک فوجی ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کرتا رہا یہ دو سال اس لحاظ سے بہت اہمیت رکھتے ہیں کہ زخمی فوجیوں کے تجربات و مشاہدات اس کے لیے بعد ازاں بہت سود مند ثابت ہوئے۔ اس سے اس نے اپنی انفرادی نفسیات کو ایک ایسا صحت مند نظریہ بنانے کا تہیہ کر لیا جو مریضوں سے محض نظریاتی دلچسپی نہ رکھے بلکہ ان کی عام زندگیوں میں ہر لحاظ سے ان کے لیے ایک مفید مشیر اور راہنما کا درجہ اختیار کر سکے شاید اسی لیے اس نے انفرادی نفسیات کو پھلوں سے بھری ہوئی ایک ایسی ٹوکری سے تشبیہ دی تھی جس میں سے ہر کوئی بقدرِ ضرورت پھل حاصل کر سکتا ہو اسی طرح نفسیات کے متعلق اس کی رائے تھی۔

علمِ ذہن کا اصل مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس کی وساطت سے ہر انسان دوسرے انسان کی فطرت کی تفہیم کے قابل ہو اور اسے ایک وسیلہ بنا کر انسانی روح کو سکون اور شانتی سے ہم کنار کرے" اپنے دو معاصرین — فرائیڈ اور ژنگ کی مانند اس کے وطن نے اس کی بھی مناسب قدر نہ کی چنانچہ جب اس نے اپنی کتاب The Nervous Character کو وی آنا یونیورسٹی میں پروفیسر شپ حاصل کرنے کے لیے پیش کیا، تو اربابِ یونیورسٹی نے اسے مسترد کر دیا بعد میں جب جرمن یونیورسٹی نے اسے اعزازی ڈگری دی اور امریکہ کے لانگ آئی لینڈ کالج (LONG - IELAND COLLEGE) نے خاص اس کے لیے طبی نفسیات کے شعبہ کا اجراء کیا تو وی آنا یونیورسٹی والوں نے بالواسطہ طور پر اس سے رابطہ پیدا کر کے اس شرط پر دوبارہ پروفیسر شپ کی پیش کش کی کہ یہ اسی کتاب کو دوبارہ پیش کرے مگر اس نے انکار کر دیا۔

جنگ کے بعد آسٹریا جن نت نئے مسائل سے دوچار ہوا ان میں سے بے گھر اور مجرمانہ رجحانات کے حامل بچوں کا مسئلہ بڑا اہم اور تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں سٹی سکول کونسل کے صدر نے اس سے ایسے بچوں کی بہبود کے لیے ایک شفاخانہ قائم کرنے کی استدعا کی۔ اس کا یہ تجربہ بہت کامیاب ثابت ہوا، اور بعد میں انہی خطوط پر تیس مزید شفاخانے قائم کیے گئے۔ ہر شفاخانہ کے ساتھ ساتھ کئی کئی سکول وابستہ تھے۔

ستمبر ۱۹۳۱ء میں ایک ایسے تجرباتی سکول کا اجراء کیا گیا جو انفرادی نفسیات کے اصولوں کے مطابق تھا۔ ایڈلر نے اس ضمن میں اساتذہ والدین اور سماجی کارکنوں کو انفرادی نفسیات کے تعلیمی اصولوں سے روشناس کرانے کے لیے پندرہ روزہ سیمینار کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ ان کی مقبولیت اس سے ظاہر ہے کہ ایک وقت میں چھ سو اساتذہ اس کے لیکچر سننے کے لیے آتے تھے۔

ایڈلر کو سیاست سے کبھی بھی دلچسپی نہ رہی تھی، جنگ کے بعد ملک میں دو بڑی جماعتیں تھیں — کرسچین سوشلسٹ (دائیں بازو کی ترجمان) اور سوشل ڈیموکریٹس (بائیں بازو کی ترجمان) ایڈلر کے تمام تعلیمی تجربات مؤخر الذکر جماعت کے عہدِ حکومت میں کیے گئے تھے۔ اس لیے جب پہلی جماعت برسرِ اقتدار ہوئی تو ایڈلر کو مخالف جماعت کا حامی سمجھتے ہوئے اس کے جاری کردہ سکول اور شفاخانہ کو ۱۹۳۴ء میں بند کر دیا گیا[1] حالانکہ ماہرینِ تعلیم اس نئے نظامِ تعلیم کو سمجھنے کے لیے دور دراز سے آیا کرتے تھے حقیقت یہ تھی کہ اسے سیاست سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی، لیکن اس کی علیحدگی کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہر پارٹی اسے مخالف پارٹی کا حامی سمجھتی بلکہ اسے یونیورسٹی میں پروفیسر نہ بنانے کی تہ میں بھی سیاسی شعبدہ بازی کا ہاتھ تھا۔

۱۹۱۹ء کے بعد سے اس کے نظریات کی مقبولیت میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ اسی سال سے اس نے بیرونی ممالک میں تقاریر کے سلسلہ کا آغاز کیا، چنانچہ اس نے امریکہ اور برطانیہ کے علاوہ ہنگری۔ چیکوسلواکیہ۔ ڈنمارک اور جرمن بولی جانے والے بعض دیگر ممالک میں تقاریر کیں۔

۱۹۲۳ء میں یہ پہلی مرتبہ برطانیہ گیا اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں اس نے پھر برطانیہ اور امریکہ کا دورہ کیا برطانیہ میں اس کی تقاریر سے انفرادی نفسیات سے جو دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اس کی بناء پر ایک کمیٹی[2] کی تشکیل کی گئی۔ امریکہ میں اس نے ہارورڈ اور کولمبیا یونیورسٹیوں میں تقریروں کے علاوہ نیویارک میں بھی تقاریر کیں۔ اس کی تقریریں بے حد کامیاب رہیں چنانچہ ۱۹۲۷ء میں واپسی کے بعد اگلے سال اسے پھر مدعو کیا گیا ۱۹۲۹ء میں کولمبیا یونیورسٹی نے اسے اپنا .. Visiting Professor بنا لیا۔ اگلے سال اس نے یونیورسٹی کے میڈیکل سنٹر میں اپنا ایک شفاخانہ قائم کر لیا۔ امریکہ میں ایڈلر کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے تقاریر کے کئی سلسلے شروع کر رکھے تھے جن میں ہمیشہ کثیر تعداد میں سامعین آتے مگر اس کی مقبولیت ہی اس کی مخالفت کا باعث بھی بنی اور پھر کئی طرح کے اختلافات اور غلط فہمیوں کا باعث تو اس کے اپنے نظریات ہی تھے چنانچہ فرائیڈ کے حامی ہمیشہ اس کے مخالفوں میں رہے۔ اور پھر ایسے ہی حالات کی بناء پر ۱۹۳۲ء میں اس نے استعفیٰ دے دیا مگر اسی سال لانگ آئی لینڈ کالج آف میڈیسن نے طبی نفسیات کے شعبہ کا اجراء کر کے اسے اس کی سربراہی سونپی — واضح رہے کہ اس سے پہلے اور کسی طبی کالج نے طبی نفسیات کے شعبہ کا آغاز نہ کیا تھا یہاں اسے بڑی سہولتیں تھیں چھ ماہ تک یہ بالکل فارغ ہوتا چنانچہ یہ وقت یورپی ممالک کے دوروں اور تقاریر میں صرف کیا جاتا۔

۱۹۳۵ء میں برٹش میڈیکل ایسوسی ایشن نے اسے لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا۔ جہاں آٹھ سو ڈاکٹروں اور بے شمار مہمانوں کے سامنے اس نے اپنی بہترین تقاریر میں سے ایک تقریر کی۔

۲۴ مئی ۱۹۳۷ء کو یہ پھر اپنے پروگرام کے مطابق دوبارہ انگلینڈ میں آیا جہاں سکاٹ لینڈ کی ابرڈین (ABER DEAN) یونیورسٹی میں اس نے تقاریر کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ ایڈلر پہلے کی طرح چاک و چوبند تھا۔ ——————

---

[1] اب وی آنا میں ۱۹۴۵ء کے بعد سے بچوں کے لیے ۵ شفاخانے کام کر رہے ہیں۔ یہ انفرادی نفسیات کے اصولوں پر چلائے جاتے ہیں اور تعلیم بالغاں کے مراکز کے ساتھ وابستہ ہیں۔

[2] ہالینڈ نے اس کی تعلیمات سے سب سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا چنانچہ ہیگ ایمسٹرڈم وغیرہ میں اس کے نظریات کے فروغ کے لیے کئی انجمنوں کی تشکیل کی گئی۔

— — — — — — — — ایڈلر کی صحت تمام عمر ہی قابلِ رشک حد تک اچھی رہی تھی۔ صرف ۱۹۳۴ء میں اس کی گردن پر راج پھوڑا۔۔۔۔ (CARBUNCLE) نکلا جو آپریشن کے بعد ٹھیک ہوگیا اور اس کے بعد وہ پہلے کی طرح سے تھا۔

۲۸ مئی کی رات یہ اپنے دوست مسٹر بوتھم کی معیت میں الیما گیا، واپسی پر مسٹر بوتھم کے لیے کچھ خطوط لکھے، اگلے دن وہ حسبِ عادت علی الصبح سیر کے لیے باہر نکل گیا۔ ایک نوجوان لڑکی کام پر جا رہی تھی وہ اسے دیکھ کر دل میں سوچ رہی تھی کہ یہ بوڑھا انسان کسی نوجوان کھلاڑی کی طرح چست اور چاک و چوبند ہے اتنے میں وہ گرا — اور پھر نہ اُٹھ سکا۔

ایک طالب علم نے اسے پہچان لیا اور جب فرسٹ ایڈ دینے کے لیے وہ اس کی قمیض کے کالر کھول رہا تھا تو ایڈلر کے منہ سے اپنے بیٹے "کرٹ" کا نام نکلا اس کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔ پوسٹ مارٹم پر اس کی موت کا باعث ہارٹ فیل کو ٹھہرایا گیا۔ اس کی موت بغیر کسی تکلیف اور اذیت کے واقع ہوئی تھی اس لیے چہرہ سے عجیب سکون کا اظہار ہوتا تھا، ورنہ یہ شخص کئی سال کم نظر آتا تھا، اس نے ایک مرتبہ موت کے بارے میں جس خیال کا اظہار کیا تھا اس کی زندگی اور موت اس کی واضح طور سے عکاسی ہیں:

"موت واقعی انسانیت کے لیے ایک نعمتِ عظمیٰ سے کم نہیں کیونکہ اس کے بغیر ارتقاء اور ترقی کا تصور محال ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہنے والے لوگ نئی نسل کے راستہ کا پتھر ہی نہیں بنتے بلکہ وہ اپنے لیے بھی تخلیقی محرک سے محروم رہتے"

نظریات

انفرادی نفسیات - ایک تعارف

۱۹۱۱ء میں فرائیڈ اور ایڈلر کے نظریاتی اختلافات نمایاں ترین صورت اختیار کر چکے تھے اور تحلیلِ نفسی کی انجمن کے بعض اجلاس صرف ان کے نظریات کے تنقیدی جائزہ تک محدود رہے، اس لیے ایک جلسہ میں فرائیڈ نے ایڈلر پر تنقید کا آغاز اس تقریر سے کیا۔

"سب سے پہلے تو ایڈلر کے نظریات کو ان کی تجریدی نوعیت کی بناء پر سمجھنا مشکل ہے۔" اس کے بعد اس نے تفصیل سے اس کے نظریات کا جائزہ لینے کے بعد یوں اظہارِ خیال کیا:

"۔۔۔۔ مگر میں ایڈلر کے ان نظریات کو غیر اہم نہیں سمجھتا اور ان کے بارے میں میری یہ پیشین گوئی ہے کہ ان کے اثرات بہت گہرے ثابت ہوں گے، جن سے پہلے پہل تحلیلِ نفسی کو بہت زیادہ نقصان پہنچے گا۔ ان نظریات کی اثر انگیزی کی دو وجوہات ہیں۔

(۱) یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ ان نظریات کے پیچھے حق قدم کا رکن کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ قابلِ قدر ذہانت بھی کارفرما ہے۔

(۲) تمام نظریات بانیانہ ہونے کے ساتھ ساتھ باعتبارِ نوعیت، رجعت قہقری پر مبنی ہیں اور اس لیے کالی سے زیادہ حظ بخش ہیں [1]

فرائیڈ نے ایڈلر کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں ایک حد تک صداقت ہے۔ اس کی تنقید کی چھان پھٹک کا یہاں کوئی موقع نہیں ان کے پیش کرنے کا صرف یہی مقصد ہے کہ ایک مخالف کی رائے زیادہ وقعت رکھتی ہے۔

ایڈلر نے عمومی لحاظ سے نفسیات کی دو اقسام قرار دی ہیں۔ نفسیاتِ تصرف اور نفسیاتِ مصرف — اوّل الذکر کے حامیوں کے نزدیک فرد پیدائش کے وقت بعض جبلتیں اور رجحانات ساتھ لے کر آتا ہے — یہ اس کے تصرف میں ہیں اور اس کی تمام زندگی اور شخصیت کا ارتقاء ان ہی سے عبارت ہوتا ہے، جبکہ موخر الذکر کے نزدیک فرد کے تصرف میں جبلتیں اور رجحانات اس بنا پر ثانوی حیثیت رکھتے ہیں کہ بنیادی اہمیت ان کے مصرف میں مضمر ہے۔

نفسیاتِ تصرف کے حامیوں (فرائیڈ کی نفسیات) کی حالت ایسی ہے کہ بطورِ مثال اگر فرد کے پاس ایک تلوار ہے تو وہ اس تلوار اور اس کی ساخت تک خود کو محدود رکھیں گے جبکہ نفسیاتِ مصرف (ایڈلر کی نفسیات) کے پیروؤں کے نزدیک اولیں اہمیت اس امر میں مضمر ہے کہ تلوار کو کسی مصرف میں لایا جاتا ہے وہ اسے سماجی بہبود کے لیے استعمال کرتا ہے کہ اس سے سماج دشمن کا کام لیتا ہے اس لیے ایڈلر کی انفرادی نفسیات اساسی لحاظ سے سماجی اور معاشرتی نفسیات ہے اور اسی لیے تو وہ اپنے نظریات کی علم اور طب کے میدانوں میں عملی کامیابی کا مظاہرہ کر سکا انفرادی نفسیات کا مفہوم بھی یہی ہے۔ ایڈلر کے نزدیک انسانی شخصیت ایک کل ہے، ہر انسان جداگانہ انفرادیت کا حامل ہے وہ ایک معاشرہ میں رہتا ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس باہمی اثر اندازی کے نتائج کے مطالعہ کے علم کا نام ہی انفرادی نفسیات ہے اور بقول گارڈنر مرفی GARDNER MURPHY ایڈلر کی نفسیات کے نظامِ فکر کو تاریخِ نفسیات میں سب سے پہلا ایسا نظامِ فکر قرار دیا جا سکتا ہے جس کا رجحان سماجی علم کی طرف ہے۔"

بقول ایڈلر:

"انفرادی نفسیات ارتقاء کا ساتھ دیتے ہوئے اسی کی روشنی میں تکمیلِ ذات کے جذبہ کو تمام انسانی مساعی کا باعث ٹھہراتی ہے، جو ہش حیات کا — جسمانی اور نفسیاتی لحاظ سے — اسی مساعی پر انحصار ہے۔"

جہاں تک اس کے نظریات کا انحصار ہے تو ژنگ کی طرح اس کی تحریروں میں بھی نظم و ضبط نہیں۔ اس لیے جہاں عام پڑھنے والوں کے لیے اس کی کتابوں سے زیادہ استفادہ حاصل کرنا قدرے مشکل ہے اسی طرح اس کے نظریات کو فرائیڈ کے نظریات کی طرح ایک مربوط سلسلہ میں پیش کرنا بھی سہل نہیں۔

ایڈلر نے ایک جگہ لکھا تھا کہ تمام مسائلِ زیست کو تین ذیلی عنوانات معاشرہ، روزی اور محبت — کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس نے تمام مسائل کو تین جہتوں میں — گروہ بندی، غذا اور جنس — میں تقسیم کر دیا۔ ویسے تینوں قسم کے یہ مسائل عموماً علیحدہ اور جداگانہ نوعیت کے نہیں ہوسکتے بلکہ ایک دوسرے میں گڈمڈ ملتے ہیں۔ اصولی طور سے تو اس کے نظریات پر ان تین عنوانات کے تحت ہی روشنی ڈالنی چاہیئے تھی لیکن اس سے افراط و تفریط کا اندیشہ تھا اس لیے اس کے اہم ترین نظریات سے اجمالی تعارف کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

---

[1] یہ جسمانی صحت اور بیماری کو چنداں اہمیت نہ دیتا تھا۔ اس کے بقول:
"جسمانی بیماری اور صحت تو فطری عوامل کی بناء پر ہیں۔ ہاں: اگر بدن مریض روح ہے تو جوانت روحانی صحت کی غماز ہے۔"

۱- شخصیت کی تشکیل

نفسیات کا یہ اہم ترین مسئلہ ہے کہ شخصیت کی تشکیل میں نسلی وراثت زیادہ اہم کردار ادا کرتی ہے کہ ماحول! اس بارے میں مباحث نے مستقل صورت اختیار کر کے دو متضاد ہائے فکر کی ترویج کی ہے۔ ماحول پر زور دینے والے کرداریت کے حامی کہلاتے ہیں جبکہ نسلی وراثت پر زور دینے والوں نے عضویاتی نفسیات کو جنم دیا۔ ایڈلر نے ان دونوں عناصر کو ان کی جائز اہمیت تو دی مگر کسی ایک عنصر پر دوسرے کو ناجائز طور سے ترجیح نہ دی، اس سے اس کی سوچ میں بڑا توازن پیدا ہوا۔

عضوی کمتری

ایڈلر نے نسلی وراثت کو ان مختلف قسم کی اینٹوں سے تشبیہ دی ہے جن سے شخصیت اپنے انداز زیست کی تعمیر کرتی ہے۔

ایڈلر کے نزدیک جسم محض عضیات کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ یہ اعضاء کا ایک مسلسل اور مربوط سلسلہ بھی ہے یہ اعضاء ایک دوسرے کے ساتھ اس لئے متعلق ہیں کہ اس سے عضویت یعنی جسم کی تمام ضروریات کی تکمیل ہو سکے کیونکہ یہ ترتیب و تنظیم کسی ایک مقصد کی خاطر ہے اس لئے ان کی ساخت اور ترتیب بھی اس مقصد کی مناسبت سے ہے۔ معدہ - دماغ - جنسی اعضاء اور اعصاب۔ ان سب کا ایک مخصوص نظام کار ہے۔ یہ سب اپنی اپنی جگہ خود مختار اور خود کار ہیں مگر مجموعی لحاظ سے یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں اور ایک کا انحصار دوسرے پر بھی ہے ان سب کی ہم آہنگی اور باہمی ربط ہی سازینۂ حیات کے جان بخش سروں کا ضامن ہے۔

ان تمام اعضاء کی باہمی کارکردگی عضویت کی صحت اور بہبود کے لیے ضروری ہے لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ عضویت بعض اعضاء کو باقیوں پر نسبتاً زیادہ ترجیح دیتی ہے بعض لوگوں میں قوت شامہ زیادہ تیز ہوتی ہے جبکہ کسی اور میں قوت لامسہ زیادہ قوی ہو سکتی ہے۔ ایک حس کی دوسری پر ترجیح اور ایک عضو کی دوسروں پر برتری طبی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اسی بنا پر افراد کی شامی، باصری وغیرہ درجہ بندی کی گئی ہے۔

ایڈلر نے بھی اس تقسیم کو خاص اہمیت دی ہے۔ اس کے بقول اس سے تعلیم میں بڑی سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ بچہ جو باصری نوعیت کا ہے اس کے لیے ایسے مضامین جن میں آنکھوں کا زیادہ استعمال ہوتا ہے (مثلاً جغرافیہ) دیگر مضامین کی نسبت زیادہ دلچسپ ہوں گے۔

عضویت کی صحت کا مدار تمام اعضاء اور جسم کے تمام نظاموں کی کارکردگی کسی ایک مقصد کے لیے ہم آہنگی پر ہے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ بعض اعضاء نسلی وراثت کی بنا پر کمزور اور ناقص ملتے ہیں۔ عہدِ طفلی اس لحاظ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ بچے نے ابھی تمام اعضاء کے افعال پر قابو پانا نہیں سیکھا ہوتا اس لیے ذرا سی توجہ اور غور سے عضوی خرابیوں اور جسم کے نظاموں کی ناقص کارکردگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے مثلاً رات کو سوتے میں پیشاب کرنا بچے کے لیے ایک مخصوص عمر تک تو نارمل ہے، لیکن اگر وہ اس کے بعد بھی ایسا ہی کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اس کے نظام بول کی کارکردگی ٹھیک نہیں ہے۔

جسمانی اعضاء کی اس ناقص کارکردگی کو اس نے "عضوی کمتری" کا نام دیا ہے۔ ۱۹۰۷ء میں اس نے پہلی مرتبہ اپنی کتاب Study of Organ inferiority & its psychological compensation میں یہ نظریہ پیش کرتے ہوئے کتاب کے پیش لفظ میں اسے "ایک نیا طریقہ" اور "نیا اصول" قرار دیا تھا۔

عضوی کمتری کا نظریہ ان اعضاء پر صادق آتا ہے، جنکی نشوونما کا دشت یا کلی یا جزوی طور سے ان میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے، ان کی پہچان کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ مخصوص عضو ہی بیماریوں کا تختۂ مشق بنتا ہے وہ اعضاء جو کمزور ہوتے ہیں انہی ماحول کے ردعمل سے بیماریوں کا جلد جلد شکار بنتے رہتے ہیں عضوی کمتری کی اس بناء پر بھی اہمیت ہے کہ جب زندگی کے کٹھن لمحات میں ایک نیوراتی کسی مسئلہ کے حل میں ناکام رہتا ہے تو اس سے وہ ایک جذباتی دھچکہ سا محسوس کرتا ہے۔ یہ دھچکہ اس میں جو ردعمل پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے، اس کے سب سے زیادہ تباہ کن اثرات ان اعضاء کو برداشت کرنا پڑتے ہیں جو پہلے سے کمزور چلے آرہے ہوں اور یوں تمام نیوراتیت کا بوجھ ان اعضاء کو اٹھانا پڑتا ہے۔

عضوی زبان

بچہ کا ابتدائی ماحول اس کے گھر اور افرادِ کنبہ سے تشکیل پاتا ہے ایک طرف بچہ ہے جو اپنے اچھے برے حق کو لیے دنیا میں اپنے لیے ایک راستہ تلاش کرنے اور ایک مقام پیدا کرنے کی دھن میں ہوتا ہے۔ دوسری طرف افرادِ کنبہ ہیں جو ہر وقت اس کے سر پر مسلط رہتے ہیں اسے بات بات پر روکا اور ٹوکا جاتا ہے، اسے ڈانٹا جاتا ہے اور ضرورت پڑے تو اس کے کان بھی کھینچے جاتے ہیں اس صورت حال میں بچہ کے بولنے سے پہلے اعضاء کی "بول چال" شروع ہو جاتی ہے اہوتا یوں ہے کہ بچہ جب ماں باپ کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس کا اظہار ان کمزور اعضاء کے ذریعہ کیا جاتا ہے اور ناخوشگوار صورت حالات میں اسے ان اعضاء میں "پناہ" لینے کی عادت سی پڑ جاتی ہے۔ بچوں میں اعضاء تناسل کو چھیڑنا، ناک میں انگلیاں پھیرنا، آنکھیں جھپکنا، ناخن کاٹنا، انگوٹھا چوسنا، بول و براز کے اخراج میں بے احتیاطی یا سوتے میں پیشاب نکل جانا وغیرہ اسی بناء پر ہیں اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ والدین وقتی طور سے بچہ کی بجائے اس کی ان حرکات میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اس طرح جب وہ والدین کو خوش کرنا چاہتا ہے تو اپنے کمزور اعضاء کی ناقص کارکردگی پر قابو پانے کی سعی کرتے ہوئے اپنی ذات میں ان کی خوشنودی کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔

اس عمل کو ایڈلر نے عضوی زبان کا نام دیا ہے۔ اس کے مظاہر صرف عہد طفلی یا بچپن تک ہی محدود نہیں بلکہ تمام عمر ہی ملتے ہیں۔ مثلاً ایک انسان جرأت اور بہادری کا دعوے دار ہے۔ لیکن ایک موقعہ ایسا آتا ہے جب بہادری کے زبانی دعوے کے باوجود اس کے اعضاء کی کپکپی، دل کی ناہموار دھڑکن اور سانس کی تیزی اس کی اندرونی بزدلی کی غماز بن جاتی ہیں اس طرح شدید تناؤ کے مواقع، مثلاً انٹرویو کی صورت میں لوگ میز پر انگلیوں سے طبلہ بجاتے ہیں، ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر کاٹتے ہیں یا پنسل کو چباتے ہیں، یہ سب عضوی زبان ہے، جو زبان حال سے فرد کی کمزوری کا بھانڈا پھوڑتی ہے۔

عضوی زبان عالمگیر ہونے کے باوجود اپنے اسلوب کے لحاظ سے انفرادی خصائص اور جداگانہ نوعیت کی حامل ہوتی ہے اور یہ اس کی وجہ ہے کہ خوف کے وقت اگر ایک کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں تو دوسرے کی ٹانگیں کانپتی ہیں جبکہ تیسرے کی سانس پھول جاتی ہے ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ عضوی زبان عضوی کمتری کی پیدا کردہ ہے۔ انفرادی حالات، نسلی وراثت اور ماحول کی وجہ سے فرد میں عضوی کمتری بعض انفرادی خصوصیات کی حامل ہوتے ہوئے عضوی زبان کو بھی ان ہی انفرادی خصائص سے روشناس کرا دیتی ہے۔

ایڈلر نے نیوراتیوں کے علاج سے عضوی زبان کی مزید اقسام پر بھی روشنی ڈالی ہے مثلاً معاندانہ رویہ کے اظہار میں بعض اعضاء اپنے حاصل شدہ انجام نہیں دے سکتے درد سے خراش اور حسد کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ بے خوابی حصول اقتدار کی غماز سے

اور بے حد حساسیت تشویش کے باعث ہوتی ہے۔

عام زندگی میں بھی عضوی زبان کی صدہا مثالیں بکھری پڑی ہیں۔ ایڈلر نے عضوی زبان کو صرف بچوں اور نیوراتیوں تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ عام اور صحت مند افراد کی چال ڈھال اور انداز و اطوار سے ان کے بارے میں بہت کچھ جانا جا سکتا ہے ہاتھ ملانے سے ایک انسان کے سماجی خیالات اور ملنساری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، بقول ایڈلر بہت کم مصافحہ نارمل قسم کا ہوتا ہے بعض اپنے جوش میں ہاتھ کو اتنا دبائیں گے کہ دوسرے کی انگلیاں پچک کر رہ جائیں جبکہ اس کے برعکس ایسے بھی ہیں جو دوسرے کے ہاتھ کو ایسے پکڑیں گے جیسے وہ کوئی غلیظ شے ہو۔

سوتے میں جسم کے انداز سے بھی بہت کچھ جانا جا سکتا ہے صحت مند بچہ پشت کے بل پر بازو اوپر کر کے سوتا ہے اگر وہ بازو نیچے کر کے سوئے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ تندرست نہیں پشت کے بل کسی سپاہی کی طرح سے اکڑ کر سونے والے لوگ عام زندگی میں خود کو زیادہ سے زیادہ بڑا بنا کر پیش کرنے کی سعی کرتے ہیں جبکہ اوندھے سونے والے ضدی اور عام زندگی میں منفی رویہ اختیار کرنے والوں میں سے ہوتے ہیں منہ ڈھانپ کر یا گیند سی بن کر سونے والے عموماً بزدل ہوتے ہیں جو نیند میں اس طرح سے کروٹیں بدلتے ہیں کہ صبح کو ان کا سر پائنتی پر آجاتا ہے تو یہ لوگ ہمیشہ دنیا کے خلاف معاندانہ اور جارحانہ رویہ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ کباب سیخ بن کر تمام رات پہلو بدلنے والوں کی اکثریت یہ چاہتی ہے کہ کوئی ہستی (غالباً ماں) ان کی نگہداشت کرتی رہے، بعض اوقات یہ لوگ اپنی عام زندگی سے غیر مطمئن ہونے کی وجہ سے "ہل من مزید" کے متمنی بھی ہوتے ہیں — اس کے برعکس اپنے آپ سے مطمئن یا کولہو کے بیل ایسی زندگی بسر کرنے والے بعض اوقات تمام رات میں ایک کروٹ بھی نہیں بدلتے۔

ایڈلر کے پاس جب کسی مریض کو لایا جاتا تو وہ اس کے کمرہ میں داخل ہونے اور کرسی پر بیٹھنے کے طریقہ اور انداز گویائی سے ہی بہت کچھ اندازہ لگا لیا کرتا تھا۔

احساسِ کمتری

ایڈلر سے پہلے ژنے نے نیوراتیت کی تشکیل میں احساس کمتری کی اہمیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا اور خود ایڈلر نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے لیکن یہ ایڈلر ہی تھا جس نے سب سے پہلے اسے ایک باضابطہ نظریہ کی حیثیت دیتے ہوئے اس کی جزئیات کا محاکمہ کیا۔ اس نے عام زندگی سے اس کی مثالیں لیں اور اپنے تجربات کو نیوراتیوں پر آزما کر اس نظریہ کی صداقت کے ثبوت بہم پہنچائے۔

بقول ایڈلر:

"انسان ہونے کا مطلب ہی خود کو کمتر محسوس کرنا ہے"

اس سے پہلے اس کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ کیسے بچہ کو کمزور اعضاء کا سہارا لینے کی عادت سی پڑ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ عضوی خامیوں کی صورت میں بچہ کو اس بنا پر ہر وقت ان کا احساس رہتا ہے کہ وہ دوسروں سے اپنا موازنہ بھی کرتا رہتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بچہ کی نفسی نشوونما ایک ماحول میں ہوتی ہے جہاں اس کے والدین، بھائی بہن، رشتہ دار اور پھر باہر کے لوگ سبھی اس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ دلچسپی کا اظہار کرتے رہتے ہیں

وہ بچے جن کے بعض اعضاء مکمل نشوونما نہیں حاصل کر پاتے، یا غدودوں کی کارکردگی میں تعطل کی وجہ سے ان میں بعض نقائص پیدا ہو جاتے ہیں تو ایسے بچوں میں عدم تحفظ کا احساس بے دار ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو ان ہتواروں کی ایک ایسی نیا محسوس کرتے ہیں جو موجوں کے تھپیڑوں کے رحم و کرم پر ہو۔ عضوی کمتری کا یہ احساس بھی احساس کمتری کی بنیاد ہے۔ کند ذہن، نکمے، پھوہڑ، بدتمیز اور جسمانی طور پر کمزور مبتلا بچے سب اس احساس کے بار تلے دبے ہوتے ہیں اور ان سب میں کوئی نہ کوئی عضوی خامی ضرور موجود ہوتی ہے۔

اس احساس کمتری کی وجہ سے بچہ کئی قسم کے ردِ عمل سے دوچار ہوتا ہے بعض بچوں میں خوف۔ شرمیلا پن، ضرورت سے زیادہ تابعداری اور دوسروں پر ضرورت سے زیادہ انحصار رکھنا، خواب بیداری اور خانتریاں وغیرہ اس کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اس صورت میں بچہ گویا اس احساس کے نیچے دب کر رہ جاتا ہے بعض اوقات حسد، نفرت، عداوت اور غصہ وغیرہ بھی اس کی بناء پر فطرت ثانیہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

احساس کمتری داخلی ہے۔ گو اعضاء اور ان کی خرابیاں خارجی اور حقیقی ہوتی ہیں لیکن بچہ انہیں کتنی اہمیت دیتا ہے۔ اور اس کا ردِ عمل شدت کے کن مدارج پر ہے یہ سراسر داخلی مسئلہ ہے کیونکہ اسی عمر میں بچہ کے لیے "حقیقت" کا تصور صرف اس کے ناپختہ ذہن اور خام تصورات سے عبارت ہوتا ہے۔ بچہ یا بالغ — دونوں ہی کے لیے حقیقت مطلق کا تصور یا اس کی ماہیت کو سمجھنا آسان نہیں۔ فرد کے لیے تو صرف وہ حقیقت ہے جو اس کے اپنے تصورات سے مماثلت رکھتی ہے۔ ہر انسان نے اپنے لیے معانی و مفاہیم کا ایک کنواں بنا رکھا ہے جس میں وہ ایک مینڈک بنا رہتا ہے وہ ہر چیز اور واقعہ کی تعبیر و تشریح ان معانی و مفاہیم کی روشنی میں کرتا ہے اور یوں وہ بعض اوقات تمام عمر غلط تصورات کو سینے سے لگائے گزار دیتا ہے۔

احساس کمتری کے ضمن میں ردِ عمل میں تنوع کی بوقلمونیاں ملتی ہیں لیکن دراصل یہ تمام ایک ہی عنصر پر استوار ہیں اور وہ احساس ہے — تکمیل ذات!

عضوی کمتری کی بناء پر بچہ میں عدم تکمیل اور اپنے نامکمل ہونے کا جو احساس سا ابھار کر احساس کمتری کو جنم دینے کا باعث بنتا ہے اس کی بدولت اس میں ایک خلا کا سا احساس بھی پیدا ہو جاتا ہے، اسے ختم کرنے کے لیے یا اس کی تسکین کے لیے بچہ اپنے لیے ایک مقصد کی تشکیل کرتا ہے۔ اس مقصد کے تحت وہ تکمیلِ ذات کے لیے اپنے آپ میں ان خصائص و اوصاف کو پیدا کرنے کے لیے سعی کناں ہو جاتا ہے، ان خصوصیات کی وجہ سے جسمانی خامیوں کی کمی یوں پوری ہوتی ہے کہ اب دوسروں کی نظر میں اس کا وقار بڑھ جاتا ہے۔

بقول ایڈلر:

"ہم کسی مقصد کے بغیر فکر، محسوسات، قوتِ ارادی اور عمل کے جذبہ پر قادر نہیں اگر نفسی وقوعہ سے کسی فرد کو سمجھا جا سکتا ہے تو وہ صرف اس صورت میں ہے کہ اس کا کسی مقصد کی تیاری کے ضمن میں مطالعہ کیا جائے۔"

اور یہ مقصد ہے حصولِ برتری!

مشاہیر عالم اور نامور شخصیات کی زندگیوں کے مطالعہ سے اس نظریہ کی توثیق ہوتی ہے کہ کسی طرح ان لوگوں نے عضوی کمتری کی بناء پر پیدا شدہ احساس کمتری سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ان کمزور اعضاء ہی کو اپنا قوی ترین سہارا بنایا۔ کلاسیکل مثال دیموستھینس (DEMOSTHENES) کی ہے جو ہکلے پن کے باوجود یونان کا عظیم ترین مقرر تھا، یہ ساحل پر کھڑا ہو کر اپنے منہ کو سنگریزوں سے بھر لیتا اور موجوں کے شور میں بلند آواز سے تقریر کی مشق کرتا۔ انقلاب فرانس کا شعلہ نوا مقرر میرابو (MIRABEAU) بھی بچپن میں اچھی طرح سے نہ بول سکتا تھا۔ یہی حال ڈیزرائیلی کا تھا۔ دنیا کے عظیم ترین موسیقار بیتھوون (BEETHOVEN) اور موزارٹ (MOZART) کے کان خراب تھے بلکہ بیتھوون تو بعد میں بہرا ہو گیا تھا۔ بہرہ ہونے کے بعد اس نے جن نغمات کی تخلیق کی وہی عظیم ترین سمجھے جاتے ہیں۔

بعض اوقات احساس کمتری کی بناء پر فرد میں ایک عجیب قسم کا تلون اور

میابیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں یہ احساس ایک آسیب بن کر فرد پر مسلط رہتا ہے۔ وہ خود کو عدم تکمیل اور عدم تحفظ کے احساس سے چھٹکارا دلانے کے لیے مسلسل نئی نئی فتوحات کرتا رہتا ہے بائرن کی مثال بڑی دلچسپ ہے اس کے پاؤں میں خرابی کی بناء پر چال میں خرابی تھی، وہ نہ صرف اچھا تیراک ہی تھا بلکہ شاعر کی حیثیت سے وہ لازوال شہرت کا مالک تھا مگر ان سب پر مستزاد اس کی جنسی زندگی تھی اور اس معاملہ میں وہ کاسانوا سے کسی صورت سے بھی کم نہ تھا۔ اس نے لاتعداد حسینوں سے جھوٹا اظہار محبت کیا۔ کتنی عصمتوں سے کھیلا اور کتنے دل توڑے۔ یہ شاید خود اسے بھی نہ یاد ہو۔ اس کا دعویٰ تھا کہ شاہی خاندان کو چھوڑ کر باقی ہر بڑے خاندان کی رگوں میں میرا خون دوڑتا ہے۔

ایڈلر نے لکھا تھا:

"بنی نوع انسان مستقل طور سے احساس کمتری تلے دبے رہتے ہیں جو انہیں زیادہ سے زیادہ تحفظ کے حصول کے لیے ہمیشہ مہمیز لگاتا رہتا ہے۔"

اسی وجہ سے ہر انسان برتری اور اقتدار کے لیے کوشاں ہوتا ہے ایڈلر نے اسی لیے مقصد حیات پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ اس کے خیال میں برتری کی تمنا پیدائشی اور طبعی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر انسان خواہ وہ عضوی کمتری کا شکار ہو یا نہ ہو وہ خود کو نامکمل اور غیر محفوظ قرار سمجھتا ہے جس کے نتیجہ میں حصول برتری کی تمنا بیدار ہوتی ہے اس لیے یہ بھی ایک لحاظ سے فرد کے ساتھ ہی جنم لیتی ہے۔

بچہ میں عضوی کمتری اور عدم تحفظ کا احساس جتنا زیادہ شدید اور قوی ہوگا اس کی برتری کی تمنا بھی اس شدت کی حامل ہوگی اور نتیجہ میں اس کا مقصد حیات بھی اتنا ہی وسیع ہوگا۔ عدم تکمیل کے احساس سے اس کی شخصیت میں جتنا بڑا خلاء پیدا ہوگا اس کو پُر کرنے کے لیے اسے اتنے ہی زیادہ جدوجہد کی ضرورت ہوگی۔

فرد کی طبیعت، فطرت کی تشکیل اور رجحانات وغیرہ سب اس کے مقصد حیات کے تابع ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس اسلحہ سے تو اس نے جہد زیست میں اپنے لیے ایک مقام حاصل کرنا ہوتا ہے اس لیے۔ ہر فرد کے مقاصد جداگانہ اور انفرادی نوعیت کے ہوتے ہیں برتری کی یہ خواہش اور مقصد حیات کے لیے انسانی سعی کو اگر اس کے وسیع مفہوم میں لیں تو یہ نطشے کے نظریہ اقتدار سے جا ملتی ہے۔ برتری کی یہ خواہش، گو نیوراتیت کی صورت میں تخریبی رنگ بھی اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن بااعتبار نوعیت یہ تخریبی نہیں بلکہ انسانی شخصیت کے لیے ایک مرکزی نقطہ کی حیثیت رکھتی ہے یہ اس کے لیے شعاع امید بن جاتی ہے جس کی خاطر وہ زیست کی اندھیری راہوں پر ٹھوکریں کھانے سے بچ جاتا ہے۔

ماحول

اب تک احساس کمتری کے بواعث میں سے صرف عضوی کمتری کا جائزہ لیا گیا جو پیدائشی ہے اور نسلی وراثت کی مرہون منت ہے۔ مگر احساس کمتری کی تشکیل صرف جسم تک محدود نہیں بلکہ اس میں ماحول بھی برابر کا کردار ادا کرتا ہے۔

ماحول کے اثرات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(ا) عقاید و نظریات

بعض اوقات عام نظریات و مروجہ عقاید کی وجہ سے بعض ایسی چیزوں کو بھی جسمانی خامی تصور کر لیا جاتا ہے جو طبی نقطۂ نگاہ سے بالکل ٹھیک ہوتی ہیں مثلاً بالوں کا رنگ اور ان کی لمبائی قد۔ چال۔ آواز۔ جلد پر بعض دھبے یا نشانات وغیرہ، سب اس ذیل میں آسکتے ہیں گو یہ سب جسمانی چیزیں ہیں، لیکن ان کی وجہ سے احساس کمتری محض اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ ماحول میں انہیں اچھا نہیں سمجھا جاتا جن بچوں کے بال سیاہ نہیں ہوتے۔ ان کے ساتھی ان کا مذاق اڑاتے ہیں اس طرح حبشیوں کی مانند چھوٹے چھوٹے اور بہت زیادہ گھنگھرالے بالوں والے بھی ان کی وجہ سے احساس کمتری میں مبتلا رہتے ہیں

(ب) کنبہ

لیکن بچہ کے لیے اصل ماحول اس کا کنبہ ہی مضمر ہے۔ سکول اور دیگر معاشرتی ادارے بعد میں آتے ہیں۔

انفرادی نفسیات میں کنبہ کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ ایڈلر نے باپ کو سورج ماں کو چاند اور بچوں کو ستاروں کے جھرمٹ سے تشبیہ دی ہے۔ کنبہ کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ فرد معاشرہ کی اکائی ہے اور کیونکہ اس کی شخصیت کی تشکیل اور اس کے خدوخال کا تعین کنبہ ہی میں ہوتا ہے اس لیے بالواسطہ طور سے کنبہ اچھے اور برے معاشرہ کی تشکیل میں ممد ثابت ہوتا ہے۔

والدین عموماً بچوں سے یکساں سلوک اور محبت کرتے ہیں لیکن پھر بھی کنبہ میں بچوں کی پیدائش کی ترتیب نفسیاتی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔

سب سے پہلا بچہ ایک شہنشاہ کی طرح ہوتا ہے ہر لحاظ سے اس کی خاطر داری اور دل جوئی کی جاتی ہے۔ اسے بہلانے کو تمام گھر حاضر رہتا ہے لیکن دوسرے بچہ کی پیدائش کی وجہ سے یہ سارا ٹھاٹھ باٹھ پڑا رہ جاتا ہے اور جب باقی لوگ نووارد کو گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں تو وہ خود کو ایک معزول حکمران ایسا دکھی محسوس کرتا ہے جس کے نتیجہ میں عموماً بچے ماں کی بجائے باپ کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ والدہ تو ننھے بچے کی دیکھ بھال میں لگی رہتی ہے اس لیے بچہ جہاں دوسرے بچے کو غاصب سمجھتا ہے وہاں وہ اپنی ماں کو بھی مجرم سمجھتا ہے۔ باپ کے ساتھ وابستگی میں جہاں ماں سے بدلہ لینے (تم نہیں اور سہی) کا احساس کارفرما ہوتا ہے۔ وہاں باپ کیونکہ کنبہ کا سربراہ ہوتا ہے اس لیے وہ اختیار اور خود مختاری کا نشان بھی ہوتا ہے اور یوں بچہ گویا ان ہی اوصاف کو اپنے لیے چن لیتا ہے۔ باپ کی بے وقت موت کی صورت میں پہلا بچہ عموماً ان تمام فرائض کو بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیتا ہے جو ایک باپ سے منسوب ہوتے ہیں اسی لیے بعض اوقات یہ جذبہ زیادہ شدید صورت اختیار کر کے اختیار اور خود مختاری کے حصول کی خاطر باپ کو بھی راستہ کا روڑا سمجھتے ہوئے اس کے خلاف اگر کھل کر بغاوت نہیں کرتا تو کم از کم اپنے خوابوں اور خاموش آرزوؤں میں اسے مردہ حالت میں ضرور دیکھتا ہے۔ عام زندگی میں ایسے لوگ اس لحاظ سے قدامت پسند ہی رہتے ہیں کہ یہ اقتدار و اختیار صرف ان ہاتھوں میں دیکھنے کے خواہاں ہوتے ہیں جو ان کے اہل ہوں (یعنی خود)

دوسرے نمبر پر پیدا ہونے والا بچہ پہلے کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ وہ کبھی "شہنشاہ" نہ تھا۔ اس لیے وہ کبھی "معزول" بھی نہیں ہوتا اور یوں اسے ماضی سے نہیں بلکہ مستقبل سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اس کا مقصد کیونکہ اپنے بڑے بھائی سے آگے بڑھنا ہوتا ہے اس لیے وہ ترقی، ارتقاء اور انقلاب کا داعی ہوتا ہے۔ اس کے لیے زندگی دوڑ کے مترادف ہے۔ پہلے کے برعکس وہ حقوق و مراعات کا اس لیے قائل نہیں کہ وہ بڑھے پر تنگ نظری کو فرسودہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھ کر خود ہی مینا اٹھا لینے کا قائل ہے اگر پہلا قنوطی ہوتا ہے تو دوسرا رجائی!

سب سے آخر میں پیدا ہونے والے بچہ کا نفسیاتی مطالعہ اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ وہ سب سے چھوٹا ہے اور برتری کی قطار میں سب سے پیچھے کھڑا ہے اس لیے وہ اپنے سے بڑے تمام بھائی بہنوں پر چھا جانا چاہتا ہے اس کی تسکین چھوٹی موٹی چیزوں سے نہیں ہوتی بلکہ وہ بلند سے بلند تر ہونے کی تمنا کرتا ہے۔

اکلوتا بچہ اس لیے اہم ہے کہ اسے کنبہ میں اور بھائی بہنوں سے کسی طرح کا مقابلہ نہیں کرنا ہوتا اسے اپنے ہم عمر بھائی بہنوں کی سوسائٹی نہیں ملتی بلکہ وہ بالغوں میں رہ کر

قبل از وقت ۔ بالغوں ایسی حرکات شروع کر دیتا ہے ادھر گھر میں کیونکہ اس پر ضرورت سے زیادہ توجہ صرف کی جاتی ہے اس لیے بیرونِ کنبہ کی دنیا اسے تکلیف دہ نظر آتی ہے جس آرام، سکون اور حکومت کا گھر میں عادی ہوتا ہے وہ جب اسے باہر نہیں ملتے تو وہ گھبرا جاتا ہے بعض اوقات پہلے بچہ کی مانند وہ بھی باپ کو ایک حریف سمجھتے ہوئے اسے راستہ سے ہٹا دینا چاہتا ہے۔ شادی کے بعد بعض اوقات ایسے لوگ محض اس وجہ سے بچوں کو ناپسند کرتے ہیں کہ صرف وہی رفیقِ حیات کی توجہ کا مرکز بنے رہیں۔

سب سے آخر میں وہ بچے آتے ہیں جن سے یا تو کنبہ میں بے توجہی اور لاپرواہی برتی جاتی ہے یا پھر ایسے لاوارث اور ناجائز بچے جو محبت، توجہ اور شفقت سے محروم رہتے ہیں، اسی طرح مطلقہ والدین اور سوتیلے والدین کے بچے بھی اسی ذیل میں آسکتے ہیں ایسے بچوں کو عموماً اپنے کم مایہ اور بے مصرف ہونے کا احساس بچھو کے ڈنک کی طرح سے چبھتا رہتا ہے اس لیے بعض اوقات ایسے بچے "عیش زنی" کو ہی سب سے بڑا شعار بنا لیتے ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ انہیں کوئی نہیں چاہتا اور جب تک وہ ہاتھ پاؤں نہ ہلائیں گے اس وقت تک انہیں دنیا سے کچھ نہ ملے گا۔ اور یوں مقصد برآری کے لیے یہ لوگ سازشی، خود غرض، بے رحم اور اخلاقی اقدار کو روندنے والے بن جاتے ہیں، ان کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خود اعتمادی انہیں سب سے بے نیاز کر دیتی ہے اور موقع پرستی اور مطلب برآری کی وجہ سے یہ کبھی بھی اچھے دوست نہیں بن سکتے۔

مندرجہ بالا عام قسم کی صورتیں ہیں اور ان کا صرف عمومی انداز سے ہی جائزہ لیا گیا ہے لیکن بعض اوقات ماں باپ کے ترجیحی طرزِ عمل کی وجہ سے پیدائش کی ترتیب کے باوجود بچوں کی عادات و خصائل جداگانہ طرز اختیار کر لیتے ہیں اس طرح لڑکیوں کی پیدائش سے صورتِ حالات اور بھی الجھ جاتی ہے خصوصاً پہلے بچے کے بعد لڑکی کی پیدائش کی صورت میں تو لڑکے پر بہت شدید اور منفی نوعیت کا ردِ عمل ہوتا ہے اور ایک بہن کی وجہ سے بڑا بھائی بھدا، نکما اور غبی بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بھائی جب چھوٹی بہن کے خلاف اظہارِ ناپسندیدگی کرتا ہے جس سے لڑکی میں جذبۂ مقاومت پوری شدت سے بیدار ہو کر اس کے انداز میں جارحیت پیدا کر دیتا ہے ادھر لڑکی لڑکے کی نسبت بہت جلدی بڑھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چودہ پندرہ سال کی لڑکی جسمانی اور ذہنی لحاظ سے لڑکے کے مقابلہ میں مکمل طور سے نشوونما پا جاتی ہے، اس سے لڑکے میں ہزیمت اور شکست خوردگی کا جو احساس بیدار ہوتا ہے اس کے ہاتھوں وہ لڑکی سے خوف زدہ سا ہو جاتا ہے جس کا اظہار ایک سستی، نکمے، کند ذہن اور اعصابیت کے شکار لڑکے کی صورت میں ہوتا ہے یہی رجحان زیادہ شدید حالتوں میں تمام صنفِ نازک کے خلاف ایک بے پایاں نفرت کی صورت میں ظاہر ہو کر ان کی زندگی تلخ بنا دیتا ہے۔

کچھ یہی حالت اس وقت ہوتی ہے جب پہلی لڑکی کے بعد دوسرا لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کیونکہ لڑکوں کو لڑکیوں پر ناجائز حد تک ترجیح دی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جھوٹی شرم کو صنفِ نازک کے لیے لازمی سمجھا جاتا ہے اس لیے حصولِ برتری کے لیے بہنوں کو بالواسطہ قسم کے طریقے اپنانا پڑتے ہیں۔ اگر ماں کی موت یا طویل بیماری کی وجہ سے گھر کی عنانِ اختیار کسی بہن کے ہاتھ میں آ جاتی ہے تو وہ اچھی خاصی ڈکٹیٹر بن جاتی ہے اور نظم و ضبط کے نام پر سب کو نکیل ڈال دیتی ہے۔

اسی طرح وہ گھرانہ جہاں تمام لڑکیوں میں ایک لڑکا ہو تو سب مل جل کر اسے کھلونا سا بنا لیتی ہیں۔ صنفِ مخالف میں ہر وقت رہنے سے اس میں زنانہ صفات اور نسائی انداز پیدا ہو جانے کا قوی امکان ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو وہ خود کو عورتوں میں جکڑا ہوا محسوس کر کے اور انہیں اپنے سے ایک علیحدہ صنف سمجھتے ہوئے سب سے علیحدگی اختیار کر کے ایک خاموش گوشہ نشین اور خلوت گزیں بچے کی صورت اختیار کر لیتا ہے بعض اوقات وہاں سب سے بغاوت کرتے ہوئے اپنی مردانگی پر زور زیادہ دیتا ہے، تب اس میں ہر معاملہ میں عورتوں کو نیچا دکھانے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ کچھ یہی صورتِ حال اس وقت معرضِ وجود میں آتی ہے جب بہت سے لڑکوں میں ایک لڑکی پیدا ہو جاتی ہے۔

(ج) سماجی حیثیت

ہوش سنبھالنے کی صورت میں بعض دیگر عوامل بھی اثر انداز ہوتے ہیں جن میں سب سے نمایاں سماجی حیثیت ہے۔ غریب والدین کے بچوں کے لیے بعض اوقات ان کی غریبی ہی سے احساسِ کمتری کا سب سے بڑا باعث ثابت ہوتی ہے اور اس احساس کے تحت وہ دنیا میں بہت کچھ کر جاتے ہیں۔ اگر غریب بچہ بے انصافی کا شکار بھی رہا ہو تو اس صورت میں اسے تمام دنیا اور سماج اپنا دشمن نظر آتا ہے اور وہ ان سب کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کر لیتا ہے اس طرح دوسرے بچہ کو اس کی غریبی معاشرہ میں حقوق و مراعات اور سماجی انصاف کے لیے جدوجہد پر اکساتی ہے۔

اس کے ساتھ خاندان یا کنبہ کی کسی ناز یبا بات کی وجہ سے بدنام ہو جانے کی صورت میں بھی بچوں میں احساسِ کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ قتل، قید، دیوانگی، پاگل پن، کسی کا گھر سے بھاگ جانا وغیرہ ایسے واقعات ہیں جو بچوں میں بعض اوقات شدید قسم کے احساسِ کمتری کو جنم دے کر ان کے اندازِ زیست کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل دیتے ہیں۔

۲- بچہ کی نشوونما۔ قطرہ سے گوہر ہونے تک!

گزشتہ صفحات میں ایڈلر کے نسلی وراثت اور ماحول کے بارے میں پیش کئے گئے نظریات کے مطالعہ سے ایک بات تو بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے خیال میں ان دونوں کو یکساں اہمیت حاصل ہے اور وہ ایک پر دوسرے عنصر کو ناجائز ترجیح دینا پسند نہیں کرتا۔

نسلی وراثت اس لحاظ سے اہم ہے کہ فرد تمام عمر بھی اس کے اچھے یا بُرے اثرات سے دامن نہیں جھٹک سکتا۔ ادھر کیونکہ اس نے تمام زندگی ایک ماحول میں بسر کرنی ہے اس لیے اس کی اہمیت بھی کسی لحاظ سے کم نہیں اور پھر اس ماحول کا اثر بھی اضافی ہے یعنی بچہ ماحول کی کس انداز سے تعبیر کرتا ہے اور اس کے اثرات کو کیسے محسوس کرتا ہے۔

ان دونوں یکساں قسم کی قوتوں کے درمیان خود فرد ہے جو کسی طرح بھی ان سے کم نہیں کیونکہ یہ فرد ہی تو ہے، جس نے ان دونوں قوتوں کے اثرات کو محسوس کرنا ہے بقول ایڈلر:

"اپنے جسم اور گرد و پیش کے تجربات سے اخذ کئے گئے نتائج کی تشکیل میں کم و بیش اپنی تخلیقی قوت اور ایک ڈگر تلاش کرنے کی صلاحیت پر بھروسہ کرتا ہے اس کی تعبیرِ زیست جو زندگی میں اس کے طرزِ عمل کی اساس بنتی ہے۔ باعتبار نوعیت الفاظ و تصورات سے ماورا ہوتی ہے یہ تو اس کا اپنا تخلیقی شاہکار ہے۔"

بچہ کی نشوونما کے طریقِ کار کو سمجھنے سے پہلے انفرادی نفسیات کی بعض ایسی اصطلاحات کی وضاحت لازمی ہے جو اساسی نوعیت کی ہیں۔ ان میں سے ذہنی تحریک، نظامِ ادراک، راہنما مفروضہ، اندازِ زیست اور احتجاجِ مردانگی کی تشریح درج ذیل ہے۔

ذہنی تحریک

یہ امر ذہن نشین رہے کہ نسلی وراثت اور ماحول، کردار کے تعین میں فیصلہ کن کردار نہیں ادا کرتے بلکہ کردار کی تشکیل کے لیے خام مواد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دراصل کردار کی تشکیل کا انحصار نفسی بلکہ اس کی سعی پر ہے۔ گزشتہ صفحات میں اس امر کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ بچہ میں احساسِ کمتری کیسے جنم لیتا ہے۔ احساسِ کمتری کے تحت وہ اپنے حالات اور ماحول سے مطابقت کی سعی

کرتے ہوئے اس مقصد کے لیے الگ مقصدِ حیات کی تشکیل کرتا ہے اور یوں ماحول سے تمام مطابقت اس مقصدِ حیات کو پانے کے نقطۂ نظر سے کی جائے گی ماحول سے مطابقت کے انداز کو اصطلاح میں "ذہنی تحریک" کہتے ہیں۔

نظامِ ادراک

ذہنی تحریک کے تحت اب وہ ماحول میں اپنا مقام پیدا کرنے کے جذبہ کو اپناتا ہے، گو ابھی وہ بچہ ہے اور ہر لحاظ سے خام ہے لیکن پھر بھی اس نے اپنے مقصد کو پانے کے لیے ایک طرزِ عمل اپنا لیا ہے۔ وہ بعض کام صحیح کرتا ہے اور بعض غلط۔ صحیح کام اس میدان میں مزید ہمت آزمائی کے لیے حوصلہ بڑھاتے ہیں جبکہ غلط کاموں سے وہ اس قسم کے تجربات سے بد دل سا ہو جاتا ہے۔ اس سے نفس کو چناؤ اور امتیاز کی عادت پڑ جاتی ہے۔ وہ مستقبل میں ناخوشگوار تجربات سے احتراز کرتے ہوئے خوشگوار تجربات کے اعادہ کو تیار رہتا ہے۔ نفس کا یہ رجحان جو میٹھا میٹھا ہپ ہپ، کڑوا کڑوا تھو تھو کے مترادف ہے۔ اصطلاح میں "نظامِ ادراک" کہلاتا ہے۔

راہنما مفروضہ

نظامِ ادراک کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تمام تجربات سے اخذ شدہ اثرات بنیادی لحاظ سے فرد کے مقصدِ حیات کے تابع ہوتے ہیں اس لیے ان کو عموماً اصل حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ فرد ان اثرات کو داخلی رنگ میں رنگ کر اپنے لیے حقیقت و معانی کا ایک فرضی جہان تعمیر کرتا ہے۔ حقیقت کے اس تصور کو ایڈلر نے "راہنما مفروضہ" قرار دیا ہے اسے الجبرا کے لا کے مترادف سمجھا جا سکتا ہے جو اپنے عدم وجود کے باوجود بھی ایک مسئلہ کو حل کرنے میں مدد ثابت ہوتا ہے۔ راہنما مفروضہ عام حالات میں فرد کے لیے بے حد سودمند ثابت ہوتا ہے لیکن صرف ایک حد تک۔ کیونکہ اس کی وجہ سے وہ اصل حقیقت سے دور ہو کر اس ذہنی تصویر کو حقیقت سمجھنے کا خوگر ہو جاتا ہے جو راہنما مفروضہ کی بنا پر معرضِ وجود میں آئی ہے اور یوں اس کی تمام زندگی اور سعی اس کے تابع ہو جاتی ہے نارمل انسانوں کے لیے تو یہ خطرناک نہیں ثابت ہوتی لیکن نیوراتیوں کی حالت تو ریشم کے کیڑے ایسی ہوتی ہے جو ریشم کے تار نکال نکال کر اپنے گرد لپیٹتا جاتا ہے اور ایک دن وہی اس کا مدفن بنتا ہے۔ بقول ایڈلر:

"ایک نارمل یا نیوراتی کی نفسی نشوونما کا خواہ کسی انداز سے بھی کیوں نہ جائزہ لیا جائے وہ ہمیشہ اپنے مخصوص مفروضہ کے دام میں گرفتار نظر آئے گا۔ ایک ایسا مفروضہ جس کے اثر سے آزاد ہو کر نیوراتی حقیقت کی طرف کبھی بھی نہیں رجوع کر سکتا اور یوں وہ ہمیشہ اس میں ہی اعتقاد رکھتا ہے جبکہ ایک نارمل انسان اس مفروضہ کو مقصدِ حیات کے حصول کا ذریعہ بنا کر عروج بہ کامرانی سے ہمکنار ہوتا ہے۔"

"سب سے پہلے تو راہنما مفروضہ وہ تدبیر ہے جس کے ذریعہ بچہ احساسِ کمتری سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے اس کی بدولت اس میں اپنی خامیوں کی تلافی کا احساس بے دار ہو کر تحفظِ ذات کے جذبہ کو جنم دینے کا موجب بنتا ہے۔"

ایک اور موقعہ پر ایڈلر نے راہنما مفروضہ کو "انا کا راہنما معیار" قرار دیا ہے۔

اندازِ زیست

اس کے بعد معاملہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ابھی ارتقاء کے لیے نفس کو مزید مراحل طے کرنا ہیں۔ ان مراحل میں سے اہم ترین "اندازِ زیست" کا تعین ہے۔ سیدھے سادے الفاظ میں حصولِ مقصد کے لیے مستقل ذہنی تحریک کو اندازِ زیست سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

ایڈلر نے ۱۹۲۹ء میں اس نظریہ کو پیش کیا تھا اور گو اس کے بعد اس نے مختلف اوقات میں اس کی مختلف طریقوں سے تشریح کی، لیکن اساسی لحاظ سے اس کا مفہوم وہی رہا — اس نے وقتاً فوقتاً اور مختلف تحریروں میں اسے ذات، انا، فرد کی شخصیت وحدتِ شخصیت، مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے انداز اور زندگی کے متعلق تخمینت کے انداز سے تعبیر کیا ہے۔

ایڈلر ہی کے الفاظ میں "بچپن کے پہلے چار یا پانچ سالوں میں اندازِ زیست کا تعین ہو جاتا ہے اور جب ان کی مکمل نشوونما کے ساتھ ساتھ زندگی کے بارے میں اس کا ایک رویہ متعین ہو جاتا ہے تو یہ دور بھی ختم ہو جاتا ہے۔"

دیگر نفسی رجحانات کی مانند اندازِ زیست بھی مقصدِ حیات کے تابع ہوتا ہے ہر انسان کا مقصدِ حیات اس کے انفرادی حالات، ماحول اور عضوی کمتری کا مرہونِ منت ہوتا ہے اس لیے ہر انسان کا اندازِ زیست خواہ دوسروں کے نزدیک مضحکہ خیز ہی کیوں نہ ہو۔ مگر وہ اس کے لیے ٹھیک رہتا ہے اسی لیے ہر گل را رنگ و بوئے دیگر است کی مانند افراد کے اندازہائے زیست بھی ستاروں کی مانند لاتعداد ہیں۔

ہر انسان اپنے متعلق بعض خوش فہمیوں یا غلط فہمیوں میں مبتلا ہوتا ہے یہ بھی ایک حد تک اندازِ زیست کی پیدا کردہ ہیں، آج تک فلاسفر اور علماء زندگی کی گتھیوں اور مسائل کو اس لیے نہ سلجھا سکے کہ ان سب کے نظریات کسی نہ کسی حد تک ان کے اپنے اندازہائے زیست کے رنگ میں رنگے ہونے کی وجہ سے دوسروں کے لیے اس بنا پر ناقابلِ قبول ہوتے ہیں کہ اس سے ان کے انفرادی اندازِ زیست کو زک پہنچتی ہے۔

احتجاجِ مردانگی

دنیا کے ہر معاشرہ میں — اور ہمارے معاشرہ میں بالخصوص — عورتوں پر مردوں کو فوقیت حاصل ہے برتری اور فوقیت کا یہ احساس بچے پر بلاواسطہ اور بالواسطہ دونوں طریقوں سے اثر انداز ہوتا ہے، گھر میں مردوں کو ترجیح دی جاتی ہے وہ زیادہ آزاد اور خود مختار ہیں، ان کی عزت کی جاتی ہے اور ان کا رعب و دبدبہ بھی ہوتا ہے اس طرح شجاعت سخاوت اور دیگر اوصاف عموماً مردوں سے ہی منسوب کیے جاتے ہیں جبکہ بقول شیکسپیئر عورت کا تو نام ہی کمزوری ہے، بے وفائی، حسد، ضد، کم ظرفی، بزدلی اور اس طرح کی تمام برائیاں عورتوں سے منسوب کی جاتی ہیں۔

بچوں کے لیے گھر میں باپ کی ذات، طاقت اور قوت کی نشان ہوتی ہے کیونکہ سب اس کے احکام کی بجا آوری پر مجبور ہوتے ہیں اس میں لڑکے اور لڑکی کی کوئی تخصیص نہیں دونوں ہی اسے قوت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں اس لیے جب بچہ میں احساسِ کمتری کی بنا پر حصولِ برتری کا جذبہ بے دار ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ بچہ قوت اور طاقت کی اہمیت کو بھی سمجھ لیتا ہے۔ وہ جان جاتا ہے کہ حصولِ مقصد کے لیے قوت اور خود مختاری لازمی ہے اور کیونکہ اسے باپ میں یہ صفات نظر آتی ہیں اس لیے وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ قوت و خود مختاری دراصل مردانگی کی بنا پر ہیں ادھر اس کی کم عمری اسے اس کی بے مائیگی کا شدید احساس کراتی رہتی ہے اس احساس کے تحت وہ ہر معاملہ میں مردانگی کا مظاہرہ کرنے کا متمنی رہتا ہے اسے بچپن میں عدمِ تحفظ کا شدید احساس ہوتا ہے اور اس کے ردِ عمل کے طور پر وہ مردانگی کی اہمیت پر زیادہ زور دیتا ہے اسی کو ایڈلر نے احتجاجِ مردانگی کہا ہے اس کی بدولت بچہ اپنے باپ کو بعض اوقات اپنا حریف سمجھتے ہوئے اس سے تعلیم، پیشہ اور ہر معاملہ میں آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔

لڑکیوں میں اس کے اثرات بہت شدید ہوتے ہیں، بلکہ بقول ایڈلر ہر عورت ہی مرد بننے کی متمنی ہوتی ہے۔ وہ لڑکیاں جو مردانہ کھیلوں میں حصہ لے کر مردوں پر سبقت لے جاتی ہیں اور لڑکوں کے ساتھ لڑکا بن کر رہنا زیادہ پسند کرتی ہیں یہ سب احتجاجِ مردانگی کی وجہ سے ہے۔ وہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ نازک اندام اور صنفِ لطیف ہونے کے باوجود وہ کسی معاملہ میں بھی مردوں سے کم نہیں ہیں

وہ عورتیں جنہیں بازاری اصطلاح میں "مردمار" کہا جاتا ہے وہ بھی اسی رجحان کی پیداوار ہیں۔

ان کے برعکس وہ عورتیں ہیں جو احتجاج مردانگی کے لیے خالص زنانہ اوصاف استعمال کرتی ہیں۔ یہ نسائی خصوصیات — ناز و ادا، عشوہ و غمزہ ادا، رقابت، حسد، تلون مزاجی اور دل لبھانے کے تمام فنون کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتی ہیں۔ اپنی انتہا پسندانہ صورت میں ان کا انداز طوائفانہ سا ہو کر رہ جاتا ہے اور وہ مطلب برآری کے لیے اپنے ان ہی اوصاف سے گویا "دانہ ڈالتی" رہتی ہیں یہ وہ عورتیں ہیں جو اپنے ان ہی کمزور اوصاف کی بناء پر مرد کے دل و دماغ پر حاوی ہو کر اس کی سب سے بڑی کمزوری بن کر اس کی مردانگی کا منہ چڑاتی ہیں۔

ان اصطلاحات کی تشریح سے اجمالی طور سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ بچہ کو اپنے ماحول سے مطابقت کے لیے کون کون سے ذہنی رجحانات کو بروئے کار لانا پڑتا ہے ایک طرف اس کے گرد و پیش میں زندگی کی گہما گہمی ہے تو دوسری طرف اس کا اپنا جسم اور عضوی کمتری ہے اور اس کنبہ و کلیسا کی یکساں مقناطیسی کشش کے درمیان خود فرد ہے جو گویا تنے ہوئے رسّے پر جا رہا ہے۔

جب تک بچہ اور ماحول میں خوشگوار تعلقات قائم رہتے ہیں اس وقت تک تو اس کی ذہنی اور جسمانی نشو و نما صحت مند طریقہ سے ہوتی رہتی ہے لیکن کیا ہر بچہ کا طرز عمل قطعی طور سے ٹھیک ہے؟ کیا تمام بچوں سے ان کے والدین خوش اور مطمئن ہیں؟

بچہ کی اپنے ماحول سے عدم مطابقت ہی تمام سماجی خرابیوں اور جرائم کی جڑ ہے اور ایڈلر کا یہ دعویٰ ہے کہ صرف انفرادی نفسیات کے اصولوں کے ذریعہ سے ان وجوہات و بواعث کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔

ایڈلر نے ماحول سے عدم مطابقت رکھنے والے بچوں کی تین اقسام گنوائی ہیں جن کے اعضاء ناقص ہیں، جن کو بے جا لاڈ پیار سے بگاڑ دیا گیا ہے اور وہ جو سدا پیار سے محروم رہتے۔

(۱) اس صورت میں احساس کمتری، عضوی کمتری کا پیدا کردہ ہوتا ہے یہ احساس ہر وقت اس کے ذہن پر ایک بھوت بن کر مسلط رہتا ہے، وہ نفسی قوت جو ذہن کی ترویج کے لیے استعمال ہوتی تھی اب وہ کسی مصرف کی نہیں رہتی اور یوں وہ ماحول کے خلاف معاندانہ[1] رنگ اختیار کر لیتی ہے اس کا نمایاں ترین ثبوت کانے کی ایک رگ زیادہ والے مقولہ سے عیاں ہے۔ دوسرے لوگ اعضاء کی بدنمائی اور ناقص پن کو نشانۂ تمسخر بنا کر اس کے معاندانہ جذبات میں مزید شدت کا موجب بنتے ہیں اسی لیے تو بدصورت بچے زیادہ بدتمیز ہوتے ہیں — اس کا دوسرا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ ایسے بچے بالکل مرجھا کر رہ جاتے ہیں وہ جب دوسرے صحت مند، خوب صورت اور چالاک و چوبند بچوں کے ساتھ اپنا موازنہ کرتے ہیں تو وہ گویا عضوی کمتری کے بوجھ تلے دب جاتے ہیں اور یوں ایسے بچے خاموش، پھوہڑ، بدسلیقہ اور نالائق ہو جاتے ہیں عضوی کمتری کا پیدا کردہ احساس کمتری ایک گرداب کی صورت اختیار کر کے انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا احساس ہے جو کم و بیش ہر ایک میں ہی پایا جاتا ہے فرق صرف شدت کا ہے، کسی میں کم کسی میں زیادہ۔

(ب) یہ ایسے بچے ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے تمام کنبہ کے سر کا تاج اور والدین کی آنکھوں کا تارا ہوتے ہیں۔ بے جا لاڈ اور پیار کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ خود کو ایک دیوتا کے روپ میں دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں ہر جائز اور ناجائز خواہش کی تکمیل کے باعث یہ بچے اپنے ماحول سے کچھ زیادہ ہی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ بقول ایڈلر کیونکہ ایسے بگاڑے ہوئے بچوں کی کنبہ میں کچھ ایسی حیثیت ہوتی ہے کہ خود کو اپنی صلاحیتوں کا یقین دلائے بغیر ہی یہ دوسروں سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں اس لیے ان کا مقصد ان کے اپنے تجربات کی روشنی میں — صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام کنبہ کی توجہ کا مرکز بنے رہیں (اس لیے ایسے بچے، موٹا منچلے، بدسلیقہ اور غیر مطمئن ہوتے ہیں۔ یہ سکول جانے سے کتراتے ہیں۔ اور سارا دن ہم جولیوں سے کھیلنا پسند کرتے ہیں کیونکہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے ان کی خواہشات کی تکمیل ہوتی رہتی ہے اس لیے یہ بچے خودغرض، مطلب پرست اور مفاد شناس بھی ہوتے ہیں۔

(ج) بن مانگے بچے، لاوارث بچے، ناجائز بچے اور اسی قبیل کے دیگر بچے مل کر اس گروہ کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ وہ بچے ہیں جن سے کوئی محبت اور شفقت سے پیش نہیں آتا جن کی کشت آرزو پیار کی بوندوں کو ترس ترس کر نفرت کی سموم میں جل جاتی ہے اور یہ اس کا ردِ عمل ہوتا ہے کہ یہ ماحول سے، اپنے آپ سے غرضیکہ ساری دنیا سے گریز میں بہتری سمجھتے ہیں یہ نہ تو کسی انسان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان میں کسی مشکل سے پنجہ آزمائی کی ہمت ہوتی ہے۔ نہ ان پر کسی نے اعتماد کیا اور نہ یہ کسی کو اپنے اعتبار کے قابل سمجھتے ہیں اور یہ افراد کو غیر مرئی زنجیروں میں جکڑنے والی چیز — یعنی محبت — سے ناآشنا رہتے ہیں، اس لیے ایسے بچوں میں اگر کم حوصلگی اور اس کی پیدا کردہ شرم ہوتی ہے تو دوسری طرف سنگ دلی، عیاری اور مکاری بھی ان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہیں۔ معاشرہ اور ماحول نے ان کا "سرد استقبال" کیا تھا اور جواب میں یہ اس کے لیے اپنے دل میں کسی قسم کے گرم جذبات نہیں رکھتے۔ مجرموں کی کثیر تعداد ایسے ہی بچوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

بچہ کی نشو و نما، تربیت اور تعلیم — ان سب کے لحاظ سے ماں کی بے حد اہمیت ہے، بقول ایڈلر "یہی تو فرد کو معاشرہ کے معانی سے روشناس کراتی ہے اور اگر ماں اپنے اس فریضہ کی تکمیل میں کوتاہی برتے تو کافی عرصہ کے بعد یہی فریضہ معالج کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ جو اب اس کی انجام دہی میں کافی رکاوٹیں محسوس کرتا ہے"

ماں کی محبت بچہ کے دل میں محبت کی جوت جگا کر اسے اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنے اور ماحول کے باہمی تعلقات کا تعین کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ ایک بچہ کے لیے محبت غذا اتنی ہی ضروری ہے، انفرادی نفسیات کے تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ بچے جو چوری کرتے ہیں ان میں سے اکثریت محبت کے بھوکے بچوں کی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ناکافی محبت کی وجہ سے بعض بچے سست، نکمے اور کند ذہن بن جاتے ہیں۔

---

[1] اس کی مثال امریکی چارلس سٹارک ویدر CHRLES — STARK WEATHER کی زندگی سے ملتی ہے ۱۹ سال کی عمر میں اس کے ساتھی اس کے بے ہنگم قد، سبز چندھی آنکھوں، عینک کے موٹے شیشوں اور زبان کی خرابی کا مذاق اڑایا کرتا تھا — اور پھر یہ کند ذہن بھی تھا۔ اس سے اس کے دل میں تمام دنیا کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات نے جنم لیا، جب یہ مکہ بازی سے اپنے ساتھیوں پر رعب نہ ڈال سکا تو اس نے چاقو کا سہارا لیا اور یوں سب اس سے خائف رہنے لگے جب اس کی محبوبہ سے شادی کی راہ میں دونوں گھرانوں نے روڑے اٹکائے تو یہ اس کے تمام کنبہ کو قتل کر کے اسے ساتھ لے کر فرار ہو گیا اور گرفتار ہونے تک اس نے گیارہ افراد کو قتل کیا۔ مقتولین میں سے ۵۱ - ۴۶ - ۱۴ - ۳۵ - ۷۰ سال کی ۵ عورتیں ایک سولہ سالہ لڑکی، سترہ سال کا ایک لڑکا ایک ننھا بچہ اور ۷۰ - ۴۷ - ۳۴ سال کے تین مرد تھے، گرفتاری کے بعد اس نے ایک بارھویں قتل کا بھی اقبال کیا۔

ماحول سے عدم مطابقت رکھنے والے بچوں کو سمجھنے اور ان کا علاج کرنے کے لیے ایڈلر نے کچھ سوالنامے مرتب کیے ہیں جو اس کی ۲ کتابوں - - - - -
SOCIAL INTEREST اور THE EDUCATION OF CHILDREN
میں شامل کیے گئے ہیں۔

۳۔ اعصابیت

گذشتہ صفحات احساس کمتری کی جو تشریح کی گئی ہے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ احساس بالکل غیر صحت مند اور مریضانہ نہیں بلکہ یہ احساس فرد کی خوابیدہ صلاحیتوں کے لیے مہمیز کا کام کر کے اسے مصاف زندگی میں صورت فولاد عطا کرنے کا موجب بنتا ہے اس لیے یہ ہر انسان کے لیے لازمی ہے اس سے کسی کو مفر نہیں ہے آپ ہمزاد سمجھ لیں جو سب کے ساتھ ہے اور جس نے مرتے دم تک ساتھ نہیں چھوڑنا۔ بعض اوقات یہ احساس ایک پہاڑی ندی ثابت ہوتا ہے جس کی بپھری موجیں کناروں سے باہر بھی بہہ نکلتی ہیں۔ یہ صورت غیر صحت مندانہ ہے۔ اور اسے اصطلاح میں کمتری الجھاؤ کہتے ہیں۔

کمتری الجھاؤ ایڈلر نے ابتدا میں اس اصطلاح کو اس وجہ سے ناپسند کیا تھا اور اس سے فرائیڈ کے انداز فکر کی بو آتی ہے اور غالباً یہ اس کی وضع کردہ بھی نہیں لیکن آج ایڈلر کی تعلیمات کا لب لباب اس ایک اصطلاح کو سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس سے انفرادی نفسیات میں کسی نئے نظریہ کا اضافہ نہیں ہوتا ایڈلر نے اس اصطلاح کا استعمال ۱۹۲۶ء میں اپنے پہلے امریکی دورہ میں ایک لیکچر کے دوران کیا تھا۔ اس کے بعد سے جب اس نے اسے اپنی تحریروں میں استعمال کرنا شروع کیا تو یہ عموماً احساس کمتری کے مترادف تھی لیکن بعد میں اس نے احساس کمتری کو فرد کی عام حالت اور کمتری الجھاؤ کو مریضانہ حالت کی تشریح کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا کچھ عرصہ بعد اس نے اسے فرد کی اس حالت کی تشریح کے لیے بھی استعمال کیا۔ جس میں وہ دوسروں اور خود کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ کسی مسئلہ کا ایسا حل تلاش کرنے پر قادر نہیں جو سماجی لحاظ سے مفید ثابت ہو سکے

اس کی تشریح کرتے ہوئے ایڈلر نے لکھا ہے کہ گو ہم اسے الجھاؤ لکھتے ہیں لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ الجھاؤ سے اس کے اصل مفہوم کو نہیں سمجھا جا سکتا، کیونکہ یہ تو ایک ایسی بیماری ہے جس کے نتائج تباہ کن ثابت ہو سکتے ہیں۔

ہر شعوراتی کے اعصابی خلل کی تہ میں یہی الجھاؤ کام کرتا ہے جب اسے عام زندگی میں ایسے مواقع کا فقدان نظر آتا ہے جن کے ذریعہ وہ اپنے احساس کمتری کو دور کر سکے تو یہ احساس اندر ہی اندر لاوا بنا کھولتا رہتا ہے، وہ جب اس احساس تلے خود کو دبا ہوا محسوس کرتا ہے تو وہ اپنے مقصد حیات کو بلند کرتا ہے -- اتنا بلند کہ جو اگر انسانی پہنچ سے باہر نہ ہو تو کم از کم اس کی پہنچ سے تو ضرور ہی باہر ہوتا ہے۔ ادھر وہ ماحول میں ناسازگار حالات سے دوچار ہوتا ہے تو اسے ذہنی لحاظ سے ایک دھچکا سا محسوس ہوتا ہے -- اور یہی اس میں نیوراتیت کو جنم دینے کا باعث بنتا ہے۔

کمتری الجھاؤ کی ایک نمایاں پہچان یہ ہے کہ اس کے شکار افراد معاشرہ اور ماحول کی جانب بڑا سرد اور خشک رویہ رکھتے ہیں یہ اپنے خیالات کے تانے بانے میں گم رہتے ہیں ان کے خواب بیداری ان کے لیے اچھی خاصی غذا کا کام کرتے ہیں یہ ان میں خود کو دنیا بھر کا مالک سمجھتے ہیں، ان کے ایک ہاتھ پر چاند ہے اور دوسرے میں سورج -!

بعض اوقات ایسے لوگ اس انتہا تک پہنچ جاتے ہیں کہ شدید حساسیت ان کے اور دوسروں کے لیے وبال جان بن جاتی ہے، اگر دو آدمی آپس میں باتیں کر کے ہنستے ہوں گے تو یہ سمجھیں گے کہ ان پر ہنسا جا رہا ہے، انہیں تمام دنیا اپنی دشمن اور زمانہ اپنے خلاف سازشیں کرتا معلوم ہوتا ہے ---- یہ سب سے ناخوش اور سب النے سے بے زار!

برتری الجھاؤ آج کل "پڑھے لکھے" لوگوں کو عام گفتگو میں نفسیات کی بعض اصطلاحیں استعمال کرنے کا بڑا شوق ہے ان اصطلاحات میں سے ایک یہ بھی ہے لیکن اسے عموماً غلط معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ عام طور پر اس کی ایک علیحدہ انفرادی حیثیت سمجھی جاتی ہے جو کہ بالکل غلط ہے۔ یہ کمتری الجھاؤ سے علیحدہ کوئی اور قسم کا الجھاؤ نہیں ہے بلکہ کمتری الجھاؤ کے شدید رد عمل کی صورت میں شخصیت مختلف قسم کے جو طرز عمل اختیار کرتی ہے ان میں سے ایک کا نام برتری الجھاؤ بھی ہے۔

اس صورت میں دوسروں پر اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے فرد عموماً اپنی ذات کا سہارا لیتا ہے وہ یا تو ہر وقت بن سنور کر رہتا ہے اور پھر وہ کپڑوں وغیرہ کے معاملہ میں لاپرواہی برتتا ہے۔ اگر پہلی قسم کے لوگ ہر وقت سج بنے رہتے ہیں تو دوسروں کی یہ حالت ہوتی ہے، شیو بڑھی ہوئی، گریبان کھلا اور کپڑوں میں 'بیاس' ہزار شکنیں۔ یہ خود کو اتنا بلند سمجھتے ہیں کہ جسمانی صفائی اور ملبوسات کے بارے میں عام روایات کی پابندی کو چنداں ضروری نہیں سمجھتے، انانیت ان کی ایک اہم خصوصیت ہوتی ہے جو مثبت اور منفی دونوں طریقوں سے اپنا اظہار کرتی ہے۔ اس الجھاؤ کی شدید صورت میں فرد خود کو دیوتا سمجھتے ہوئے خدائی کے درجہ پر محسوس کرتا ہے وہ دنیا اور علائق دنیوی سے خود کو بلند تر محسوس کرتا ہے، اسے عام لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح حقیر نظر آتے ہیں اور وہ خود کو اولمپس پر زیوس (ZEUS) کی مانند محسوس کرتا ہے۔

غصہ کی تیزی، منتقم مزاجی، متلون مزاجی، ضرورت سے زیادہ بھرپور قہقہہ دوسروں کی باتوں پر عدم توجہی، دوسروں کے معاملات میں دلچسپی نہ لینا، ذرا ذرا سی باتوں کو زیادہ اہمیت دینا اور گفتگو کے دوران موضوع سخن کو اپنی ذات کی طرف موڑ لینا -- یہ اور اسی طرح کے دیگر رجحانات ان میں آسانی سے ڈھونڈے جا سکتے ہیں

وہ لوگ جو شو مارنے والے کہلاتے ہیں وہ بھی اس الجھاؤ کے شکار ہوتے ہیں ملبوسات میں تراش کی نئی اختراعات اور فیشن کے متنوع انداز اس کے مرہون منت ہیں ان چیزوں کے دلدادہ وہ لوگ ہیں جو زندگی میں کوئی مفید اور ٹھوس کام نہیں کر سکتے -- لیکن کمتری الجھاؤ کی وجہ سے وہ خود کو مستقل طور سے حقیر اور کمتر سمجھتے رہتے ہیں -- اس لیے خود کو یہ باور کرانے کے لیے ہم بھی کسی سے کم نہیں، وہ ایسی ہلکی چیزوں کا سہارا لیتے ہیں بھڑکیلے لباس، بلند آہنگ باتیں، بھونڈا پن، فضول خرچی وغیرہ سے وہ اپنی انا کی تسکین کا بندوبست کرتے رہتے ہیں۔ خالی برتن زیادہ بجتا ہے -- تھوتھا چنا باجے گھنا -- کم ظرف رخت سیدھا ہوتا ہے ---- یہ سب ضرب الامثال ان پر صادق آتی ہیں

نیوراتیت "ایسا فرد جو نسبتاً "زیادہ سست ہو، جو اپنی ذات اور انانیت کی برتری کے لیے کوشاں ہو، اور جس کی معاشرہ میں دلچسپی ابھی نامکمل اور خام ہو -- جیسا کہ عموماً بگڑے ہوئے لوگوں کے انداز زیست میں دیکھتے ہیں -- ایسے افراد کے لیے اعصابیت بالکل فطری اور منطقی ہو کر رہ جاتی ہے"

ایڈلر نے یہ تعریف ۱۹۳۵ء میں کی تھی۔

ایڈلر کے نزدیک اعصابیت کی بنیاد تو احساسِ کمتری پر استوار ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض دیگر عناصر بھی کارفرما ملتے ہیں۔ اس نے ان تمام عناصر کی وضاحت مندرجہ ذیل فارمولے سے کی ہے۔

اعصابیت = فرد۔ تجربات۔ ماحول۔ زندگی کے تقاضے ایک اور موقع پر اس نے اسے "دفاعی نظام" سے تعبیر کیا ہے:

ایڈلر کے خیال میں اعصابیت فرار کا ایک ذریعہ ہے، ایسے لوگ کمتری الجھاؤ کے شکار ہوتے ہیں۔ یہ احساس پیرِ تسمہ پا بن کر ان کے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔ فرد کمتری کے احساس تلے دبا ہوا، سب لوگوں — باپ، ماں، بھائی بہن — غرضیکہ تمام دنیا سے اپنا موازنہ کرتے ہوئے ان سب کے مقابلہ میں خود کو کمتر تصور کرتا ہے (قطع نظر اس کے کہ ایسے سمجھنے کے لیے اس کے پاس کوئی ٹھوس وجوہات ہیں بھی یا نہیں)

جذباتی لحاظ سے یہ لوگ ہمیشہ "بچے" ہی رہتے ہیں انہیں دنیا ایک تیز رو ندی اور زندگی کے تقاضے ایک خوفناک طوفان محسوس ہوتے ہیں اور یوں وہ خود کو سیلابِ بلا میں گھرا ہوا محسوس کرتے ہوئے سہاروں کے لیے تنکوں کے متلاشی ہوتے ہیں، اس لیے ہر عُصابی کا اندازِ زیست لاڈ پیار سے بگاڑے ہوئے بچے ایسا ہوتا ہے۔ یہ خود کو سب سے ارفع اور برتر تصور کرتے ہیں۔ ان کا مقصدِ حیات عام لوگوں سے تو بلند ہوتا ہی ہے، خود ان کی صلاحیتوں اور حالات کے مقابلہ میں بھی بہت بلند ہوتا ہے اس مقصدِ حیات کی وجہ سے یہ خود کو بہت برتر سمجھتے ہیں (اسی حالت کے لیے برتری الجھاؤ کی اصطلاح وضع کی گئی تھی لیکن یہ برتری تاش محل ایسی ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے اپنے مقصدِ حیات کو پانے کے لیے تو کچھ کیا ہی نہیں ہوتا۔ بس یہ خود کو یسوع مسیح مریم، کرشن اور خدا تک سمجھ لیتے ہیں۔ ذاتی برتری کا یہ خام احساس ان کے شعور کے لیے گویا سیاہ عینک کا کام کرتے ہوئے حقیقت کی شمع کو گل کر دیتا ہے اور یہ لوگ عقلِ عامہ کی عام حقیقتوں کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔

بعض اوقات ان میں عدمِ تحفظ کا احساس بہت شدید ہوتا ہے یہ تمام عمر دوسروں کی محبت حاصل کرنے کے لیے ننھے بچوں کا طرزِ عمل اپنائے رکھتے ہیں وہ لوگ جو خود کو بڑا مظلوم، دکھی اور فلک کا ستایا بتاتے ہوئے ہمیشہ اپنے آلام و مصائب کا رونا روتے ملتے ہیں۔ ایسے لوگ دراصل دوسروں کی محبت، توجہ اور ہمدردی کے بھوکے ہیں خود کو مظلوم بنا کر پیش کرنے کی صورت میں جہاں یہ خود کو دوسروں کی نظروں میں کچھ ممتاز محسوس کرتے ہیں وہاں انہیں بھی کچھ یسوع مسیح ایسا احساس ہوتا ہے جس نے دنیا کے گناہوں کے کفارہ کے لیے مصلوب ہونا گوارا کر لیا۔

زندگی کے تقاضوں سے دو طرح سے عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے یا تو ان سے نپٹنے کے لیے جدوجہد کی جاتی ہے (جو عام صحت مند انسانوں کا طریقہ ہے) یا صاف انکار کر دیا جاتا ہے خودکشی اور دیوانہ پن اس کی اچھی مثال ہے، لیکن عُصابی کا انداز ان دونوں سے مختلف ہے وہ تمام عمر گومگو، تذبذب اور ڈھل مل سا رہتا ہے وہ ایک مشکل کو دیکھ کر کہتا ہے "؛ اس سے نپٹنا تو چاہیے مگر . . . ؛

بس یہ "مگر" ہی — اعصابیت ہے۔

وہ زندگی کے تقاضوں سے فرار کا یوں خواہاں ہے کہ اسے ناکامی کا خوف ہے وہ کیونکہ خود کو انسانیت کی معراج پر محسوس کرتا ہے اس لیے اس کی انا — ناکامی کا داغ برداشت نہیں کر سکتی اور اس فرار کو مؤثر بنانے کے لیے وہ اعصابیت کو اپنا سہارا بناتا ہے تاکہ دوسرے اسے دیکھ کر یہ کہہ سکیں — یہ آدمی تو کام کا تھا مگر کسی چیز نے نکما کر کے رکھ دیا۔ وہ بعض عضوی خرابیوں کو منتخب کر کے آتنا بڑھا دیتا ہے کہ وہ واقعی اس کے راستے کا پتھر ثابت ہوتی ہیں، اس میں اعصابی تناؤ کی جز لیعیت ہوتی ہے اس کی وجہ سے اس میں جسمانی اور ذہنی لحاظ سے انتشارات اور خرابیاں معرضِ وجود میں آجاتی ہیں یہ خرابیاں اس کے اندازِ زیست اور اعضاء کی کمزوری کے مطابق مختلف النوع، صورتیں اختیار کرتی ہیں۔"

اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دکھ یا تکلیف محسوس نہیں کرتا — وہ یہ سب کچھ نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ ان کی بنا پر وہ سچ مچ پریشان بھی رہتا ہے لیکن اس کے لیے شکست اور ناکامی کا خوف اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ اس جسمانی اور ذہنی اذیت کو اس پر ترجیح دیتا ہے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اس دکھ اور تکلیف میں بھی پہلوئے برتری نکال کر اس سے لطف اندوزی شروع کر دیتا ہے اور بقول غالب حالت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ جب بھی زخم سر اچھا ہوا تو اس نے کھجا کر اسے پھر زخم میں تبدیل کر دیا۔ اس مقصد کے لیے بعض اوقات کسی نہ کسی واقعہ کا سہارا لے کر پشیمانی کے روپ میں خود اذیتی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ یہ لوگ خود کو ہر وقت لعنت ملامت کرتے۔ اپنے آپ کو گالیاں دیتے اور کوستے رہتے ہیں — اور شدید صورتوں میں خودکشی کی بھی نوبت آجاتی ہے۔ مجرمانہ الجھاؤ کی مختلف صورتیں اسی کی پیدا کردہ ہیں۔

فرار کی صورت میں سے بے خوابی کی مثال بہت نمایاں ہے۔ ایڈلر کا خیال ہے کہ اگر بے خوابی کے مریض سے یہ پوچھا جائے کہ مکمل نیند پوری کر کے تازہ دم ہو جانے کے بعد وہ کیا کرے گا۔ تو اس سے عموماً بے خوابی کی وجہ کا پتہ چل سکتا ہے۔ مثلاً وہ یہ کہے گا، کہ میں امتحان کی تیاری اچھی طرح سے کر سکوں گا۔ یعنی امتحان میں ناکامی کے خوف نے اس میں بے خوابی کو پیدا کیا جس کے باعث نہ اس کے جسم کو سکون ملے گا اور نہ وہ امتحان کے لیے مطالعہ کر سکے گا — نتیجہ میں وہ فیل ہونے سے بچ جائے گا۔

عُصابی ایک لحاظ سے اس بچہ سے مشابہ ہوتا ہے جو کھلونوں سے کھیلنے کا اتنا عادی ہو جائے کہ اس کے لیے حقیقت کا تعلق ہی ختم ہو کر رہ جائے اسی لیے انہیں حقیقت بھی خوش رنگ اور خوشنما کھلونوں کے روپ میں پسند ہوتی ہے۔

ایڈلر نے انسانی شخصیت کے تمام رجحانات و میلانات کو مندرجہ ذیل شکل کی صورت میں پیش کیا ہے

۴۔ نظریۂ جنس

فرائڈ کے برعکس ایڈلر کے نزدیک جنس کو انسانی زندگی میں مرکزی اہمیت حاصل نہیں وہ اسے بے حد اہمیت دیتا ہے، مگر اتنی نہیں کہ عضویت کے تمام وظائف اور تمام شخصیت کو اس پر قربان کر دیا جائے۔

لہ ایڈلر نے نیند کے بارے میں مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:
"نیند بھی جاگنے ہی کی ایک قسم ہے بلکہ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ جاگنا نیند ہی کی تبدیل شدہ صورت ہے — حیاتیاتی لحاظ سے نیند میں عضویت اپنے ماحول سے جزوی طور سے ناطہ توڑتی ہے اور اس کی کارکردگی میں قدرے کمی واقع ہو جاتی ہے، نیند میں بھی سوچ، احساسات اور قوتِ سامعہ کے ذریعہ ہماری توجہ حقیقت سے کسی حد تک رابطہ استوار رکھتی ہے۔ ہم بستر پر اپنی حرکات پر قابو رکھتے ہوئے نیچے گرنے سے بچ جاتے ہیں۔ ہم بعض آوازوں کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ ان سے ہم بیدار رہنا پسند کرتے ہیں ورنہ پڑے سوتے رہتے ہیں بلکہ ہم ایک مقررہ وقت پر بیدار ہونے پر بھی قادر ہیں:

جنس اور معاشرہ

اڈلر کے خیال میں جنس دو لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے ایک تو اس کا عضوی پہلو ہے، جنسی اعضا دیگر اعضا کے مقابلہ میں نہ صرف زیادہ حساس اور ساخت کے اعتبار سے زیادہ پیچیدہ بھی ہوتے ہیں بلکہ ذہنی حالت اور کیفیات سے یہ بلاواسطہ اثرات قبول کر کے بعض افراد کو بھول بھلیاں میں ڈال دیتے ہیں، اس کی اہمیت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جنسی فعل بھی ایک ایسا فعل ہے جس کے لیے دو کی ضرورت ہے، جب تک جنسی فریقین میں ذہنی ہم آہنگی نہیں پیدا ہوتی اس وقت تک جسمانی مطابقت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جنسی فعل کو خوش آئند انجام تک پہنچانے کے لیے جس جسمانی تعاون کی ضرورت ہے وہ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک دونوں کا ذہن ایک دوسرے کو قبول نہ کرتا ہو — اور اس سے یہ مسئلہ ذاتی نہیں رہتا بلکہ سماجی نوعیت اختیار کر جاتا ہے۔

اڈلر جنس اور اس کے تقاضوں کی تکمیل میں معاشرتی احتساب کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں سماجی قیود و ضوابط کا مقصد فرد کی راہنمائی کرتے ہوئے اسے غلط راہ پر بھٹکنے سے بچانا ہے۔ ان کے ذریعہ جنسی خواہشات کے وحشی گھوڑے کے منہ میں لگام دے کر اور اسے رام کرنے کے بعد اس سے سماجی مقاصد کی ترویج کا کام لیا جاتا ہے ان بے لگام خواہشات میں نظم و ضبط اور تہذیب و ترفع انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے فروغ کا باعث ہے — تہذیب کا سب سے اعلیٰ ترین کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بے پناہ خواہشات اور حیوانی جذبات کے کیچڑ سے کنول ایسی محبت کی صورت میں انسانیت کو ایک سدا بہار تحفہ دیا۔ معاشرہ کے بغیر جنس جھاڑ جھنکار سے بھرے ہوئے ایک جنگل ایسی ہے لیکن جب — اس میں کانٹ چھانٹ کر کے اسے ایک خوشنما کیاری کی صورت دی جائے تو یہ رشک خلد ہو سکتی ہے۔

جنسی کردار

بچہ چار سال کی عمر سے جنس اور اس کے مظاہر کے بارے میں تجسس کا اظہار شروع کر دیتا ہے، بال، لباس، چال ڈھال وغیرہ کے مشاہدہ سے اسے ایک حد تک دو علیحدہ اصناف کا اندازہ ہو جاتا ہے اس دور میں وہ جنسی اعضاء کے اختلافات پر بھی سوچ بچار کرتا ہے۔

جہاں تک جنسی کردار کے تعین کا تعلق ہے تو اس میں بچہ کے ماحول کا بڑا اہم کردار ہے جہاں والدین کی آپس میں نہیں بنتی اور وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے روٹھے رہتے ہیں تو ایسے گھروں کے بچے عموماً محبت اور کاروبار دل سے متنفر ہو جاتے ہیں، جو عورتیں خاوندوں سے مطلب براری کے لیے ناز و انداز کے حربے استعمال کرتی ہیں ان کی بیٹیاں بھی ایسی عادات اپنا لیتی ہیں، اپنی ماؤں کے بہت زیادہ تابعدار اور فرمانبردار لڑکے اپنی بیویوں کو بھی ماؤں کے روپ میں دیکھنا پسند کرتے ہیں تاکہ وہ ان پر رعب چلاتی رہیں اور وہ انہیں خوش کرنے کی فکر میں لگے رہیں بہت خوبرو لڑکوں کو سب پیار کرتے ہیں اس لیے ان میں ایک حد تک شان محبوبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ لڑکی جو اپنی ماں سے متنفر ہو اور اس سے ہمیشہ لڑتی جھگڑتی ہو تو اس کا قوی امکان ہے کہ وہ بطور احتجاج بھی، غیر مردوں کے ساتھ جنسی تعلقات استوار کرے گی — محض اس لیے کہ اس کے اس طرز عمل سے اس کی ماں کو تکلیف پہنچے گی۔

اس سے پہلے احتجاج مردانگی کے بارے میں بتایا جا چکا ہے کہ کس طرح بچہ اس کے زیر اثر مختلف قسم کا طرز عمل اپناتا ہے۔ عورتوں میں اس کے اثرات زیادہ شدید نوعیت کے ہوتے ہیں۔ مردوں سے نفرت، شادی سے فرار اور عام زندگی میں مردوں سے سبقت لے جانے کی تمنا یہ سب اسی کی وجہ سے ہے۔

شادی

شادی میں جنسی تعلقات کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے لیکن پھر بھی جنسی تعلقات کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا بعض لوگوں کی شخصیت کچھ اس انداز سے تشکیل پاتی ہے کہ وہ شادی کے بعد جنسی مطابقت کے نااہل ثابت ہوتے ہیں اس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کے ذہن میں جنس کے بارے میں ایک خوف، نفرت یا کراہت کا احساس جنم لے چکا ہوتا ہے، اس میں بھی ایک حد تک احتجاج مردانگی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ عورت جنسی فعل کے دوران خود کو محکوم اور ذلیل محسوس کرتی ہے اور یوں وہ اس سے بھاگتی ہے جبکہ مرد خود کو ضرورت سے زیادہ مرد ثابت کرنے کے لیے بعض حدود کو عبور کر جاتا ہے۔

شادی میں جنسی کردار کی نامکمل ادائیگی کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ معاشرہ میں دونوں اصناف کو مساوی حقوق نہیں حاصل جبکہ محبت اور جنس کی بنیاد ہی مساوات پر قائم ہے۔ خاوند گھر سے باہر اور بیوی گھر میں — یہ محض سہولت کے لیے تقسیم کار کی ایک صورت تھی۔ لیکن اس سے مرد خود کو ایک برتر مخلوق سمجھتا ہے اور عورت کو خود سے کمتر ہی نہیں سمجھتا بلکہ اسے وقت بے وقت اس کا احساس بھی کراتا رہتا ہے اس سے طبیعتوں کے اختلافات نمایاں ہو کر شادی کو ناکام بنا دیتے ہیں حالانکہ دونوں کے فرائض ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور یہ ایک کے بغیر دوسرے کی تکمیل ہی نہیں ہوتی۔ اڈلر کے خیال میں جب تک ایک فریق اپنی ذات سے زیادہ دوسرے میں دلچسپی کا اظہار نہیں کرتا اس وقت تک شادی کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔

بقول اڈلر:

"تکمیلِ محبت کے بعد صنفِ مخالف کے ایک فریق کے لیے انتہائی قسم کی خود سپردگی کا نام شادی ہے جس کا اظہار جسمانی کشش، یکانگت اور اولاد کی صورت میں ہوتا ہے اس کی آسانی سے وضاحت کی جا سکتی ہے کہ محبت اور شادی عمومی تعاون کی صرف ایک صورت ہے۔ یہ تعاون صرف دو افراد کی بہبود کے لیے نہیں بلکہ اس تعاون میں تو انسانیت کی بقا کا راز مضمر ہے"

بعض اوقات شادی کے بعد دوسرے فریق کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا محکوم اور تابعدار رکھنے کے لیے محبت کو بطور ایک حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر یہ غلط ہے! کسی کے نکاح میں آنے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اپنی انفرادیت کو ختم کر دے۔ عورتوں میں کیونکہ عدم تحفظ کا احساس زیادہ ہوتا ہے اس لیے وہ شوہر یا محبوب کو محبت کی زنجیروں میں جکڑ کر اسے اپنا پابند کر کے رکھنے کے لیے ہر ممکن سعی کرتی ہیں۔

جنسی کجرویاں

اڈلر نے اعصابیت کے سلسلہ میں جلق، ہم جنسیت ایذا پسندی، اذیت پرستی وغیرہ پر کافی تفصیلی بحث کی ہے۔

اس کے خیال میں کجروی مندرجہ ذیل عناصر کی مرہونِ منت ہے۔

ا۔ کجروی کی ہر صورت صنفِ مخالف سے نفسیاتی دوری کا اظہار ہے۔

ب۔ کجروی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرد عام جنسی کردار کے خلاف کسی نہ کسی حد تک بغاوت کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تذلیلِ نفس کے احساس میں شدت پیدا کرنا بھی ہوتا ہے۔ ویسے یہ عموماً لاشعوری ہوتا ہے۔

ج۔ مردوں میں کجروی اس احساسِ کمتری کی تسکین کا ایک ذریعہ ہے جس کی وجہ سے وہ عورتوں کے مقابلہ میں خود کو بہت حقیر سمجھتے تھے، یہی کیفیت کجرو عورتوں کی ہے۔ وہ عام جنسی ڈگر سے ہٹ کر گویا مرد کی مردانگی کو انگوٹھا دکھا دیتی ہیں

د۔ ایک کجرو خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے مگر وہ صنفِ مخالف کے بارے میں اپنے دل سے حقارت آمیز خیالات کو نہیں نکال سکتا جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ آخر کار وہ ان کے خلاف معاندانہ جذبات کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

وہ بے حد حساس، سرکش اور بلند نصب العین رکھنے والے افراد کے کجرو بننے کے نسبتاً زیادہ امکانات ہیں۔ ایسے لوگ خود پسند ہونے کے ساتھ ساتھ شکی بھی ہوتے ہیں، ان میں دوسروں پر چھا جانے کا جذبہ بھی زیادہ شدید ہوتا ہے اس لیے عموماً یہ عام معاشرہ سے کٹ کر اپنی کجروی کے سہارے صحت مند جنسی تقاضوں سے فرار اختیار کرتے ہیں۔

بعض افراد کے جنسی اعضاء میں کوئی نقص ہوتا ہے یا انہیں صرف یہ وہم ہی ہو جاتا ہے کہ ان کے اعضاء نامکمل اور ناقص ہیں جس سے انہیں یہ خوف لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں وہ جنسی فریق کی نظروں میں گر نہ جائیں کہیں وہ جنسی فعل میں ناکام ہو رہیں اس خوف کے ہاتھوں فرد ہمیشہ ان مواقع سے احتراز کرتا ہے جہاں نتیجہ میں اسے جنسی فعل سرانجام دینا ہو اور حفظِ ماتقدم کے لیے یہ کیا جاتا ہے کہ ایک ایسی آئیڈیل ہستی کا تصور وضع کیا جاتا ہے جو اپنی شکل و صورت اور عادات و خصائل کے اعتبار سے کم از کم اس آب و گل کی دنیا میں تو ملنے سے رہی۔ ہاں "وینس" یا سائیکی واپس آجائیں تو بات بنے۔ اس بلند معیار کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ عام عورتیں کیونکہ اس کے معیار پر پوری نہیں اترتیں اس لیے وہ ان سب سے "بیخ" جاتا ہے یوں کجروی اس کے آڑے آتی ہے ایک تو اس سے جنسی جبلت کی تسکین ہوتی رہتی ہے اور پھر یہ فرد اور صنفِ مخالف کے درمیان ایک ایسی خلیج ثابت ہوتی ہے جو دن بدن پھیلتی ہی جائے۔

جلق

جنسی کجروی کی یہ اتنی عام اور مقبول صورت ہے کہ اب اکثر ماہرین جنس (مثلاً ہیولاک ایلس) اسے کجروی نہیں مانتے۔ ایڈلر کے خیال میں دل شکستہ بچے اس کا سہارا لیتے ہیں، محبت، توجہ اور التفات سے محروم رہنے والے بچے اپنی ذات میں گم اور اپنے حال میں مست رہنے کی عادت اختیار کر لیتے ہیں اور جلق کی صورت میں وہ گویا عضوی زبان سے اپنی کمزوری کا اعتراف کرتے ہیں، پھر ایک دور آتا ہے کہ اس کمزوری ہی کو وہ اپنی سب سے بڑی طاقت سمجھتے ہوئے خود کو ایک ایسی قیمتی شے تصور کرنے لگتے ہیں جو جنسی فریق کے ہاتھوں خراب ہو جائے گی اور یوں جنسی فعل ان کے لیے باعثِ ذلت بن جاتا ہے۔

بعض اوقات ایسا ہی کوئی بچہ جلق کرتا ہوا پکڑا جاتا ہے اس کی ماں (یا گھر کے دیگر افراد) اسے سزا دیتے ہیں۔ پہلے وضاحت کی جا چکی ہے کہ بچہ مرکزِ توجہ بننا پسند کرتا ہے۔ اسے جب یہ احساس ہوتا ہے کہ اب تو اس فعل سے تمام گھر والے اس کی طرف متوجہ ہیں تو وہ ان کی توجہ منعطف کرانے کے لیے بار بار اس کا اعادہ کرتا ہے اس لیے ایسی صورت میں ڈانٹ ڈپٹ سے کام نہ لینا چاہیے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت کے چند درشت کلمات بچہ کی تمام جنسی زندگی کا انداز ہی بدل کر رکھ دیں۔

ہم جنسیت

ایڈلر نے اس نظریے (جسے وہ علمی اوہام پرستی" کہتا ہے) کو مسترد کر دیا کہ یہ پیدائشی اور طبعی ہے۔ اس کے بقول اس کی بنیاد احساسِ کمتری پر استوار ہے جن لوگوں میں صنفِ مخالف کا خوف زیادہ ہوتا ہے وہ تسکین خود کے لیے یہ غلط راہ اپنا لیتے ہیں۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ صرف وہی لوگ ہم جنس پرست بن سکتے ہیں جن میں جسمانی لحاظ سے صنفِ مخالف کے خصائص ملتے ہوں لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کیونکہ اکثر اوقات ایسے ہم جنس پرست بھی دیکھے گئے ہیں جو ہر لحاظ سے نارمل جنسی کردار کی ادائیگی کے اہل تھے ہم جنسیت تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب فرد کے دل میں اپنی جنسی صلاحیتوں کے بارے میں وہم اور شکوک جاگزیں ہوں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ صنفِ مخالف کے بعض جسمانی خصائص رکھنے کی صورت میں اس کے ان شکوک کو مزید تقویت ملے۔

مردوں میں معاشرہ سے عدم دلچسپی بھی اسے جنم دیتی ہے ہم جنس پرستی کی صورت میں وہ گھر بار چلائے بغیر ہی جنسی تسکین حاصل کر لیتا ہے۔ فاعل ہم جنس پرست عورتوں میں احتجاجِ مردانگی کو اس کی انتہائی شدید حالت میں دیکھا جا سکتا ہے، مردوں میں اس احتجاج کا مظاہرہ اس وقت ملتا ہے جب کسی لڑکے کو اس کی ماں اور بہنوں نے دبا کر رکھا ہو اس سے یا تو اس کے لیے صنفِ نازک اتنی نفرت انگیز ہو جاتی ہے کہ وہ ان سے جنسی تعلقات کی استواری کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، اور یا پھر نسائی ماحول اس میں بھی وہ رجحانات پیدا کر دیتا ہے جن سے وہ دوسرے مردوں کو رجھاتے ہوئے مفعول ہم جنس پرست کا روپ دھار لیتا ہے۔

ایذا پسندی اور اذیت پرستی

ایذا پسند بھی دیگر کجرو افراد کی مانند شکستہ دل کے شکار ہیں اس کی بدولت برتری ان کی بھی منزل قرار پاتی ہے۔ یہ جنسی فریق کو اتنا حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں کہ جب تک وہ اسے جسمانی اذیت میں مبتلا نہ کر سکیں یہ جنسی لحاظ سے مشتعل ہی نہیں ہو سکتے۔ ایذا پسند افراد میں اپنے جنسی اعضاء کے بارے میں جو احساسِ کمتری ہوتا ہے اسے دور کرنے کے لیے وہ جارحیت کا سہارا لیتے ہوئے جنسی فریق کو جسمانی اذیت میں مبتلا کر کے اپنی برتری کے احساس کی تسکین کا سامان بہم پہنچا لیتے ہیں۔

کچھ اس سے ملتی جلتی کیفیت اذیت پرست کی ہے جو اپنی تحقیر اور تذلیل ہی کو اپنا سب سے کامیاب اور مؤثر حربہ بنا کر جنسی فریق پر اپنی برتری ثابت کرنے کی سعی کرتا ہے۔ واضح رہے کہ اذیت پرست دوسرے فریق کے ہاتھوں جسمانی اذیت میں تو مبتلا ہوتا ہے لیکن یہ سب اسی کے حکم سے تو ہوتا ہے اور یوں وہ دوسرے فریق کے ہاتھوں اذیت برداشت کرنے کے باوجود بھی اس پر حاوی ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ کیونکہ ان سے جنسی فعل تو کرتا ہی نہیں اس لیے جنسی شکست کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور یوں وہ ہر لحاظ سے برتر رہتا ہے۔

بنیادی طور سے یہ لوگ شادی اور اس سے وابستہ جنسی کردار کی ادائیگی سے خوفزدہ ہوتے ہیں، ان کے نزدیک جنسی محبت ایک بوجھ اور شادی موت کے مترادف ہے اس طرح اس راہ پر گامزن ہونے والی عورتیں بھی محبت کے تقاضوں اور شادی کی ذمہ داریوں سے آزادی حاصل کر لیتی ہیں کیونکہ ان کے لیے تو دونوں میں ذلت، رسوائی اور تکلیف ہی تکلیف ہے۔

ایڈلر نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے ایک ایسے مرد کی مثال دی ہے جسے اس نے جب ہم جنس پرستانہ رجحانات سے نجات دلا دی تو اس نے ایک طوائف کے ساتھ اذیت پرستانہ تعلقات قائم کر لیے اور یوں اگر ہم جنس پرستی میں اس نے تمام عورتوں کو اپنے دائرہ جنسیت سے خارج کر دیا تو اذیت پرستی کی صورت میں اس نے تمام کارآمد قابلِ حصول عورتوں سے تعلقات کی استواری کے امکانات کو ختم کر دیا۔

۵- خواب

"خواب کو ایک ایسا پل سمجھنا چاہیے جو خواب دیکھنے والے اور اس کے مقصدِ حیات کو ملانے کا کام کرتا ہے، اسی لیے عموماً بعض خواب سچ ثابت ہوتے

ہیں اور یوں خواب دیکھنے والا۔ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے — خواب میں تربیت حاصل کر لیتا ہے۔"

یہ ہے ایڈلر کی تعریف!

ایڈلر کے خیال میں خواب اندازِ زیست سے مطابقت رکھتے ہوئے فرد کو آنے والے خوشگوار و ناخوشگوار واقعات کی نہ صرف اطلاع ہی دیتے ہیں بلکہ اسے ان سے نپٹنے کے لیے تیار بھی کرتے ہیں۔ اس طرح وہ خوابوں کو مستقبل کا اشاریہ تسلیم کرتے ہوئے اس امر پر زور دیتا ہے کہ مناسب تشریح سے ان کے ذریعہ پیش آنے والے مسایل کا حل بھی دریافت کیا جا سکتا ہے۔ ایڈلر کے خیال میں "وہ نفسیات جو خوابوں کو نہ تو سمجھ سکے اور نہ ہی ان کی تشریح پر قادر ہو تو وہ اس بنا پر بالکل نامکمل رہے گی کہ اس طرح ذہنی زندگی کا معتد بہ حصہ اس کے حلقہ سے باہر ہو جاتا ہے۔"

خواب جن حادثات و واقعات کے لیے آتے ہیں وہ بلحاظ نوعیت بہت پیچیدہ ہوتے ہیں اس لیے ان کے مقابلہ میں خوابوں کے واقعات نسبتاً بہت آسان اور سیدھے سادے معلوم ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ خواب بچپن کے اندازِ فکر کو اپناتے ہیں اس لیے بعض اوقات ایک قوی مخالف بڑے بھائی کے روپ میں آتا ہے فتح کی صورت میں وہ آسمان کی طرف محو پرواز ہوتا ہے اور خطرہ کے وقت وہ خود کو پاتال میں گرتا محسوس کرتا ہے۔

ایڈلر کا نظریۂ خواب وحدتِ شخصیت کے اصول پر استوار ہے اس کے نزدیک نیند اور بے داری دونوں حالتوں میں ہی شخصیت اپنی وحدت کو بہرصورت برقرار رکھنا چاہتی ہے اس لیے جب وحدتِ شخصیت کو ٹھیس پہنچانے والی صورتِ حالات پیدا ہو (یا اس کے پیدا ہونے کا امکان ہو) تو خوابوں کے ذریعہ اس کا اظہار کیا جاتا ہے، اس لیے بعض اوقات خواب ناقابلِ فہم رہتے ہیں یا سرے سے وہ یاد ہی نہیں رہتے کیونکہ اس صورت میں خواب کے اثرات سے شخصیت کی وحدت کو ٹھیس پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے۔

بقول ایڈلر:

"جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں خواب ایک قسم کی "ڈریس ریہرسل" ہے اس کے ذریعہ فرد کو یہ بتایا جاتا ہے کہ صورتِ حالات کے استدلالی تقاضوں سے قطع نظر وہ کیسے عروس کامرانی سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔"

مجموعی لحاظ سے خواب عموماً مقصدِ حیات کے تابع ہوتے ہیں وہ لوگ جو عام زندگی میں ناکام رہتے ہیں وہ خوابوں کے ذریعہ تسکین کا پہلو نکال لیتے ہیں وہ خواب جن کا بار بار اعادہ ہوتا رہتا ہے وہ ذہنی تحریک کے تحت پیدا ہوتے ہیں جب فرد کسی مسئلہ سے دوچار ہو اور وہ اسے حل کرنے میں عاجزی محسوس کرتا ہو تو کیونکہ اس سے — اس کے مقصدِ حیات کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لیے خواب گویا اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خوابوں سے یہ مراد ہے کہ ایک سوال کا جواب فوراً ہی تلاش کر لیا گیا ہے۔ مردہ لوگوں کو خواب میں دیکھنے کا یہ مطلب ہے کہ فرد ابھی تک ان کے اثرات سے خود کو آزاد نہیں کر سکا۔ خواب میں گاڑی وغیرہ کا چھوٹ جانا، فراری رجحان کا غماز ہے، جنسی خواب عموماً جنسی کردار کے لیے خام تربیت یا خوف کے غماز ہوتے ہیں بعض اوقات ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرد نے اپنی ذات کو مرکزِ دلچسپی بنا لیا ہے۔

ایڈلر فرائڈ کی طرح خوابوں میں مستقل اشارات کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتا اور نہ ہی خوابوں کی تشریح کے لیے کبھی اشارات کا سہارا لینے کی کوشش کی فرائڈ کے برعکس ایڈلر نے ہمیشہ خوابوں میں استقبالی رجحانات کو تلاش کر کے اسی انداز سے ان کی تشریح کی۔

ایڈلر کا خیال ہے کہ خواب کا مقصد فرد پر ایک خاص کیفیت (موڈ) کا طاری کرنا ہے۔ اگر وہ کسی حادثہ سے دوچار ہونے والا ہے تو خواب ذہنی (اور ایک حد تک جسمانی) لحاظ سے اس میں وہ موڈ پیدا کر دے گا جس کے اثرات کے تحت حادثہ سے دوچار ہونے کی صورت میں بھی شخصیت کی وحدت برقرار رہ سکے اس لیے خواب کی تشریح کرتے وقت سب سے پہلے موڈ کا جائزہ لینا چاہیئے ہر فرد کے انفرادی مقصدِ حیات اور اندازِ زیست کی نسبت سے اس کا موڈ بھی مختلف ہوتا ہے اس لیے ایڈلر مستقل اشارات کے نظریہ کو مسترد کرتا ہے۔

ایڈلر نے اعصابیت کے علاج میں خوابوں کی تشریح سے بہت زیادہ کام لیا ہے۔ مثلاً مالیخولیا کے ایک مریض نے اسے اپنا یہ خواب سنایا۔

"میں اس بورڈنگ ہاؤس میں ہوں جہاں سے میں عموماً دوپہر کا کھانا کھایا کرتا ہوں۔ میز پر وہ لڑکی میری منتظر ہے جس میں میں کافی عرصہ سے دلچسپی لے رہا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا ہے کہ دنیا کا خاتمہ ہونے والا ہے اس لمحہ مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اگر اب میں اس لڑکی کی عصمت دری کر دوں تو مجھے کوئی بھی الزام نہ دے گا جب میں اس فعل سے فارغ ہوتا ہوں تو مجھے علم ہوتا ہے کہ دنیا کا خاتمہ نہیں ہوا۔"

اس خواب کے کئی رجحانات میں سے نمایاں ترین مریض کا ذمہ داری سے فرار اختیار کرنا ہے، معاشرہ کے خلاف اس کے معاندانہ جذبات کا اظہار "دنیا کے خاتمہ" کے احساس سے ہوتا ہے وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے افعال کے لیے اسے موردِ الزام نہ ٹھہرایا جائے — سب ختم ہو جائیں تاکہ وہ فاتح ثابت ہو۔

قولِ اقبال

جشنِ اقبال کی مناسبت سے ترتیب دیا ہوُا ایک منفرد مجموعہ۔
علامہ اقبال کے مقالات، تقاریر، بیانات اور مکاتیب کے منتخب اقتباسات۔
اقبال کے فکروفن اور شخصیت کے نئے زاویے —— نئے پیرائے ہیں۔

مرتبہ: عزیز احمد

اقبال
غیر مسلموں کی نظر میں

اقبال کے فلسفے اور شاعری کے بارے میں غیر مسلم مشاہیر کے افکاروخیالات : رابندر ناتھ ٹیگور۔ ڈاکٹر نکلسن، سر تیج بہادر سپرو، سر ٹامس آرنلڈ۔ مہاراجہ سر کرشن پرشاد۔ سر جوگندر سنگھ۔ میری شمل۔ سردار گور بچن سنگھ، ڈش بروک ولیمز۔ رام بابو سکسینہ۔ ہربرٹ رِیڈ۔ ملک راج آنند۔ ڈاکٹر بوسانی۔ تلوک چند محروم۔ سر مالکم ڈارلنگ، جگن ناتھ آزاد۔ نربھے رام جوہر۔ پروفیسر مت اتیاس۔ کلدیپ کوردیپ۔

مرتبہ: محمد حیات سیال
شمیم حیات سیال

(اقبال پر یہ دونوں کتابیں ایک جلد میں)

۱۵ ستمبر —— چار روپیے

حاضر سٹاک فہرست کتب

مکتبۂ شاہکار

ھر پہلی اور پندرہ تاریخ کو باقاعدگی سے کتب شائع کرنے والا واحد ادارہ

★ نوٹرے ڈیم کا کبڑا ۲/۵۰
★ مہمان بہار / آتش رفتہ ۳/-
★ بھوانی جنکشن ۲/۵۰
★ علی اور نینو ۲/۵۰
★ صحرا نورد کے خطوط (اوّل) ۳/-
★ شاہنامۂ اسلام (دوم) ۳/-
★ فردوس بریں ۲/۷۵
★ جین آئر ۴/-
★ مجبور آوازیں ۴/-
★ شاہنامۂ اسلام (سوم) ۳/-
★ قائد اعظم میری نظر میں ۴/-
★ مقدس نازنین ۴/-
★ صحرا نورد کے خطوط (دوم) ۳/۵۰
★ خزینۂ معلومات ۴/-
★ علی گڑھ کے تین نامور فرزند ۲/-
★ شاہنامۂ اسلام (چہارم) ۳/-
★ محبت عظیم ہے ۲/۵۰
★ نقوش قائد اعظم ۲/۵۰
★ رحمتِ عالم ۲/-
★ اسرائیل، قرآنی پیشین گوئیوں کی روشنی میں ۳/۵۰
★ اردو کے چار مزاحیہ شاعر ۲/-
★ پولیس افسر کی ڈائری (دوم) ۳/-
★ قاسم کی مہندی ۳/۵۰
★ پیغمبر صحرا ۴/-
★ نوجوان ورتھر کی داستانِ غم ۲/۵۰

★ بیادِ قائد اعظم ۲/۵۰
★ افلاطون کی ری پبلک ۳/۵۰
★ بھیلما ۴/-
★ ذہن کی آزمائش (دوم) ۲/-
★ دفاع پاکستان ۳/۵۰
★ الحسینؑ ۲/۵۰
★ اقبال کا فلسفۂ خودی ۳/۵۰
★ ذہن کی آزمائش (سوم) ۲/-
★ دینِ علی ۳/-
★ تذکرۂ غوثیہ ۲/-
★ ذہن کی آزمائش (چہارم) ۳/-
★ داستانِ ہٹلر ۲/۵۰
★ گم شدہ شہر اور ملیامیٹ تہذیبیں ۳/۵۰
★ یادِ اقبال ۴/-

ڈائجسٹ کُتب

✳ افرو ڈائٹ (ناول) ۳/۵۰
✳ شہرزاد (ڈرامے) ۲/۵۰
✳ امیر علی ٹھگ (جرم و سزا) ۳/-
✳ گڈ ارتھ (ناول) ۲/۵۰
✳ ڈاکٹر کے آنے تک (طب و صحت) ۲/۵۰

شاہکار
انسائیکلوپیڈیا
معلومات

و

شاہکار
اسلامی
انسائیکلوپیڈیا
کے اب مکمل
سیٹ
موجود ہیں

بچوں کا پسندیدہ بے بی انسائیکلوپیڈیا

قسط نمبر ۱ تا ۱۸
بھی دستیاب ہے

۱۵ اگست کو آنے والی شاہکار عوامی کتاب

چالیس کروڑ غلاموں کو آزاد کرانے والی عظیم ہستی
کی طوفانی زندگی کے زندہ سچے واقعات کا یادگار مجموعہ

زندہ قائدِ اعظم

لکھنے والے: لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، سردار عبدالرب نشتر، چوہدری محمد علی، فیروز خان نون، راجہ غضنفر علی، سر محمد یامین خان، نواب صدیق علی خان چوہدری نذیر احمد خان، ابراہیم اسماعیل چندریگر، مولانا حسرت موہانی، خواجہ حسن نظامی، ایم اے ایچ اصفہانی، بابائے اردو، سر عبدالقادر، دیوان چمن لال، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، شیخ عبدالقادر، کانجی دوارکا داس، ہیکٹر بولائتھو، حفیظ جالندھری، مختار مسعود، الطاف حسین، جی الانہ، کرنل الٰہی بخش، حاتم اے علوی، فقیر سید وحید الدین، جسٹس شمیم حسین قادری، نواب مشتاق احمد خان، ڈاکٹر ریاض علی شاہ، رئیس احمد جعفری، بیورلی نکلس، زیڈ اے سلیری، چوہدری غلام عباس، مطلوب الحسن سید، فرخ امین، عاشق حسین بٹالوی، عزیز احمد، سید ضمیر جعفری، عزیز بیگ، حکیم محمد سعید دہلوی، سردار علی صابری، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، عباس احمد عباسی، کیمبل جانسن، سیٹھ ولی بھائی، بیگم لیاقت علی خان، بیگم عبداللہ ہارون، ممتاز حسن، محمد حنیف آزاد، علی اختر، کیپٹن ممتاز ملک، اسد ملتانی، ملک افتخار علی، اے بی اکرم، محمد اظہار الحسن، محمد یونس، نور الصباح بیگم، منظور طارق، مسعود قریشی، موسلے، لارڈ پیتھک، فقیر محمد، شاہ عبدالرحمٰن، مصطفےٰ کمال پاشا، محمد شفیع، ایم اے حسین، فاطمہ بائی، محمد نعمان، سر فرانسس موڈی، ایڈمرل جیفرڈ، عمر سعید فہیم، سید قاسم محمود۔

مرتبہ: منظور حسین عباسی — قیمت: ۴/-

ابنِ انشا کا مشہور سفرنامہ

چلتے ہو تو چین کو چلیے

شاہکار کے نئے کتابی سائز میں
نیا سانچہ، نیا ڈیزائن، نیا ایڈیشن

۱۵ جولائی — ۳/-

شاہکار جریدی کتاب (۶۲)

شاہکار میر

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

اردو کے عظیم و منفرد شاعر میر تقی میر کے حالاتِ زندگی، انتخابِ کلام، تبصرہِ کلام۔ میر پر ایک نئی تصنیف۔

مصنف: پروفیسر اعجاز دانا
قیمت: چار روپے
تاریخ اشاعت: یکم اگست

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

قسط ۲۲

ردیف وار ترتیب میں دو سو سے زائد عنوانات پر، مختصر مگر جامع مضامین
صفحات ۹۶۹ تا ۱۰۰۰
قیمت: تین روپے
تاریخ اشاعت: یکم اگست

عبدالرحمٰن عبد کی تصنیف
جس کا پہلا ایڈیشن تین دن کے اندر اندر ختم ہو گیا

داستانِ ہٹلر

اُس شخص کا قصہ جس نے
فاتح عالم بننے کا خواب دیکھا

دوسرا ایڈیشن نئے کتابی سائز میں

۱۵ اگست — ۳/-

سرورق: ایشین آرٹ پریس، ۱۴ میکلوڈ روڈ، لاہور